سہ ماہی اسلام آباد

ادبیات

BLAS
MABhatti

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

شمارے کا مصور

موجودہ شمارے کے مصور محمد علی بھٹی کا تعلق حیدر آباد سے ہے۔ 1977 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فائن آرٹس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1989 میں Edinboro یونیورسٹی پنسلوانیا سے مصوری میں ایم ایف اے کیا۔ بعدازاں 1991 میں Ohio یونیورسٹی ایتھنز کے School of Comparative Arts سے فائن آرٹس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ محمد علی بھٹی طویل عرصے تک اندرون ملک اور بیرون ملک یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر مصوری کی تعلیم بھی دیتے رہے ہیں۔

یوں تو محمد علی بھٹی نے مصوری کے دیگر شعبوں میں بھی اپنا لوہا منوایا تاہم پورٹریٹ کے شعبے میں انہوں نے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔

محمد علی بھٹی کے بنائے گئے پورٹریٹس اور دوسرے فن پاروں میں پاکستانی بالخصوص سندھی ثقافت اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے فن پاروں کی نمائشیں پاکستان کے علاوہ بھارت، نیپال، برطانیہ، اٹلی، دبئی، سنگاپور، تھائی لینڈ، ملائیشیا اور امریکہ سمیت دنیا کی کئی بڑی آرٹ گیلریز میں منعقد ہوچکی ہیں۔

(ا۔ر۔س)

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 107، اکتوبر تا دسمبر 2015

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو (تمغۂ امتیاز)
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر اعلیٰ : نگہت سلیم
مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جاسکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)   40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)   160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: nighatsalem.dir.ce.pal@gmail.com
ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

اب کے ایسی چلی ہوائے کرم (عقیدت)

ریاض ندیم نیازی	ہوا نتا مقدر رمز ابالاشہِ والاؔ	11
علی رضا	نور کا ایسا سلسلہ اُٹھا	12

میرا اسلوبِ فنِ شعر بہت سادہ ہے (غزلیات)

انور شعور	بس اب تمام ہوا انتظار دل اے دل	13
پرتو روہیلہ	بے بصر فقیروں کو زرگروں نے گھیرا ہے	14
سلطان سکون	تم نے اچھا ہی کیا کی نہ عیادت میری	15
سجاد بابر	ہونے سے جس کے ہو نہ اُجالا کس طرح	16
صابر ظفر	تو سین کو چھو رہا تھا جب مَیں	17
نصرت صدیقی	دوستوں والا نہیں اُس کا رویہ مجھ سے	18
لیاقت علی عاصم	جانے والوں کا سفر پیشِ نظر ہے کہ نہیں	19
فاطمہ حسن	نسلوں کا تعلق ہے صدیوں کی محبت ہے	20
سید نواب حیدر نقوی	کر دے پایاب کوئی موجۂ آلام کو بھی	21
علی احمد قمر	شب کے سفر میں ساتھ ہی چلنا پڑا مجھے	22
انجم خلیق	بندشوں سے لاتعلق اور رکاوٹ کے بغیر	23
میر تنہا یوسفی	کسی بہانے، کسی داؤ سے یا حیلے سے	24
ماہ طلعت زاہدی	ایک زمانے بعد بھی زخم ہرا پایا	25
شکیل ختر	کھنچی تھیں کتنی کمانیں مرے بدن کے خلاف	26
شاہین عباس	دیے کا کام اب آنکھیں دکھانا رہ گیا ہے	27
امتیاز الحق امتیاز	ایک ذرّہ ہو میسر تو ستارہ کرنا	28
اعجاز گل	یہیں تھا بیٹھا ہوا درمیاں کہاں گیا مَیں	29

عرفان الحق صائم	مرنے کے واسطے نہیں جیتا ہوں صرف میں	30
فاضل جمیلی	کس کس سے رہ و رسم ہے آداب میں اُس کے	31
سعید دوشی	عقل! سمجھ لے ختم ہوا اب دور تری سرداری کا	32
رستم نامی	آتے ہو نظر کب نظر آنے کے دنوں میں	33
ایم شہاب عالم	تیرے ہونٹوں پہ جو ہنسی ہے ناں	34
تسنیم صنم	آئینہ ہاتھ میں تھا آنکھ میں حیرانی تھی	35
شاہد ماکلی	مرے غیاب میں جس نے ہنسی اڑائی مری	36
ریاض عادل	سبز خوابوں کے بہتے لہو سے، جسمیں نہر جاری ہوئی	37
سید کامی شاہ	بیٹھے بیٹھے یہ ترا دھیان کہاں جاتا ہے	38
سعید اکرم	شام و سحر کا رنگ نہ موسم خبر میں ہے	39
راؤ وحید اسد	ادائے یونہی رکھتا ہوں اکثر مار دیتا ہوں	40
شاہجہان سالف	میرے ہر خواب کی تعبیر لگے راہ مجھے	41
کاشف بٹ	بیٹھا ہوا ہے ایک شکاری کمین میں	42
سید عقیل شاہ	دیکھے نہ فقیری کو، کوئی شک ہے ہماری	43
شہلا شہناز	آنکھ میں عکسِ خوش امکان بھی لا سکتی ہُوں	44

دُور اتنا بھی نہیں تیرا سراپا مجھ سے (نظمیں)

احسان اکبر، ڈاکٹر	مرے ہم نفس!	45
سلمان باسط	امر سے کی کتھا	48
وحید احمد، ڈاکٹر	کوئی بستی کہ مجھ میں بستی ہے	49
انجم سلیمی	میں اپنا نوحہ لکھ چکا	52
آصف ہمایوں	سرحد	53
سید ضیاء الدین نعیم	شہید	55
زاہد مسعود	ڈسٹ بن	57
سعود عثمانی	زمیں پہ انصاف کرنے والے	59
رضی الدین رضی	جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں	62
شکیل پتافی، ڈاکٹر	61اور 16 کا فرق	64
ارشد معراج، ڈاکٹر	موئے پیا ملن کی آس	65
رخشندہ نوید	آج	67

علی بابا تاج	ایک غیر مطبوعہ تاریخ	69
عمران ازفر	دریا مرتا جاتا ہے	72
نینا عادل	چار دیواری میں چیختی ہوئی عورت	74
الیاس بابر اعوان	اے مرے خواب	75
شبیر نازش	نمو زندگی کی علامت ہے	77
رفاقت راضی	مرے بابا جانی	78

’’میں‘‘ کررہا تھا گزشتہ کے واقعات درست (افسانے)

محمود احمد قاضی	درخت آدمی	79
محمد الیاس	آخری دعا	83
خالد فتح محمد	مزار	86
شعیب خالق	کہانی بنام کہانی کار	97
رشید مصباح	خاک زادے	105
ایوب اختر	’’بارہا نوے‘‘ کا رحیم بخش	113
محمد ظہیر بدر	اشتہائے نظر	121
جانِ عالم	برگد مسرت اور روتی ہوئی نظم	127
سعدیہ	دشتِ تنہائی	131
سجاد بلوچ	آواز کا الاؤ	136
معظمہ تنویر	امر لوک	143

کتابوں میں چھپے چہروں کو تکتے ہیں (مضامین)

(۱)

اقبال آفاقی، ڈاکٹر	ہیگل کی جمالیات اور فلسفۂ آرٹ	147
اسد اریب، ڈاکٹر	اردو کے جلوس میں فارسی کی چہل پہل	167

(۲)

ڈاکٹر جمال نقوی	یکے از معماران سندھی ادب	177
پروفیسر حسین سحر	پنجابی اور سرائیکی ادب میں مرثیہ	182
ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر	پنجابی اور فارسی کے لسانی و ادبی اشتراکات	195
ڈاکٹر گل عباس اعوان	سرائیکی افسانے کا موضوعاتی مطالعہ	205

جھیل سیف الملوک نے پوچھا (سفرنامہ)

محمد عارف	چلو ناران چلتے ہیں!	211

یہ کس زبان کے الفاظ ہیں نہیں معلوم (بین الاقوامی ادب)

نجیب محفوظ (خصوصی مطالعہ)

نجیب محفوظ/منیر فیاض	آدھا دن	217

محلے کی کہانیاں

نجیب محفوظ/منیر فیاض	(۱)	220
نجیب محفوظ/منیر فیاض	(۲)	222
نجیب محفوظ/منیر فیاض	(۳)	223
نجیب محفوظ/منیر فیاض	(۴)	224

خواب کہانیاں

نجیب محفوظ/حمزہ حسن شیخ	(۱)	226
نجیب محفوظ/حمزہ حسن شیخ	(۲)	227
نجیب محفوظ/حمزہ حسن شیخ	(۳)	228
نجیب محفوظ/حمزہ حسن شیخ	(۴)	228
نجیب محفوظ/حمزہ حسن شیخ	(۵)	229

سویتلانا الیکزائی ویچ (خصوصی مطالعہ)

نجم الدین احمد	تعارف	231
سویتلانا الیکزائی ویچ/نجم الدین احمد	تنہا انسانی پکار	234
سویتلانا الیکزائی ویچ/نجم الدین احمد	زندہ اور مرے ہوؤں کے بارے میں گفتگو	250
سویتلانا الیکزائی ویچ/نجم الدین احمد	وہ جو لوٹ آئے	256
سویتلانا الیکزائی ویچ/نجم الدین احمد	وطن	266

اکتاویوپاز (خصوصی مطالعہ)

ضیاءالمصطفیٰ ترک	تعارف	274
اکتاویوپاز/ضیاءالمصطفیٰ ترک	کہاوتیں، ضرب الامثال	275
اکتاویوپاز/ضیاءالمصطفیٰ ترک	لوک داستان	275
اکتاویوپاز/ضیاءالمصطفیٰ ترک	بغیر کسی عنوان کے	276

اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک تیقن 277
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک دورانیہ 277
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک آخری صبح 279
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک روانی 279
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک یہ دو جسم ہیں 281
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک اسباب مرگ 282
اکتاویوپاز رضیاءالمصطفیٰ ترک مقامی پتھر 283

ناظم حکمت راں (خصوصی مطالعہ)

ناظم حکمت راں رخالد مبین بہار کا پہلا دن 285
ناظم حکمت راں رخالد مبین بہار کی بارشیں 285
ناظم حکمت راں رخالد مبین ان سے دور جاتے ہوئے جو مجھے محبوب ہیں 287
ناظم حکمت راں رخالد مبین میں تم سے محبت کرتا ہوں 289
ناظم حکمت راں رخالد مبین تمھاری روح 290
ناظم حکمت راں رخالد مبین تمھارے انتظار میں 291

متفرق

کم سی آنگ ۔اوک راطہر قیوم موجین کا سفر جاپانی ادب 293
مارکیز رخالد فرہاد دھاریوال نیلے کتے کی آنکھیں لاطینی امریکی ادب 299
میخائل شولوخوف رارشد چہال لازوال تبسم روسی ادب 305
انتون چیخوف رحمزہ حسن شیخ ہائے عوام۔۔۔! روسی ادب 308

مشترکہ تمدن کی دیکھی ہے جھلک اس میں (پاکستانی زبانوں کا ادب)

براہوئی

حمیرا صدف حسنی رحمیرا صدف حسنی نظم 313

بلوچی

منیر مومن رواحد بخش بزدار کوئی دیا صبح تک جلا کر دیکھتا ہے 314

پشتو

امیر عثمان رزینت سلطانہ چراغ تلے اندھیرا 315
ثمینہ قادر رثمینہ قادر کیا محسوس تم نے بھی؟ 319

پوٹھوہاری

شیراز اختر مغل/شیراز طاہر ارمان 321

پنجابی

حنیف باوا/عامر عبداللہ انجام 322

سرائیکی

خورشید ربانی/سید ضیاءالدین نعیم نعت 323
جمشید ناشاد/سوہنا خان شاکر صحرائی پودا 324

سندھی

مانک/شاہد حنائی اور وہ مر گیا۔۔۔۔ 325
امداد حسینی/ابرار ابڑو بدنصیب 331

گوجری

رانا فضل حسین/مہوش منیر، پروفیسر نظم 332

ہندکو

صوفی عبدالرشید/اختر رضا سلیمی حمد 334
احمد علی سائیں/سلطان فریدی کلامِ احمد علی سائیں 336

☆☆☆☆

تصحیح

شمارہ نمبر 105 میں پاکستانی زبانوں کے حصے میں چھپنے والی پشتو نظم "سورا" ڈاکٹر شاہدہ سردار کے نام سے چھپ گئی تھی یہ نظم محترمہ ثمینہ قادر کی تھی اور اس کا ترجمہ: ڈاکٹر شاہدہ سردار نے کیا تھا۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

اداریہ

یہ سوال کہ ادب کا معاشرے میں کیا کردار ہے، یا کیا کردار ہونا چاہیے بہت اہم ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں نے اس سوال پر بہت پہلے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کوئی معاشرہ اندرونی طور پر اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتا جب تک اس کے افراد کی تربیت بذریعہ ادب نہیں کی جاتی۔ چناں چہ انھوں نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جس میں ادب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترقی یافتہ معاشروں میں ایک اچھی ادبی کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے جب کہ ہمارے ہاں زیادہ تر کتابیں پانچ سو کی تعداد میں۔

اگر ہم نے اپنے معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہے تو ہمیں بھی اس سوال کو زیر غور لانا ہوگا اور اپنے آپ کو نہ صرف اپنی زبانوں کے ادب سے بل کہ بین الاقوامی ادب سے بھی جوڑے رکھنا ہوگا بصورت دیگر تنگ نظری اور بنیاد پرستی کی دیمک ہمیں اسی طرح کھوکھلا کرتی رہے گی۔

سہ ماہی ادبیات کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو بین الاقوامی ادب سے جوڑے رکھے۔ اس سلسلے میں ادبیات نے کئی خصوصی نمبر بھی شائع کیے جن میں چھ جلدوں پر مشتمل بین الاقوامی ادب نمبر، خواتین کا عالمی ادب نمبر، سارک نمبر اور بچوں کا عالمی ادب نمبر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادبیات کے ہر شمارے میں جہاں اردو کے علاوہ دیگر پاکستانی ادب سے تراجم پیش کیے جاتے ہیں وہیں بین الاقوامی زبانوں کے ادب سے تراجم بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

موجودہ شمارے میں ہم نے مصر سے تعلق رکھنے والے دنیا کے پہلے مسلم نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ کے علاوہ ، 1990 میں نوبل انعام حاصل کرنے والے میکسیکو کے ممتاز شاعر اکتاویو پاز ، ممتاز ترک شاعر ناظم حکمت راں اور 2015 میں نوبل انعام حاصل کرنے والی بیلا روس کی ادیبہ اور فکشن نگار سویتلانا الیگزائی وچ کے لیے خصوصی گوشے مختص کیے ہیں اور ان کی منتخب تحریروں کے تراجم کے سلسلے میں ہمیں اردو اور انگریزی کے ممتاز مترجمین کا خصوصی تعاون حاصل رہا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں ۔

اسی حصے میں متفرق کے عنوان کے تحت جاپانی ، لاطینی امریکی اور روسی ادب سے بھی کچھ تراجم پیش کیے جا رہے ہیں ۔

امید ہے حسب سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی ۔ ہمیں آپ کی رائے انتظار رہے گا ۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

ریاض ندیم نیازی

ہو اتنا مُقدر مِرا بالا شہِ والاؐ
دیکھوں میں ترے گھر کا اُجالا شہِ والاؐ
میں نے تجھے ہر سانس میں ڈھالا شہِ والاؐ
پہچان مری، تیرا حوالہ شہِ والاؐ
یکجا ہوئے جب کچھ مرے احباب جہاں بھی
بس مَیں نے ترا ذکر نکالا شہِ والاؐ
بس تیری ہی یادیں ہیں سراسر مرے دل میں
مَیں نے کوئی غم اور نہ پالا شہِ والاؐ
دل میں کوئی آزار سما ہی نہیں سکتا
ڈالا ہے ترے نام کا تالا شہِ والاؐ
انوارِ سماوی سے منوّر رہے تن مَن
ہو دور مرے چاند کا ہالہ شہِ والاؐ
اللہ کا تھا حکم نہ دیکھے تجھے دشمن
مکڑی نے بُنا غار پہ جالا شہِ والاؐ
ڈوبا ہے ندیمؔ آپؐ کی مدحت میں سراسر
نعتوں نے اسے خوب اُچھالا شہِ والاؐ
رقصاں ہے ندیمؔ اب تری یادوں کے بھنور میں
یہ تجھ کو نہیں چھوڑنے والا شہِ والاؐ
ہے بہرِ ندیمؔ اس سے بڑا اور شرف کیا
پہچان مری تیرا حوالہ شہِ والاؐ

☆☆☆☆

علی رضا

نور کا ایسا سلسلہ اُٹھا
سارا عالم ہی جگمگا اُٹھا
جب تصور حضورؐ کا آیا
دل میں جینے کا ولولہ اُٹھا
مجھ کو بے چینیوں نے گھیر لیا
اُن کی دہلیز سے میں کیا اُٹھا
غم رسیدہ تھا جو بھی دنیا میں
اُن کی آمد سے مسکرا اُٹھا
اب کے ایسی چلی ہوائے کرم
قریۂ روح لہلہا اُٹھا
اُن کے در پر گیا تھا میں خالی
نعمتوں سے ہرا بھرا اُٹھا
جب مدینے کو رختِ جاں باندھا
خود قدم لینے راستہ اُٹھا
اُن کے دستِ کرم نے تھام لیا
جب بھی طوفان درد کا اُٹھا

☆☆☆☆

انور شعور

بس اب تمام ہوا انتظار دل اے دل
صنم کو چھوڑ، خدا کو پکار دل اے دل

وصال میں بھی کہاں تھا کوئی قرار مجھے
فراق میں ہو بھلا کیا قرار، دل اے دل

گزارنی ہے تجھے زندگی بہر صورت
بُری گزار، کہ اچھی گزار، دل اے دل

یہ موتیوں کی لڑی خاک میں نہ مل جائے
رکھ آنسوؤں پہ ذرا اختیار دل اے دل

یہ کس زبان کے الفاظ ہیں، نہیں معلوم
خلوص اور وفا اور پیار دل اے دل

اگر شعورؔ کو کچھ ہو گیا، خدا نہ کرے
بچے گا کون ترا غم گسار دل اے دل

☆☆☆☆

بے بصر فقیروں کو زرگروں نے گھیرا ہے
اژدھامِ طفلاں کو شاطروں نے گھیرا ہے
ریگ زارِ دوراں پر ایک خستہ جاں راہی
جاں نکل نہیں پاتی کرگسوں نے گھیرا ہے
زیرِ غور ہے نکتہ کیا سلوک ہو اُس سے
بے زبان یوسف کو بھائیوں نے گھیرا ہے
دشمنوں کا کیا کہنا فاصلے ہیں ملکوں کے
قربتوں کے پھندوں میں دوستوں نے گھیرا ہے
کوئی کس نہیں ان میں جو محاصرہ توڑے
حاکموں کی بستی کو ناکسوں نے گھیرا ہے
جاہلوں نے انساں کو مار ڈالا دنیا میں
عاقبت کے میداں کو عالموں نے گھیرا ہے
کون جانے جسم و جاں کب تلک سلامت ہیں
بکریوں کے ریوڑ کو بھیڑیوں نے گھیرا ہے
خواب کس طرح دیکھیں اُڑ گئی ہوں جب نیندیں
نیند کس طرح آئے وسوسوں نے گھیرا ہے
اور کچھ برس لیں گے آپ یہ سمجھنے میں
علم کی اشاعت کو مدرسوں نے گھیرا ہے
ہر عمل پہ طاری ہے کج روی طبیعت کی
خطِ راست کو گویا دائروں نے گھیرا ہے
کس طرح رہے پرتو اب کوئی دیا روشن
ہر ہوا مخالف ہے آندھیوں نے گھیرا ہے

سلطان سکون

تم نے اچھا ہی کیا کی نہ عیادت میری
ورنہ کچھ اور بگڑ جاتی طبیعت میری
خیر اب کر تو لیا ترکِ تعلق پھر بھی
دینا آواز جو پڑ جائے ضرورت میری
حال وہ گردشِ دوراں نے کیا ہے میرا
تم بھی پہچان نہیں پاؤ گے صورت میری
مجھ کو اپنے دلِ خوش فہم نے برباد کیا
تم سے تو کوئی نہیں شکوہ شکایت میری
میں نہیں بھولتا رستے کے شناساؤں کو بھی
تم نے برسوں کی بھلا دی ہے رفاقت میری
بانٹتا رہتا ہوں لوگوں میں زرِ خلق و خلوص
بڑھتی رہتی ہے اس طور یہ دولت میری
مجھ کو نیلام بھی کرتے جو سرِ شہرِ وفا
اہلِ دل بولتے بڑھ چڑھ کے ہی قیمت میری
یہ شکستہ سا مکاں چند کتابیں ہی ہیں
چھوڑ جانے کو یہی کُل ہے وراثت میری
اس سے بڑھ کر بھلا اعزاز کوئی کیا ہو سکون
دوست تہِ دل سے ہی کرتے ہیں جو عزت میری

☆☆☆☆

سجاد بابر

ہونے سے جس کے ہو نہ اُجالا کسی طرح
بہتر ہے بھُولیے وہ حوالہ کسی طرح
اے قلبِ مطمئن! مجھے لالچ نہیں عزیز
اُترا نہ حلق سے یہ نوالہ کسی طرح
لغزش پہ کر دیا سرِ بازار سر بھی خم
ہوتا نہیں ہے یار! ازالہ کسی طرح
اک سَرو قد پہ جُھکتی نہیں تھی کوئی ردا
اوڑھا دیا ہے اُس کو دوشالا کسی طرح
رہ دیکھتی ہے راہ گزر پہ خمِ عتیق!
سو یارِ ہوش مند! اُٹھا لا کسی طرح
وادی تو چھوڑ آیا ہوں، کالر سے آج تک
اُڑتا نہیں ہے برف کا گالا کسی طرح
کتنی ہی رزم گاہیں میرے آس پاس ہیں
ترتیب دے رہا ہوں رسالہ کسی طرح
سجّاد! ایک غازیِ جرار کا ہے فیض
ہر حال میں علَم کو سنبھالا کسی طرح

☆☆☆☆

صابر ظفر

قوسین کو چھو رہا تھا جب مَیں
لگتا تھا کہ جی اُٹھا ہوں اب مَیں

جب دُھند وہ مجھ پہ چھانے آئی
منظر سے نکل چکا تھا تب مَیں

سینے سے لگا لیا عدم کو
جب دیکھ چکا وجود سب مَیں

مَیں دن سا نکلتا ساتھ اُس کے
جیتا اگر ایک اور شب مَیں

ایسا کوئی لمس تھا کہ جیسے
انگارے پہ رکھ رہا تھا لب مَیں

دیدار وہ دے کے جا چکا تھا
اُس سمت گیا تھا بے سبب مَیں

وصل اُس کا ظفؔر ہے بھول جیسا
کچھ یاد نہیں، مِلا تھا کب مَیں

☆☆☆☆

نصرت صدیقی

دوستوں والا نہیں اُس کا رویہ مجھ سے
اب اُسے چھوڑ دوں یہ بھی نہیں ہوتا مجھ سے
زندگی تجھ سے میں کتنی ہی محبت کر لوں
ٹوٹ جائے گا بالآخر ترا رشتہ مجھ سے
پھول کلیاں مرے اطراف میں مہکے ہوئے ہیں
دُور اتنا بھی نہیں تیرا سراپا مجھ سے
بے ضرر اتنا کیا اتنا کیا ہے خود کو
چڑیا جیسا بھی پرندہ نہیں ڈرتا مجھ سے
جھک کے ملتا ہے تو یہ بھی ہے بہت مرے لیے
مجھ سے قد کاٹھ میں اونچا مرا بیٹا مجھ سے
وقت کچھ اور بھی کٹ سکتا ہے خوش فہمی میں
حیلہ جُو کر لے اگر پھر کوئی وعدہ مجھ سے
نام دنیائے ادب میں ہے مرے شہر کا بھی
ایک سے ایک ہے شاعر یہاں اچھا مجھ سے
حاکمِ وقت سے اتنا کوئی کہہ دے جا کر
چھین لیتا ہے کوئی میرا نوالہ مجھ سے
حال میں نے بھی سُنایا نہ اُسے دانستہ
بھول کر اس نے بھی نصرتؔ نہیں پوچھا مجھ سے

☆☆☆☆

لیاقت علی عاصم

جانے والوں کا سفر پیشِ نظر ہے کہ نہیں
سب یہیں چھوڑ کے جانا ہے خبر ہے کہ نہیں

جس کو دیکھو وہ جدائی سے ڈراتا ہے مجھے
اِس محبت میں کوئی دوسرا ڈر ہے کہ نہیں

وہ بھلا شخص بُرا لگنے لگا جانے کیوں
اُس نے پوچھا تھا تمھارا کوئی گھر ہے کہ نہیں

ایسی دستار کا کیا فائدہ ہے تم ہی کہو
دیکھتے رہتے ہو ہر وقت کہ سر ہے کہ نہیں

ہاں مجھے حال سنانے میں نہیں عار کوئی
آپ کے بس میں مگر دیدۂ تر ہے کہ نہیں

شاعری کرتے مگر دیکھ تو لیتے پہلے
دردِ دل ہے کہ نہیں زخمِ جگر ہے کہ نہیں

☆☆☆☆

فاطمہ حسن

نسلوں کا تعلق ہے صدیوں کی محبت ہے
ترکی سے روابط کی دیرینہ روایت ہے

ہے میری زباں اردو ترکی ہے مرا ماخذ
دونوں ہی زبانوں کی توقیر ہے، حرمت ہے

مشترکہ تمدن کی دیکھی ہے جھلک اس میں
اجداد سے ورثے میں پائی جو ثقافت ہے

اوراق پلٹتی ہوں تاریخ کے جب اپنی
کچھ نام ہیں وہ لکھے جن سے کہ عقیدت ہے

انصارِ مدینہ کی ہجرت سے ہے وابستہ
اک گوشہ یہاں جس کو ایوب سے نسبت ہے

یثرب میں زمیں جس نے مسجد کے لیے دے دی
اس مردِ قلندر کی ترکی ہی میں تربت ہے

بے مثل وہ اک شاعر درویش صفت عالم
اس مرشدِ رومی کی ہر دل پہ حکومت ہے

☆☆☆☆

سید نواب حیدر نقوی

کردے پایاب کوئی موجۂ آلام کو بھی
اور ممکن ہو اگر وَرطۂ ایام کو بھی

دلِ بے تاب کو اک لمحۂ عشرت مل جائے
اور میں آسودہ کردوں حسرتِ ناکام کو بھی

گر لکھی جائے کتابِ دلِ بے مہر کبھی
ورقِ شوق پہ لکھ دینا مرے نام کو بھی

کچھ تو رکھنا ہے تجھے نرم نگاہی کا بھرم
آنکھ ترسے نہ تماشائے لبِ بام کو بھی

صبح سے شام تلک دھوپ کی گرمی سہ لی
سایۂ جاں سے نہ محروم رہیں شام کو بھی

توڑ دیں مہرِ خموشی کو صنم خانوں میں
جاگتا بولتا رکھیں ذرا اصنام کو بھی

غُرفۂ شوق سے نظّارہ تو کیجیے راہیؔ
کتنے پہنچے سفری منزلِ خوش کام کو بھی

☆☆☆☆

علی احمد قمر

شب کے سفر میں ساتھ ہی چلنا پڑا مجھے
میں تو دیا تھا شام سے جلنا پڑا مجھے
یوں ہی نہیں ہیں شام کے منظر مرے نقیب
سورج کے ساتھ آگ میں ڈھلنا پڑا مجھے
پھر لوٹ کر نہ جاؤں گا زنداں میں جسم کے
اپنے بدن سے جب بھی نکلنا پڑا مجھے
بارش برس گئی کہیں زرخیز کھیت پر
بنجر زمیں پہ پھولنا پھلنا پڑا مجھے
یہ کیا مقام تھا کہ قدم لڑکھڑا گئے
گرنے سے پہلے کتنا سنبھلنا پڑا مجھے
میں نے سفر کی راہ نہ پھر اختیار کی
دو گام اپنے ساتھ جو چلنا پڑا مجھے
اک تجھ کو بھول جانے کی کوشش میں عمر بھر
کتنی بغاوتوں کو کچلنا پڑا مجھے
کوئی ملال کوئی کسک رنج و غم کوئی
پھولوں کو پاؤں سے جو مسلنا پڑا مجھے
گزری ہے اس کے شہر میں یوں زندگی قمر
سو بار اپنا بھیس بدلنا پڑا مجھے

☆☆☆☆

انجم خلیق

بندشوں سے لاتعلق اور رکاوٹ کے بغیر
وقت اپنی چال چل جاتا ہے آہٹ کے بغیر

تیر جو نکلے زباں سے چھید دیتا ہے جگر
گو کہ جاتا ہے ہدف تک سنسناہٹ کے بغیر

دوستوں کے کاندھے آخر کام کس دن آئیں گے
اک سفر تو مجھ کو کرنا ہے تھکاوٹ کے بغیر

سوچتا ہوں میں، بھلا پھر اس کا خالق کون ہے
دیکھ لوں جب کوئی چہرہ مسکراہٹ کے بغیر

جو خبر پہنچی ہے مجھ تک اس کو بھی معلوم ہے
اب ہوا کیسے چلے گی گنگناہٹ کے بغیر

فقر کا فانوس، پردے کشف کے، قالینِ زہد
ہے فقیروں کی یہ کٹیا کب سجاوٹ کے بغیر

اس قدر ہم جھوٹ کے عادی ہوئے انجم خلیق
شہد بھی شیریں نہیں لگتا ملاوٹ کے بغیر

☆☆☆☆

میر تنہا یوسفی

کسی بہانے، کسی داؤ سے یا حیلے سے
اسے میں مِل ہی نہ آؤں کسی وسیلے سے

کدھر گئے ہیں وہ رانجھا وہ جوگیوں کے گروہ
میں آج پوچھ کے آتا ہوں جوگی ٹیلے سے

وہ کوہ و دشت میں مصروف کارِ عشق بتاں
جو بے مثال تھے، اٹھے مرے قبیلے سے

کہاں گئے وہ گل و نسترن سے لوگ میاں
کہاں سے آئے یہ چہرے، اُداس، پیلے سے

جو ابرِ وصل سے محروم رہ گئے اِک بار
تمام عمر پھرے لے کے نین گیلے سے

اَنا ہی دنیا میں سب کچھ نہیں ہے یار مرے
میں مانتا ہوں، کہو جا کے اُس ہٹیلے سے

میں آج بھی اُسی پل کی گرفت میں ہوں کہیں
چھڑائی جس میں کلائی تھی اس نے ڈھیلے سے

کہاں یہ تلخیِ آوازۂ جہاں تنہاؔ
کہاں سریلے سے دو بول وہ رسیلے سے

☆☆☆☆

ماہ طلعت زاہدی

ایک زمانے بعد بھی زخم ہرا پایا
کیسی محبت تھی کیا معجزہ دِکھلایا

میں تو رُوٹھ بھی جاؤں، دل نہیں روٹھتا ہے
آخر ایسا کیا ہے، جو دل کو بھایا

پیار کے بھید ہیں، کہاں بھلا کُھل پائیں گے
کہیں ہے بارش، کہیں ہے دھوپ، کہیں سایا

کیف ہے نیند کا اور ماحول محبت کا
رات نے کیسے خوابوں میں ہے اُلجھایا

پوچھے اُس سے کوئی محبت کے اسرار
عُمر گنوا کے جس نے، کھویا دل پایا

نیند نہیں آتی تو آنکھیں سوچتی ہیں
کیا کوئی دھوکا جاگتی آنکھوں نے کھایا

میں کچھ اور ہی کہنا چاہوں، غزل کچھ اور
نام مرا ہے باقی ہنر کا سرمایا

☆☆☆☆

شکیل اختر

کبھی تھیں کتنی کمانیں مرے بدن کے خلاف
میں ایک آخری آواز تھا گھٹن کے خلاف

میں چاہتوں کے سمندر میں تیرتا کیسے
قدم قدم پہ بھنور تھے مرے جتن کے خلاف

اُتر نہ جائے کھلے پانیوں میں عکس کہیں
ہوا نے جال بچھائے کرن کرن کے خلاف

فصیلِ شہر پہ بس آخری چراغ تھا میں
ہوائیں تیز بہت تھیں مرے سخن کے خلاف

☆☆☆☆

شاہین عباس

دیے کا کام اب آنکھیں دِکھانا رہ گیا ہے
یہ سیدھا جل چکا، اُلٹا جلانا رہ گیا ہے
ہمیں سامان پورا کر نہیں پائے کہ چلتے
سو رہتے رہتے اِس جنگل سے جانا رہ گیا ہے
نشانے پر لگا تو کیا لگا تیرِ تماشا
وہ اچھا رہ گیا جس کا نشانہ رہ گیا ہے
یہ دو بازو ہیں، سو تھوڑی ہیں کھولوں اور بتا دوں
مرے اطراف میں کس کس کا آنا رہ گیا ہے
کم و بیش اپنا پردہ چاک کر ڈالا ہے ہم نے
یہ چار آخر کی دیواریں گرانا رہ گیا ہے
مرا ہونا نہ ہونا کس کے ذمے تھا خدایا
بنانا رہ گیا میرا، مٹانا رہ گیا ہے
سرِ کوہِ ندا یہ پہلی پہلی خامشی ہے
کوئی آواز ہے جس کا لگانا رہ گیا ہے
میں عجلت میں نکل آیا تھا کیا کہتا کسی سے
تری مٹھی میں میرا آب و دانہ رہ گیا ہے

☆☆☆☆

امتیاز الحق امتیاز

ایک ذرّہ ہو میسر تو ستارہ کرنا
مجھے غربت نے سکھایا ہے گزارا کرنا
آپ کرتے ہیں سمندر میں بھنور کی تشکیل
ہمیں آتا ہے سمندر کو کنارہ کرنا
ایک ہلکا سا تبسم بھی مجھے کافی ہے
میں نے کیا باغِ ثمرقند و بخارا کرنا
میں ترا باپ ہوں اور آپ کماتا ہوں ابھی
بات اس لہجے میں مجھ سے نہ دوبارہ کرنا
سانحہ کوئی کسی موڑ پہ ہو سکتا ہے
جس جگہ میری ضرورت ہو اشارہ کرنا
میرا اسلوبِ فنِ شعر بہت سادہ ہے
چاند کو چاند، ستارے کو ستارہ کرنا
اُس کو معلوم تو ہے میری اذیت لیکن
سامنے اس کے مرا ذکر دوبارہ کرنا
امتیازؔ اور میں کیا شرحِ تعلق لکھوں
ناگواری کو تحمل سے گوارا کرنا

☆☆☆☆

اعجاز گل

یہیں تھا بیٹھا ہوا درمیاں کہاں گیا مَیں
کہ مل رہا نہیں اپنا نشاں کہاں گیا مَیں
نہ کر رہا ہے فلاں کو فلاں خبر میری
نہ پوچھتا ہے فلاں سے فلاں کہاں گیا مَیں
سجے ہوئے ہیں پیادہ و اسپ و فیل تمام
بچھی ہوئی ہے بساطِ جہاں کہاں گیا مَیں
مَیں کب نہیں تھا اکارت مگر رہا حاضر
ہوا ہوں اب کے عجب رائگاں کہاں گیا مَیں
اگر تھا پہلے ہی نام و نشاں مرا مفقود
تو ہو کے بارِ دگر بے نشاں کہاں گیا مَیں
نہ بھیجتا ہے کوئی نامہِ فراق مجھے
نہ ڈھونڈتا ہے پتہ خط رساں کہاں گیا مَیں
جو کر رہا تھا گزشتہ کے واقعات درست
سنا رہا تھا الٹ داستاں کہاں گیا مَیں
لیا گیا ہوں حراست میں بے امانی کی
کہ بے امان تھا شہرِ اماں کہاں گیا مَیں
اٹھا کے لے گیا داروغہِ فنا شاید
کھلا ہوا ہے درِ خاک داں کہاں گیا مَیں
نہیں ہوا ہوں مگر اس طرح کبھی غائب
رہا ہمیشہ نہاں در عیاں کہاں گیا مَیں

☆☆☆☆

عرفان الحق صائمؔ

مرنے کے واسطے نہیں جیتا ہوں صرف میں
جینے کی آرزو میں بھی مرتا ہوں صرف میں

گُم نام حسرتوں کی بھی بہتات ہے مگر
مٹی کے اس مکان میں رہتا ہوں صرف میں

بارش ہوئی غموں کی مرے سارے شہر میں
کیسا یہ اتفاق ہے، بھیگا ہوں صرف میں

دونوں تھے یوں تو جرمِ غریبی میں ہم شریک
لیکن یہ واقعہ ہے کہ رسوا ہوں صرف میں

تم ساتھ ہو تو میرے لیے مسئلہ یہ ہے
جلتا ہے سب جہان سلگتا ہوں صرف میں

میں بے بسی کی مسخ شدہ لاش ہی تو ہوں
اپنے سرہانے بیٹھ کے رویا ہوں صرف میں

صائمؔ خوشی سے رُخ بھی میں بدلوں کہاں مجال
حالات کے بہاؤ پہ تنکا ہوں صرف میں

☆☆☆☆

فاضل جمیلی

کس کس سے رہ و رسم ہے آداب میں اُس کے
اِک میں ہی نہیں حلقۂ احباب میں اُس کے

اُس بھولنے والے کو بھی کیا یاد دلائیں
تصویر تھے ہم جلدۂ کمخواب میں اُس کے

اب جن کی اُداسی میری آنکھوں میں بسی ہے
کچھ دِن تو یہی خواب تھے ہر خواب میں اُس کے

خاموش نگاہی کا گیا حسنِ تکلم
اِک لفظ بھی آیا نہیں ایجاب میں اُس کے

میں نے ہی سمندر کو جزیروں سے ملایا
پھر میرا سفینہ ہی تھا گرداب میں اُس کے

سُن لو گے وہ آواز تو محسوس کرو گے
دِل اپنا دھڑکتا ہوا مضراب میں اُس کے

اِک شال میں لپٹی ہوئی نکلی تھی وہ گھر سے
ٹوٹے ہوئے کچھ خواب تھے اسباب میں اُس کے

☆☆☆☆

عقل! سمجھ لے ختم ہوا اب دور تری سرداری کا
آج اعلان کیا ہے دل نے، اپنی خود مختاری کا

اب تک سہمے سہمے ہیں ہم اپنی اپنی دنیا میں
مجھ کو دل کا دھڑکا ہے اور اس کو دنیا داری کا

دل بنجارا، عشق نگر سے لُٹ پُٹ کر اب لوٹا ہے
لوگ بہت افسردہ ہیں، نقصان ہوا بیوپاری کا

میری سانسیں پی کر اب وہ میری جوانی جیتا ہے
بچپن میں بھی کھیل گیا تھا، بچپن میری باری کا

سب کچھ دے کر خود غرضوں کو اس دنیا سے چلتا بن
ایک یہی آسان سا، حل ہے تیری ہر دشواری کا

دوشی دوشی کہہ کر کس کو روز پکارا جاتا ہے
پھانسی گھاٹ پہ لگتا ہے آوازہ اک درباری کا

☆☆☆☆

رستم نامی

آتے ہو نظر کب نظر آنے کے دنوں میں
ہوتے ہو اُدھر تم اِدھر آنے کے دنوں میں
اُس وقت بھی ہم تجھ کو صدا دیتے رہے ہیں
چپ چاپ گلی سے گزر آنے کے دنوں میں
کیا خوب زمانہ تھا کہ معمول تھا اپنا
ہوتا تھا میں چھت پر قمر آنے کے دنوں میں
بچوں کو شکایت ہے اسی واسطے مجھ سے
ہوتا ہوں کہیں اور گھر آنے کے دنوں میں
یوں تو مرے احباب چلے آتے ہیں ہر دن
آتا نہیں کوئی مگر آنے کے دنوں میں
بھرتا ہے کسی اور کا پانی کہیں جا کر
وہ شخص مری آنکھ بھر آنے کے دنوں میں
مارانِ ستم کیش میں آ جاتی ہے تیزی
معصوم پرندوں کے پر آنے کے دنوں میں
آسودہ ہوں نامؔی تو سبھی لوگ ہیں میرے
کوئی نہ تھا منہ کو جگر آنے کے دنوں میں

☆☆☆☆

ایم شہاب عالم

تیرے ہونٹوں پہ جو ہنسی ہے ناں
میرے بوسے کی مخبری ہے ناں
جھیل سیف الملوک نے پوچھا
جو ترے ساتھ ہے پری ہے ناں
لاؤں تاویل کیا محبت کی
ہو گئی ہے تو ہو گئی ہے ناں
ہے قسم عمر بھر نہ ملنے کی
پھر تو یہ ہجر عارضی ہے ناں
آپ سے خوف آ رہا ہے مجھے
آپ کا نام آدمی ہے ناں
مر چلے ہم مگر بسر نہ ہوئی
یہ جو چھوٹی سی زندگی ہے ناں
آئنہ کیوں یقیں نہیں کرتا
میں وہی اور تُو وہی ہے ناں
جایئے لوٹ جایئے صاحب
آپ کی پیاس بجھ گئی ہے ناں
سچ بتاؤ جو تم قسم سے مری
یاد آئی کبھی کبھی؟ ہے ناں؟
اور کیا چاہیے شہاب عالم
عشق ہے اور شاعری ہے ناں

تسنیم صنم

آئینہ ہاتھ میں تھا آنکھ میں حیرانی تھی
بس اسی بات کی دنیا کو پریشانی تھی

جب جنوں خیزی دنیا سے نکل کر دیکھا
زندگی نے کہا نادان یہ نادانی تھی

ہم ترے دل میں کہاں اپنا ٹھکانہ کرتے
شہر بے مہر تھا اور بے سروسامانی تھی

میں جو ڈوبی تو انا نے ہی ابھرنے نہ دیا
یعنی سوہنی بھی مری طرح کی دیوانی تھی

وہ جو اک ترکِ تعلق ہے بنا وجۂ عناد
اس کو کرنے میں کہاں اس قدر آسانی تھی

ترے آنے کی خبر مجھ کو چھٹی حِس نے دی
ورنہ تو میں سبھی عالم سے ہی بے گانی تھی

جس نے تا عمر صنم چین سے جینے نہ دیا
ایک ٹوٹے ہوئے وعدے کی پشیمانی تھی

☆☆☆☆

شاہد ماکلی

مرے غیاب میں جس نے ہنسی اڑائی مری
کسی نے کیا اُسے حالت نہیں بتائی مری

میں ایک بار سمندر کو جاتا دیکھا گیا
پھر اس کے بعد کہیں سے خبر نہ آئی مری

کشش کا ردِ کشش ہے ، عمل کا ردِ عمل
بدن سے لمحہ بہ لمحہ گریز پائی مری

نہ کچھ افق کا پتہ ہے ، نہ کچھ عمود کا ہے
نہ جانے کیسی فضا میں ہے پَر کشائی مری

وضاحت اس کی کوئی اور کر سکے تو کرے
مری سمجھ سے تو باہر ہے رُو نمائی مری

مجھے تو عرصۂ برزخ تھا جاں کنی جیسا
قیامت آئی تو سانسوں میں سانس آئی مری

زمیں کو جاتی ہے شاہدؔ نہ آسمانوں کو
جس ایک راہ گزر پر ہے نقش پائی مری

☆☆☆☆

ریاض عادل

سبز خوابوں کے بہتے لہو سے، حسیں نہر جاری ہوئی
دیکھیے زرد آنکھوں سے کیا احمریں نہر جاری ہوئی

جا بجا تتلیوں اور پھولوں کی لاشیں تھیں حدِ نظر
اس کی آنکھوں سے آنسو گرے اور وہیں نہر جاری ہوئی

صرف تیشہ سلامت ہے باقی بدن تو برادہ ہُوا
اے مری شیریں سُن، اس طرح تو نہیں نہر جاری ہوئی

صبح کا وقت تھا، بادباں کے تلے، جل پری اور میں
اس کے لب کیا ہلے، ناؤ میں بھیرویں نہر جاری ہوئی

ہجر کے ہجرتوں کے جلائے ہوئے دو بدن جب ملے
آگ سے آگ ٹکرائی اور آتشیں نہر جاری ہوئی

☆☆☆☆

سید کامی شاہ

بیٹھے بیٹھے یہ ترا دھیان کہاں جاتا ہے
دھیان کر دھیان ارے نادان کہاں جاتا ہے
کوئی بتلائے ہمیں، کوئی تو دل کو سمجھائے
عشق کی راہ نہیں آسان کہاں جاتا ہے
اُس کی آنکھوں کے حوالے سے بہت سوچتا ہوں
لے کے وہ قتل کا سامان کہاں جاتا ہے
دیکھنے دیجیے ہم کو بھی کہ وہ ناقہ سوار
کر کے اس راہ کو ویران کہاں جاتا ہے
اتنی مشکل سے مِلا ہے تو ذرا پاس بھی آ
تجھ پہ ہو جاؤں میں قربان کہاں جاتا ہے
اس خرابے میں نہیں تیرے علاوہ کوئی
بیٹھ جا یاں پہ مری مان کہاں جاتا ہے
پہلا آدم تھا جو آیا تھا کسی جنت سے
دیکھیے آخری انسان کہاں جاتا ہے
یار کے گھر کا بھلا، یار کی گلیوں کا بھلا
میرے سینے سے یہ طوفان کہاں جاتا ہے
داغ صاحب کی طرح ہم سے بھی یہ پوچھا گیا
نہ کوئی جان، نہ پہچان کہاں جاتا ہے!!!

☆☆☆☆

سعید اکرم

شام و سحر کا رنگ نہ موسم خبر میں ہے
لگتا ہے یہ زمین اب اُلٹے سفر میں ہے

خود سے، کبھی خدا سے، کبھی تُجھ سے محفلیں
رونق ہزار اس مرے مٹی کے گھر میں ہے

خود ٹوٹ کر بھی ٹُوٹنے دوں گا نہ آئنہ
مجھ میں کہاں وہ بات جو آئنہ گر میں ہے

اُس ایک پل کی آس میں عمریں گزر گئیں
وہ ایک پل جو ہجر کے اندھے سفر میں ہے

مارے نہ جائیں ہم کہیں، لازم ہے احتیاط
دیرینہ ایک دشمنی یاں خیر و شر میں ہے

بے کار جھیلتا نہیں موسم کی سختیاں
ناز و نیاز پیڑ کا سارا ثمر میں ہے

اب کون جائے آئنۂ دل کے سامنے
عکسِ خیالِ شوق بھی اِس کی خبر میں ہے

☆☆☆☆

راؤ وحید اسد

ادائے یوسفی رکھتا ہوں اکثر مار دیتا ہوں
انا مرنے نہیں دیتا میں ٹھوکر مار دیتا ہوں

مرے پیچھے جب آتا ہے کوئی شیطان بہکانے
دُرودِ پاک پڑھ کر ایک کنکر مار دیتا ہوں

تعلق ہے میاں میرا اُسی جنگ جُو قبیلے سے
نکل آیا تو پھر لشکر کے لشکر مار دیتا ہوں

اُسے کہنا مری یادوں میں مت آئے نکل جائے
اُسے کہنا میں یادوں کے کبوتر مار دیتا ہوں

مرے اندر بپھرتی ہیں اگر یہ ہجر کی موجیں
میں دریا ہوں اِنھیں پانی کے اندر مار دیتا ہوں

نہیں مرتا کسی بھی وار سے اُس کو پھر اکثر میں
محبت کی پہاڑی سے اُتر کر مار دیتا ہوں

نہیں میں مارتا ناحق کسی خوش شکل پیکر کو
مگر جب مارنا چاہوں وہ پیکر مار دیتا ہوں

☆☆☆☆

شاہجہان سالف

میرے ہر خواب کی تعبیر لگے راہ مجھے
قریہءِ خواب مبارک ہو تجھے راہ مجھے

ہمسفر فاصلہ رکھنا ہے، کہ دورانِ سفر
قتل ہونے کی توقع ہے سرِ راہ مجھے

لوگ کہتے ہیں بہت تیز سفر کرتا ہوں
بات اتنی ہے چلے ساتھ لیے راہ مجھے

تھک چکا ہوگا ستارہ جو مرا رہبر ہے
لے چلے چاہے جہاں رات گئے راہ مجھے

اے درختو مجھے ہر بار تمہی سنتے ہو
میری خواہش ہے کہ اِس بار سنے راہ مجھے

اور کوئی وجہ نہیں تیری طرف بڑھنے کی
بیچ موجود ہے مجبور کرے راہ مجھے

☆☆☆☆

کاشف بٹ

بیٹھا ہوا ہے ایک شکاری کمین میں
بازی اُلٹ نہ دے نظرِ اولین میں

دل مبتلائے تیرہ شبی ہی رہا، بجھے
چمکے ستارۂ سحری اُس جبین میں

میں زہر کا جگر پہ اثر جانتا ہوں دوست
پلتے رہے ہیں سانپ مری آستین میں

بُت خانۂ جمال سے توقیرِ عشق تک
اِک اضطراب محوِ سفر ہے زمین میں

☆☆☆☆

سید عقیل شاہ

دیکھے نہ فقیری کو، کوئی شک سے ہماری
دیوار میں در بنتا ہے دستک سے ہماری

بازار میں بیٹھے تھے لیے ٹوٹا ہوا دل
سو بحث تو بنتی نہ تھی گاہک سے ہماری

ہم خاک نشینوں کی سمجھ میں نہیں آتا
اس شہر کو کیا ملتا ہے چشمک سے ہماری

قربان اس انصاف کے، خود حضرتِ دشمن
تعزیر لکھے دستِ مبارک سے ہماری

جب دار پہ کھینچے گئے ہم، تب کہیں نسبت
مانی گئی منصور کے مسلک سے ہماری

☆☆☆☆

شہلا شہناز

آنکھ میں عکسِ خوش امکان بھی لا سکتی ہُوں
میں ترے عشق پہ ایمان بھی لا سکتی ہوں

پھول اور پیڑ بہت میرا کہا مانتے ہیں
میں بیاباں میں گلستان بھی لا سکتی ہوں

اے خلش مجھ کو تڑپنے کا کوئی شوق نہیں
ورنہ جب چاہوں نمک دان بھی لا سکتی ہوں

اے محبت میں کفایت نہیں کرنے والی
خرچ کرنے کو دل و جان بھی لا سکتی ہوں

سفرِ دل میں کسی شے کی ضرورت نہیں ہے
خود کو میں بے سر و سامان بھی لا سکتی ہوں

☆☆☆☆

ڈاکٹر احسان اکبر

مرے ہم نفس!

یہ جو رات ساری کا خواب ہے
جو تجھے سُنانا نصیب ہو تو میں
کیا زباں پہ سُخن رکھوں
کہ حروف پوری صدا جو دیں
وہ میں سُن رکھوں
میں تشا بہات وہ چُن رکھوں
کسی دُکھ میں جن کی مثال ہو

مرا ہم شبیہ کوئی ہے
جو ہوا مُدّعی
کبھی کاوشیں جو میں کرنا چاہوں
نہ کر سکوں تو
کسی کا قہقہہ طنز کرتا ہے مستقل
مری بات جس کو سنائی دے
کبھی آئے مجھ کو رہائی دے

مرا حرف باندھنا، سوچنا
خود اک اضطراب کی بیخ و بُن
ترا فاعلن، مجھے امر ''کُن''
متفاعلن کہ مفاعلن کہ فعول فعل میں ہو سخن
بس
مجھے یہی فقط ایک دُھن
یہ عروض عرضِ بیاں کو کیسے مروڑتا ہے
نفس کے تار کو توڑتا ہے
کسے کہوں!

مرا سانس ہی مرا دم ہے
دم میں ہے گونج
ہونے کا اِدّعا
میں تو وہ نہ تھا
جسے اپنی ''میں'' ہی پسند ہو
جہاں ''میں'' کی تال بلند ہو
وہ بھی ہیں
مگر

یہ جو خانقاہ ہے
کب رہی یہاں ہاو ہُو؟

یہاں ساری ضربِ نفَس پہ ہے
مرا اپنا زور قفس پہ ہے
(وہ کنواں جو ہے مری ذات کا)

کوئی آگ جو تھی ہرے بھرے سے درخت میں
میں دیے کو اُس سے اُجالتا
جو سمے کا نقیب تھا
میں وہ اعتکاف سنبھالتا
بڑا شوق تھا
پہ نفَس کی اپنے حدِ حدید نہ توڑ پایا
حدِ حدید شدید تھی

☆☆☆☆

سلمان باسط

امر سمے کی کتھا

تم کون دشا سے آئی ہو مجھے اتنی بات بتاؤ
میگھنینی ہو یا روپ متی، یہ الجھن تو سلجھاؤ
کس سادھو، سنت، گیانی سے یہ تم نے پایا بھید
اک منتر پھونک کے کر دینا من بھیتر گہرا چھید
کاٹ کے چلّے ٹیلوں پر میں ڈھونڈوں انت گیان
اب کیسے چھیڑوں عشق مرلّیا، کون لگائے تان
کس سوامی سے سیکھا ناری من کر لینا رام
چھوڑو سارے محل دو محلے من میں کرو بسرام
یہ کلا کہاں سے پائی ہے، بھلا کس جوگی کے دوار
باہر شیتل روپ نہارے، من میں سُلگے نار
وردان کی سندر کوملتا، یہ شبد کا نرمل روپ
سوچ کے کورے پنے پر یہ دھیان کی اُجلی دُھوپ
کن بھاؤ ناؤں کا اکتارہ مری روح میں بجتا جائے
ذرا دیکھ کھڑا ہوں قرنوں سے ترے در پر سیس نوائے
کس وصل کے بھاگ میں لکھے تھے، کس رُت میں پھول کھلے
کن جنموں کا سنجوگ تھا کس یگ میں آن ملے

ڈاکٹر وحید احمد

کوئی بستی کہ مجھ میں بستی ہے

میں آخر کس کی جاگت جاگتا ہوں
پپوٹوں میں یہ کس پانی کا نمکیں ذائقہ ہے
مری پتلی میں کس کی رات ہے
اور قرینہ میں کون سے یگ کا سویرا ہے
یہ دن بھر کون
مژگانی کواڑوں کو مسلسل کھولتا اور بند کرتا ہے
مری تارِ نظر پر بیٹھ کر
آخر زمانے میں نظر کس کی اترتی ہے
میں آنکھوں سے یہ کس منظر کے اندر بھاگتا ہوں
میں آخر کس کی جاگت جاگتا ہوں ۔۔۔؟

بھلا میں کس کا سونا سو رہا ہوں
یہ ریگِ خواب پر بنتے بگڑتے کیا نشاں ہیں
مرے اندر تو جتنے قافلے چلتے ہیں
سارے اجنبی ہیں
میں ہر اک خواب میں کوئی شناسا ڈھونڈتا ہوں

یہ کیسی عورتیں ہیں
جو سر میں ریت کی افشاں بھرے
مجھ کو جکڑتی ہیں
جو بعد از اختلاط آہوں سے چیخوں سے پگھل کر
ریت ہو جاتی ہیں گیلی ریت میں
یہ بچے کس صدی کے ہیں
جو اپنے قہقہے اور کھلونے میرے ہاتھوں میں تھما کر بھاگ جاتے ہیں
یہ کس معبد کے جوگی ہیں
صحیفوں کی زباں میں بولتے ہیں
ان کے فرغل پھڑ پھڑاتے ہیں
ہوا میں ریش اُڑتی ہے
یہ میں کس کی خوشی کو ہنس رہا ہوں
کس کا رونا رو رہا ہوں
بھلا میں کس کا سونا سو رہا ہوں؟

میں آخر کس کا جینا جی رہا ہوں؟
میں صحرا کا شجر ہوں
جس کی شاخیں گھونسلوں سے جھک گئی ہیں
کرائے کا مکاں ہوں
جس کے کمروں میں پرائے لوگ رہتے ہیں

فرازِ کوہ پر کوئی پرانا غار ہوں میں
ہوا سے گونجتا سایہ زدہ ویراں کھنڈر ہوں
کبھی ہوں ایستادہ اور کبھی مسمار ہوں میں
فصیلِ شہر ہوں یا سایۂ دیوار ہوں میں
مرے اندر سے ہی کوئی مجھے بتلائے
میں کیا ہوں؟
مرے خلیوں کے گیلے مرکزوں میں بند ڈی این اے مرے ماں باپ کا ہے
جو اس کے گرد پانی ہے
وہ کس بے چین سیارے کے ساگر سے اٹھا ہے
میں کس کو بھوگتا ہوں
یہ آخر کون مجھ میں گونجتا ہے
سنسناتا ہے
میں آخر کس کا ہونا ہو رہا ہوں

☆☆☆☆

انجم سلیمی

میں اپنا نوحہ لکھ چکا

میں دوسروں سے مختلف تھا
سو اسی لیے کوئی قطار نہیں بنا سکا
میں زندہ کتبوں کا مجاور بن کر نہیں بیٹھ سکتا

پھول بیچنے والے
قبرستانوں کے داخلی دروازوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں
موت ہمیشہ زندگی سے خوف زدہ رہی

زمین، سمندر کی طرح کم ظرف نہیں
جو مرداروں کو اُگل دے گی
کتبوں پر زندگی لکھنے سے
قبریں زندہ تھوڑی ہو جاتی ہیں
روز کہیں نہ کہیں
کسی نہ کسی قبرستان میں میرا انتظار کیا جاتا ہے
اور میں ہوں کہ
زندگی سے مصافحہ کرنے، جانے کہاں نکلا ہوا ہوں

گورکن مجھے زندگی کی دعا کیوں دے گا
میں اپنا نوحہ لکھ چکا
اب مرنے سے پہلے
میں جی بھر کر جی لینا چاہتا ہوں

☆☆☆☆

آصف ہمایوں

سرحد

پیارے!
یہ کس اندر اور باہر کے درمیان ہوتے ہیں
وہ در و دیوار
جن پر دیدہ اور نادیدہ ہاتھ
دستکیں دیتے رہتے ہیں
کون ہیں یہ لوگ جو
اپنے وجود کے شجر کی شاخوں میں سے
ہوا بن کر گزرتے رہتے ہیں
پتوں کی تالیاں سنتے رہتے ہیں
کبھی اپنے ہی سر پر پرندہ بن کر اُڑنے لگتے ہیں
نہ جانے کس سے ملنے کی حسرت میں
تعلق کی ٹوٹی ہوئی گرہوں کے کونے کھدروں سے
نکلے ہوئے دھاگے جوڑتے رہتے ہیں
بکھرا ہوا ریشم اکٹھا کرتے رہتے ہیں
جانے کیسے عاشق ہیں یہ
عاشقاں!

عشق کیا کوئی لاوارث جذبہ ہے؟
میں بھی گلی کی بدروح کے پاس
کبھی اُس بے در احاطے کو دیکھ کر رُک جاتا ہوں
منہ سے چبایا ہوا پان تھوکتا ہوں
فلسفوں کے انبار کا تھیلا باہر ہی چھوڑ کر
دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے
بے در کے احاطے میں داخل ہو جاتا ہوں

☆☆☆☆

سید ضیاء الدین نعیم

شہید

شہید زندہ ہیں
زندہ انھیں کہا جائے
انھوں نے واری ہے جان اپنی
حق کے رستے میں
کیا نثار، انھوں نے ہمارے کل کے لیے
وہ اپنا آج
جو رشک آفریں تھا، روشن تھا
شہید زندہ ہیں
زندہ انھیں کہا جائے
یہ رزق پاتے ہیں پروردگار سے اپنا
اگرچہ ہم کو نہیں
ان کی زندگی کا شعور
کہ درمیان ہے
فانی حیات کی دیوار
شہید زندہ ہیں
زندہ انھیں کہا جائے
سُنیں وہ مائیں، وہ والد کہ جن کے لختِ جگر
وفا کی راہ میں، جاں دے کے
سرفراز ہوئے
سُنیں وہ بہنیں وہ بھائی کے جن کے دل کا پھول

اُچک کے لے گیا
کوئی شقی، کوئی سفّاک
سُنیں وہ بیویاں، بچّے کہ جن کے گھر کا چراغ
بُجھا گیا کسی سموم باد کا جھونکا
سُنیں وہ دوست جنھیں کوئی دستِ ناہنجار
دلی رفیق سے
محروم کر گیا یک لخت
تمھارا غم، وہ غمِ معتبر ہے
جس کی قدر
خدائے پاک کے نزدیک سب سے بڑھ کر ہے
تمھارے آنسو نہیں ہیں
یہ سب جواہر ہیں----
تمھارے صبر کا وہ اجر ہے
خدا کے پاس
کہ جس کی کوئی نہایت ہے
اور نہ کوئی حساب
کہ تم کو شکوہ نہیں رب سے
شکر کرتے ہو
تم اپنے زخمِ جگر پر بھی
ناز کرتے ہو
شہید زندہ ہیں
زندہ انھیں کہا جائے
سلام تم کو شہیدو
ہمارا تم کو سلام

زاہد مسعود

ڈسٹ بن

اس نے کوریئر والے سے میرا پیکٹ وصول کیا
اور
اسے اپنے نرم اونی سویٹر میں چھپا لیا
جیسے
دھند نے اسے گھر والوں سے چھپا لیا تھا
میرے خط کو
اس نے پڑھے بغیر ڈائری میں رکھا
شاید
دھوپ کے انتظار میں
پیکٹ کو اس نے پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینکا
میرے نام، ایڈریس اور میری یاد سمیت
میں نے
اپنے نیم تاریک کمرے کے روشندان میں سے
بہتی ہوئی روشنی میں کچھ ذرے الگ کیے
اور ان کی مدد سے

اس کے خد و خال ترتیب دیے
میں نے اس کے نام ایک نیا خط لکھا
اور قلم کو
اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپا لیا
جیسے اس کو چھپانا چاہتا ہوں
سخت موسموں سے
اور
لوگوں کی دہکتی ہوئی نگاہوں سے

☆☆☆☆

سعود عثمانی

زمیں پہ انصاف کرنے والے

میں دو گروہوں کے درمیاں اک سفید پرچم لیے کھڑا ہوں
مگر کوئی مانتا نہیں ہے
مرے یمین و یسار دونوں گروہ اک دوسرے سے حد درجہ مختلف ہیں
مماثلت ہے تو بس یہی ہے
کہ ان کی انسانوں جیسی شکلیں ہیں
اور دل بھیڑیوں کے دل ہیں
مرے بدن پر جو زخم ہیں سب
مرے یمین و یسار میں ہیں
میں جانتا ہوں کہ تیز نیزے، کڑی کمانیں ابھی مرے انتظار میں ہیں
کہ پتھروں نے بھلا کبھی التجا سنی ہے؟
جو اِس طرف ہیں
یہی جو میرے بدن کی دائیں طرف کو تیروں سے چھیدتے ہیں
یہ سب خدا ہیں
یہ اہرمن جو زبان یزداں میں بولتے ہیں
یہ سب خدا ہیں
جو میرے اعمال اپنے ہاتھوں میں تولتے ہیں
یہ سب خدا ہیں
اگر یہ میرے خدا نہیں ہیں
تو پھر یہ طے ہے

کہ جھوٹے نبیوں کی قوم تجی زمین پر بھیج دی گئی ہے
مگر یہ بے رحم ان مہذب جنونیوں سے بہت الگ ہیں
جو روز و شب میرے بائیں پہلو میں اپنے نیزے چبھو رہے ہیں
وہ آسماں سے زمیں پہ نازل ہوئے تھے اور یہ
زمین سے آسماں پہ مبعوث ہو رہے ہیں
یہ لوگ میرے ہی خون سے مجھ کو دھو رہے ہیں

تمام قوموں، تمام چہروں کو صاف شفاف کرنے والے
زمیں پہ انصاف کرنے والے
مرے لیے اپنے خاص انصاف کا صحیفہ لیے کھڑے ہیں
سفید رُو خوش لباس قاتل
وہ ناخدا ہیں جو سب خداؤں سے بھی بڑے ہیں
یہ علم و حکمت، یہ عقل و دانش،
یہ کاسۂ سر
یہ سارے تمغے جوان کی پوشاک پر جڑے ہیں
دمکتی پوشاک میں یہ سفاک مسکراہٹ ہے جو مجھے خوب جانتی ہے
اور اس کو میں خوب جانتا ہوں
سفید قاتل
کہ جن کے ہمراہ گندمی رنگ خاص چوپایہ آدمی ہیں
اور ان کے پٹوں کی جھنجھناتی سنہری زنجیریں
ان کے آزاد مالکوں تک پہنچ رہی ہیں
یہ خاص چوپایہ آدمی ہیں
جو اپنے راتب کو ہضم کرتے ہیں

اور دانشوری کا فضلہ نکالتے ہیں
مگر یہ دانش وری کے تاجر
خرد کی آڑھت پہ بیٹھتے ہیں تو اپنی دُم سے
نشست بھی جھاڑتے نہیں ہیں
ذرا سا کھرچو
تو سطحِ انسانیت کی پتلی تہوں تلے سے
نکیلے، پتھریلے ناخنوں، تیز دھار دانتوں سمیت اک مسلکی جنونی
نکل کے آتا ہے جس کی باچھوں سے گرم تازہ لہو کے فوارے چھوٹتے ہیں

میں کس طرف ہوں؟
کہ میں کمانوں کا بھی نشانہ ہوں
اور زبانوں کا بھی ہدف ہوں
میں تیر کھاتا ہوں اور طعنے سہارتا ہوں
دہن دریدہ وجود میرے بدن دریدہ وجود کو بخشتے نہیں ہیں
یہ دونوں لشکر جو میری بستی میں آگھسے ہیں
نہ جانے کب تک یہاں رہیں گے
میں دو درندوں کے بیچ کب تک سفید پرچم لیے رہوں گا
سفید پرچم
مگر یہ اتنا سفید بھی اب کہاں رہا ہے

☆☆☆☆

رضی الدین رضی

جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں

کبھی ہم دھند میں بھی دور تک منظر میں ہوتے تھے
جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں تو ہر پیکر میں ہوتے تھے
کسی دریا، کسی صحرا، کسی خوشبو، کسی آنسو کو ہم آنکھوں میں رکھتے تھے
اور اُس کو دیکھ لیتے تھے
کبھی ہم ایک جگنو کو تصور میں سجاتے تھے
اور اُس کی روشنی میں دور تک بڑھتے ہی جاتے تھے
کہ آنکھیں ساتھ دیتی تھیں
بہت سے منظروں میں یہ ہمارا ساتھ دیتی تھیں
بہت سے راستوں میں یہ ہمارے ساتھ ہوتی تھیں
جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں
تو ہم منظر کے ساتھ آواز کو بھی دیکھ لیتے تھے
کسی دم ساز کے اُس دل نشیں انداز کو بھی دیکھ لیتے تھے
کہ جس میں جاودانی تھی
کوئی دریا تھا اور اُس کی روانی تھی
محبت کی نشانی تھی
ہمارے پاس کچھ سامان تھا جس میں
بہت سے بے سرو سامان لمحوں کی بہت سی رائیگانی تھی
مگر ہم مطمئن تھے بس کہ آنکھیں ساتھ دیتی تھیں

جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں تو ہم باتیں بھی کرتے تھے
کسی سے ہجر لمحوں میں ملاقاتیں بھی کرتے تھے

مناجاتیں بھی کرتے تھے
کتابوں میں اگر اک لفظ مدھم بھی کہیں ہوتا
تو وہ روشن ہی ہوتا تھا
اگرچہ اُس گھڑی بھی اپنی آنکھوں میں فقط ساون ہی ہوتا تھا
مگر اتنا تو تھا چاروں طرف جیون ہی ہوتا تھا
سو ہم لفظوں کو تکتے تھے
کتابوں میں چھپے چہروں کو تکتے تھے
کبھی ہم رقص کرتے تھے، کبھی ہم گیت گاتے تھے
کبھی رومال کے کونے میں اک وعدہ کسی کا باندھلاتے تھے
کبھی ہم مسکراتے تھے، کبھی ہم سانس لیتے تھے

جب آنکھیں ساتھ دیتی تھیں تو چہرے ساتھ دیتے تھے
وہ آوازیں اور آوازوں کے لہجے ساتھ دیتے تھے
کبھی نظریں ملاتے تھے تو نظریں ساتھ دیتی تھیں
اور اُس سے بات کرتے تھے تو سانسیں ساتھ دیتی تھیں
جو دل میں چور ہوتا تھا کبھی وہ مور بن کر رقص میں آتا
تو جیسے سب زمین و آسماں بھی وجد میں ہوتے

عجب یہ چور لمحہ ہے
نہ آنکھیں ساتھ دیتی ہیں، نہ لہجے ساتھ دیتے ہیں
نہ منظر وجد میں ہیں اور نہ رستے ساتھ دیتے ہیں
نہ ساون ہے، نہ جیون ہے، نہ وہ جگنو ہی روشن ہے
مگر اس دھند میں پھولوں بھرا رستہ تو باقی ہے
رضی میں شکر کرتا ہوں کہ آنکھوں میں وہ اک چہرہ تو باقی ہے
اُس اک چہرے کو تکتا ہوں تو آنکھیں ساتھ دیتی ہیں
اور اُس سے بات کرتا ہوں تو سانسیں ساتھ دیتی ہیں

ڈاکٹر شکیل پتافی

61اور 16 کا فرق

آگ جلی ،انگارے مہکے
تارے ٹوٹے ،ارماں دہکے
ریت پر بیت کے گھن چکروں میں
ایک الاؤ تاپ کے رادھا
ہار چلی ہے جیون آدھا
لفظوں کی دیوار کے پیچھے بندھن ہے
بندھن میں جیون کی ساری الجھن ہے
کچے ہاتھ پہ پکی عمر کی ریکھا ہے
پُنہاری کا جوبن کس نے دیکھا ہے
اکسٹھ اور سولہ کا فرق ہے دونوں میں
سلگ رہے ہیں دونوں گھر کے کونوں میں
پچھلے برسوں سے
ایک اِدھر اور ایک اُدھر

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد معراج

موہے پیا ملن کی آس

سکھی کب رات گزرے گی
سکھی کب پی ملن ہوگا
مری جاں سولیوں پر ہے
سکھی تن تھک گیا ہے
من بھٹکتا ہے
مرے پاؤں کی پائل بھی
زمانے سے یونہی خاموش بیٹھی ہے

مری آنکھیں بھی پتھر ہیں
اڈیکیں ختم کب ہوں گی ۔۔۔؟
سکھی میں کیا کروں ۔۔۔؟
کچھ سن نہیں سکتی
سوائے دل کی دھک دھک کے
سکھی سلگن بہت ہے
سکھ سمندر پی لیا میں نے
میں اپنے پی کے خدوخال کب سے بھول بیٹھی ہوں

سکھی پینگوں پہ باری جھول بیٹھی ہوں
سکھی کب لوٹ آئیں گے تماشائی
سکھی وہ تالیاں پیٹیں تو اُن کے ہاتھ دکھتے ہیں؟
مگر مجھ میں دکھن ہے جو برابر بڑھتی جاتی ہے
سکھی کب ختم ہوگا یہ تماشا

(میرابائی کے لیے)

☆☆☆☆

رخشندہ نوید

آج

آج پھر ایک دن
گزارا ہے
آج گزرا ہے پھر سے اور
اک دن،
دن کہ رقصاں ہے
اپنی وحشت میں
آج پھر سمت طے نہ ہو پائی
تیر چل جائے جیسے عجلت میں
روز کی طرح پھر سے دن آیا
آج پھر کام ہو نہیں پایا

کام دل کے کہے پہ ہوتا ہوا
بے خبر بچہ جیسے سوتا ہوا
بیل سے خواہشوں کی کاٹا ہوا
دانہ میٹھا پسند سے اپنی، چُن کے ہاتھوں سے اپنے چھانٹا ہوا
کتنے لمحوں کا گھونٹ بھر دیکھا

ذائقے جو بھی تھے وہ ضائع ہوئے
کپ میں انڈیلتے ہی مائع ہوئے
روز سورج کے چڑھتے ہی سوچا
آج گھڑیال کی منادی پر اپنی مرضی سے جاگنا ہوگا
آج اس شب کا سرو قامت جن
نیند کے مخملی سرہانے پر
خواب سے یدھ کر نہ پائے گا
آج پھر دن کے خالی ڈبے میں
ایک چٹکی پڑی ہے مٹی کی
مانگ لمحوں کی کیسے بھر پائے
دن کے چھینٹے لبوں پہ گرتے ہی
آج کھولا ہے پھر رجسٹر کو
درج رکھا ہے کر کے صفحے پر
ایک وعدہ جو روز ہوتا ہے
آج کچھ روزگار سے ہٹ کر
آج کچھ انتظار سے ہٹ کر
ہٹ کے کچھ دور یا دیاراں تلے
غسل ہو آج ابرِ و باراں تلے

☆☆☆☆

علی بابا تاج

ایک غیر مطبوعہ تاریخ

مٹی سے جُدا تھے
یا تاریخ الگ تھی
یہ لوگ
زمینوں سے جُدا تھے
زمانوں کے مکیں تھے
ہر بار یہی تھے
ستم ہائے بشر کے
یہ زیرِ نگیں تھے
غم اور الم کے یہ لوگ امیں تھے
خود خواب تھے اور خواب کے بیوپار بھی کر کے
یہ اپنی متاع ساتھ لیے پھرتے رہے
بکتے رہے نام و نشاں کو
بے سایہ و سرمایہ رہے بے انت سفر میں
یہ لوگ کتھا تھے
تکراری کہانی کے کردار تھے یہ لوگ
بہروپ تھے یہ لوگ

یہ لوگ

ارضِ خدا پہ آبا کی عرضی
لے لے کے صدا دیتے رہے تھے
یہ عدل کی زنجیر جھٹکتے
یا شور بھی کرتے
یہ لوگ یہی لوگ
انصاف کے ہاتھوں کی لکیروں سے الگ تھے
کس گام پہ کس نام سے
گمنام یہ رہتے
کس قافلہ سالار کے ہم گام یہ بنتے
یہ ان کا نصیبہ
کہ دنیا کی اس خاک کو چھانیں
یہ اپنا نشاں اپنا مکاں اس روئے زمین پہ
ہر روز یہ ڈھونڈیں
یہ لوگ عجب ہیں
ان کا کوئی نغمہ ہے
نہ ان کا ترانہ
نہ کوئی مورخ ہے جو اس سچ کو جانے
نہ کوئی مغنی ہے جو اس درد کو گائے
اک حرف، مرتب ان کے لیے ہے

نہ سطر، مزین کوئی ان کے لیے ہے
تاریخ کا اک باب ہے اور
اس میں لکھی ہیں
کہیں معدوم سی سطریں
کئی موہوم سی سطریں
وہ سطریں بھی خاموش بہت ہیں
اب ان کی تلاوت کو ہیں الحان بھی خاموش
ہر آن جو خاموش ہے تو اذہان میں خاموشی
ہم اہلِ قلم
ہم سچ کی آواز ہیں
ہم سب کی زبانیں ہیں
اور ان کی زبانی
آفات کیا صدمات کیا لمحات بھی خاموش
لفظوں کی کہانی کا یہ عنوان بھی خاموش

☆☆☆☆

عمران ازفر

دریا مرتا جاتا ہے

ہانپتے گرتے جہلم کی البیلی لہروں کے اُس جانب
بستی جو چرخہ کاتتی شور مچاتی رہتی ہے
دن کے سارے پہروں میں
رات کو پہرہ دار کی سیٹی
سُن کر بستر گرماتے ہیں بچے
وہ بستی اب قصبہ بن کر پھیلتی جاتی ہے
شیطان کی اُلجھی آنت کے جیسی

جس بستی میں
دُور دُور تک پھیلے باغوں کی مٹی سے
تازہ رُتوں مہک سے اپنی
ٹھنڈے جسموں کے ریشوں میں سُرخ لہو کا رقص جمائیں
ریشم خوابوں کے جگنو بھی
اُلجھی سانسوں کو گرمائیں

اُس بستی میں

جیون اپنی چوکھٹ پر سب
رنگ رنگ کے کھیل سجائے ، چلتا جائے
اور تمھاری راہ کو تکتی شبھی کے چہرے پر رقصاں
آڑی ترچھی قندیلوں سے پھوٹتی حدت
دیپ سے روشن

بہتے جہلم کے ماضی کی کتھا کہانی
بولتا پانی ، کہتا جائے
بوڑھا دریا چلتا جائے

گرتے پڑتے جُگ میں تم بھی
شام ڈھلے تک آ جانا
کہ اس سے پہلے چرخہ کاتے ، ریشم بُنتے
ہاتھوں میں جب چھید پڑیں تو
بوڑھا دریا کچی مٹی کے پہلو میں
لحظہ لحظہ مرتا جائے !

☆ ☆ ☆ ☆

نینا عادل

چار دیواری میں چنی ہوئی عورت

بند کے اُس طرف خود اُگی جھاڑیوں میں لگی رس بھری بیریاں خوب تیار ہیں
پر مرے واسطے ان کو دامن میں بھر لینا ممکن نہیں
اے خدا! جگنوؤں قمقموں اور ستاروں کی پاکیزہ تابندگی
وہ جگہ، سو رہی ہے جہاں پر چناروں کے اونچے درختوں سے نتھری ہوئی جاں فزا چاندنی
۔۔۔ خوشبوئیں خیمہ زن ہیں جہاں رات دن
میری اُن سرحدوں تک رسائی نہیں
اور چھچھم کی چنچل سریلی ہوا میرے آنگن سے ہو کر گزرتی نہیں
میں کہ بارش کے قطروں سے نتھرے ہوئے سبز پتوں کے بوسوں سے محروم ہوں
ان کواڑوں کی پرلی طرف دیر سے بند پھاٹک پہ ٹھہرے ہوئے اجنبی
آس اور بے کلی
حرف اور ان کہی
کچھ نہیں
میں نے کچھ بھی تو دیکھا نہیں
میرے کمرے کی سیلن، گھٹن اور خستہ دِواروں کے پیارے خدا
اور پچھنا کہی
تو مجھے اک گنہ کی اجازت ملے

الیاس بابر اعوان

اے مرے خواب

اے مرے خواب!
ہُنر خیز روایت کے امیں
انکشافات کی دریوزہ گری چھوڑ بھی دے
گردِ ہنگام میں ترتیب سے رکھ
آنکھ کی خستہ فصیلوں سے گرے خشت مزاج
اَن چُھے زرد گلوں سے ڈھکے کچھ سوختہ پل
سمت کا کوئی تعین تو نظر میں ٹھہرے

اے مرے خواب!
مرے ساتھ نہ چل
مجھے درپیش ہے لاسمت سماج
ایک ویرانی تماشے میں گندھی
یہ تماشا نہیں پابندِ چراغ
گردِ ئے، رختِ سفر آنکھ کا چھل
گھر کہاں ہے کوئی گھر میں ٹھہرے

اے مرے خواب!

مناروں پہ پرندے اُترے
جانے کس خوف سے جنگل سے پلٹ آئے ہیں
ڈر ہے یہ سرخ عقیقوں کو نگل جائیں گے
سنناتی ہوئی تنہائی میں گھر جائیں گے
ان کو درپیش ہے اب ہجر کا تھل
اس خرابے میں بھلا کون سفر میں ٹھہرے

☆☆☆☆

شبیر نازش

نمو زندگی کی علامت ہے

بھوک بچے کھا رہی ہے
بحرانِ قبیلہ شب و روز افزائشِ نسل میں مصروف ہے
زمین کا خاکی چہرہ سرخ دھبوں میں چھپا جا رہا ہے
سمندر کی نیلاہٹ گدلا رہی ہے
تنفس میں گرہیں پڑ رہی ہیں
آخری جگنو کی دُم پہ سیاہی ملی جا رہی ہے
ایسے میں چراغ جلانا
شاخِ زیتون پہ فاختہ کو بیٹھے دیکھنا
کس قدر زندگی آمیز ہے
تم نہیں جانتے
وہ جانتا ہے
جو دو پاٹوں میں پستے ہوئے
پتھر سے پھوٹتی کونپل کو سبز آنکھوں سے دیکھ رہا ہو

☆☆☆☆

رفاقت راضی

مرے بابا جانی

بڑھاپے کی بے سمت گہرائیوں کی کٹھن لرزشوں میں اترتا ہوا
اک سخن باش آنکھوں کا مالک
ستاروں سی رعنائیوں سے بھری مسکراہٹ کا حامل
خلوص و محبت میں کامل
پریشان دِکھنے لگا ہے
تو جیسے یہ دنیا بدل سی گئی ہے
کئی خواب اپنے لہو، تیز رو، لفظ گر، حرب سجائے ہوئے
آ گیا، پانچ عشروں کا بار اپنے سر پر اٹھائے ہوئے
اس لہو کے بھی کیسے عجب کھیل ہیں
کیسی بے پیش بینی رفاقت سے اپنے قراروں کو موجود کرنے کی خاطر
کہانی کا کردار رہتا نہیں ہے
کوئی بات دل کی بھی کہتا نہیں ہے
مگر اک جہت ایسی ایجاد کرنے میں مشغول ہے
جس جہت میں ستاروں سی رعنائیوں سے بھری مسکراہٹ
کا گہرا لہو
اپنے ہونے کو ترتیب کے آسمان زاد لفظوں میں ملفوظ
کرنے کو ہے
دستکیں دے رہی ہے ہتھیلی پہ اس کی کہانی
مرے بابا جانی!

محمود احمد قاضی

درخت آدمی

پچاس سال سے وہ میری یادوں کی قبر میں دفن تھا اور اب وہ میرے سامنے زندہ ہو کر آ گیا تھا۔ ایک خط کے ذریعے اور وہ بھی اس نہایت بے ڈھنگے سے خط کے ذریعے جس کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ کہا تھا اگر مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو جلد مل لو کیوں کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں خودکشی کرنے والا ہوں۔ فقط تمھارا منیر۔ ان پچاس سالوں میں جب ہمارا ملنا ملانا ختم ہو چکا تھا اور میں اپنے تئیں اسے مرا ہوا سمجھ چکا تھا (اسی طرح وہ شاید مجھے بھی مرا ہوا ہی سمجھ چکا ہوگا۔) اس خط نے اچانک اسے ایک زندہ حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔

ہم دونوں کی دوستی ایسی تھی کہ ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوا بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ ہم دونوں کے جاننے والے ہم دونوں کے اس تعلق کی وجہ سے کسی قدر رجلاپے کا شکار تھے۔ میں جب بھی اسے لاہور میں ملنے کے لیے جاتا وہ اپنی محبت بھری باہیں میرے لیے کھول دیتا۔ ہم دونوں پروگرام ترتیب دیتے۔ دیکھی جانے والی فلموں کی (ہالی وڈ کی) فہرست بنتی۔ موسیقی کے گراموفون ریکارڈ بھیجے جاتے۔ کھانے کے لیے ریستوران منتخب کیے جاتے۔ سستے مگر صاف ستھرے۔ اس کے گھر میں جہاں وہ اپنے بھائی بھابی، ماں اور ہم عمر بھتیجے کے ساتھ رہتا تھا ہم دونوں دو عدد پاپوں اور چائے کے پیالے کے ساتھ ناشتہ کرتے اور کتے خصی کرنے کے لیے نکل پڑتے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم لاہور کو دوبارہ دریافت کرنے نکلے ہوں۔ نئی نئی گلیاں، بازار، لوگ کردار ہم سے ٹکراتے یا وہ ہماری طرف رجوع کر لیتے تھے۔ ہمارا ٹارگٹ زیادہ تر پرانا شہر ہوتا تھا۔ والڈ سٹی، جس کے اندر ہر گلی، ہر موڑ، ہر چوبارے اور ہر اینٹ کا اسرار ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ ہم شام کو ایک نئی کہانی، نئی داستان اور نئے کردار کو اپنے ہمراہ لیے نمودار ہوتے تھے۔ پھر ہماری بحث کا آغاز ہوتا۔ اس بحث مباحثے کے لیے باقاعدہ کسی جگہ کا انتخاب نہیں کیا جاتا تھا۔ بس جیسے اور جہاں جیسی کیفیت تھی۔ ہماری یہ بات چیت سینما ہال میں بھی ہو سکتی تھی۔ یوں ادھوری رہ جانے والی فلم بعض اوقات دوبارہ دیکھی جاتی تھی۔ ایسی ہی گفتگو کے دوران صحیح طور پر دیکھی نہ جانے والی دو فلمیں کرک ڈگلیس کی Light at the Edge of the world اور جین فونڈا کی They Shoot Horses, Don't They? تھیں۔ ہم دونوں کا یہ مکالمہ فٹ پاتھ پر بھی ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر کے باہر برآمدہ نما جگہ پر بھی اس کا آغاز ہو سکتا تھا اور شاید کہیں بھی کسی بھی وقت یہ ہمارے درمیان کھمبی کی طرح اُگ سکتا تھا۔ ایسے میں بعض اوقات جنگ و جدل کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔ نقطہ نظر میں شاید اختلاف اور ایک دوسرے کو پیش کیے گئے متضاد استدلال کے باوجود ہماری بول چال کی

بندش بس لمحاتی ہی ہوتی تھی۔ کبھی وہ بلا لیتا تھا اور کبھی میں اسے منا لیتا تھا۔ فلم، ادب، آرٹ، آرکیالوجی، تاریخ، فلسفہ، سائنس اور نہ جانے کون کون سے موضوعات کو ہم کھنگالتے رہتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران مختلف بڑے بڑے لوگوں اور مشاہیر کی کوٹیشنز کثرت سے دہرایا کرتا تھا اور مجھے اس سے چڑ تھی میں اسے ہمیشہ کہتا تھا بھئی اپنی بات کرو۔ یہاں دیکھنے کو، پرکھنے کو، کہنے کو بہت کچھ ہے جو کہ اوریجنل ہے، ان ٹچڈ ہے، اچھوتا ہے۔ بہت سی نئی فکری زمینوں پر ہمارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے۔ ابھی بہت ساری نئی مٹی اور پانی کھنگالے جانے کے لیے ہمارا منتظر ہے۔ وہ کہتا تم میرے علم، مطالعے اور حافظے سے جلتے ہو۔ جب پڑھو گے نہیں تو نئی نئی چیزوں کے بارے میں تمھیں آگاہی کیسے ہوگی۔ تمھارا مطالعہ محدود ہے کیوں کہ تم نے اب تک فٹ پاتھوں پر بکھرے کتابی علم سے استفسار کیا ہے۔ جب کہ اصل علم تو لائبریریوں، اٹلسوں، قاموسوں اور عالموں کے ذہنوں میں محفوظ پڑا ہے۔ یہ جو تم آٹھ آنے بارہ آنے والی سستے ایڈیشنوں والی کتابیں پڑھتے ہو یہ فکشن اور شاعری کو سمجھنے میں تو مدد دیتی ہیں لیکن زندگی کو صحیح طور سے سمجھا نہیں پاتیں۔ اس کے لیے سچے لفظوں سے مزین کتابوں سے دوستی کرنی پڑتی ہے اور سچے لوگوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ اس کا آخری جملہ ہوتا تھا جہاں میں اپنا اختلافی نوٹ دے کر بعض اوقات اس کے پاس سے بھاگ آتا تھا۔ میں اس سے کہتا جب علم عقیدت کے غلاف میں چھپ جائے اور تعلقات یعنی انسانی تعلقات پیری مریدی جیسی حالت کے سپرد ہونے لگیں تو تب ہی قدریں تاراج ہونے لگتی ہیں۔ یہ مائنڈ سیٹ ہے۔ تم جب تک اس سے باہر نہیں نکلو گے اس وقت تک تم محض آثار قدیمہ کی مردہ مٹی جیسے ہی رہو گے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی ناک سے غصے کا دھواں خارج ہونے لگتا۔ اس کے اعضا تھرتھرانے لگتے، سر کے بال کھڑے ہو جاتے۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں اور اس کی آنکھیں دو انگاروں کی صورت ہو جاتیں۔ اس کے ہونٹ تڑخ کر سیاہ ہو جاتے۔ تب وہ ادھر منہ کر لیتا اور میں ادھر۔ جب دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی اپنی ہار ماننے کو تیار نہ ہوتا تو نوبت ٹاس تک پہنچ جاتی۔ طے ہوتا کہ ہم نے اب ملنا ہے یا نہیں، یہ سکے کا ہیڈ یا ٹیل فیصلہ کرے گی اور ہمیشہ ہیڈ ہمیں بچا کر لے جاتا۔ ہم پھر سے بات کرنے، ملنے اور ہنسنے کے لیے مل کر نئی بحث کرنے کے لیے خود کو تیار پاتے تھے۔ مجھے یاد ہے یہ کوئی بحث ہی تھی، شاید تاریخ کے صحیح یا غلط ہونے یا ہم تک غلط طریقے سے اس کے پہنچنے کے بارے میں رپورٹ ہونے کے بارے میں کوئی تاثر تھا جو کہ میرے اور اس کے درمیان آخری وجہ نزاع بن گیا تھا۔ میں اسٹیبلشمنٹ اور عوامی تاریخ کے درمیان فرق کو بہت اہمیت دیتا تھا جب کہ وہ تاریخ کو محض تاریخ ہی سمجھنے پر اصرار کرتا تھا۔ وہ تاریخی جبر اور جھوٹ کو نہیں مانتا تھا اس کے نزدیک یہ ایک تسلسل تھا جو چیزوں اور واقعات کو خود ہی ایک پراسس کے تحت اپنا صحیح رخ متعین کرنے میں مدد دیتا رہتا تھا۔ مجھے اختلاف تھا کہ وہ اس سارے سیناریو میں سے انسان کو خارج کر کے بیٹھ جاتا تھا جب کہ یہ سارا کیا دھرا محض حالات کے رخ اور لہر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ بعض بندوں کی ضد، ہٹ دھرمی اور جھوٹی انا کی وجہ سے سرزد ہوا تھا۔ میں اسے مثال دیتا۔

ٹرائے کی جنگ کیا تھی، محض ایک عورت کا حصول، دونوں بڑی جنگیں کیا تھیں، محض چند لوگوں کا جنگی جنون تھا اور کچھ نہیں ۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم برسانے کی لاجک آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی ہے؟ مجھے یاد ہے، وہ بڑبڑاتا ہوا مال روڈ کے پچھواڑے کی گلی والے آدھی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا اور اب اچانک پچاس سال بعد کی روشنی میں وارد ہو گیا تھا اور وہ بھی اپنے مرنے کی وارننگ دیتے ہوئے ۔ جان جو اس نے عنقریب اپنے ہاتھوں سے لینی تھی، خودکشی ۔ تھو، تیری فلاسفی کی ایسی کی تیسی ۔ تم نے تو بڑے لوگوں کے لفظوں اور حوالوں کو بھی اپنا گواہ نہیں بنایا بل کہ انہیں جھٹلایا ۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میری گھر والی نے اصرار کر کے مجھے اس کی طرف دھکیل دیا کہ شاید اس طرح ہونی ٹل سکے ۔ اس نے اپنی رہائش گاہ تبدیل کر لی تھی اور اب وہ ایک نواحی ویسی نوعیت والی جگہ کو اپنے لیے چن چکا تھا ۔ گہری شام کو میں اس تک پہنچا ۔ گزرے سالوں نے اس کی ہیئت میں تقریباً وہی تبدیلیاں جنم دے ڈالی تھیں جو کہ میرے جسم پر بھی ویسے ہی نمودار ہو چکی تھیں ۔ سو اس لحاظ سے تو ہم ایک جیسے ہی نکلے ۔

رات کا کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا، میں نے پہلی چیز جو محسوس کی وہ یہاں کی خاموشی ہی تھی ۔ کوئی اور بندہ بشر یہاں نظر نہیں آ رہا تھا ۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا جو آبادی سے ذرا باہر واقع تھا ۔ سب سے اوپر والی منزل پر ایک ممٹی تھی، ہم دونوں وہیں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے ۔ وہ چپ تھا ۔ بات نہیں کر رہا تھا ۔ پھر وہ لیٹ گیا، تم دیکھ رہے ہو ۔ میں مرنے سے پہلے ہی اس وقت ایک قبر میں بیٹھا ہوں ۔ یہ گھر، یہ ویرانہ، یہ تنہائی ۔ وہ سب لوگ مجھے چھوڑ گئے ہیں ۔ کوئی سٹیٹس میں سدھار گیا ۔ کوئی مڈل ایسٹ کے خلیفہ برج کی طرف رخ کر گیا، بیوی ویسے ہی نہیں رہی ۔ اولاد نے ساتھ نہیں دیا، مجھے اکیلا چھوڑ دیا ۔ اب بتاؤ میں آگے کیسے جیوں ۔ منیر، میرا خیال تھا کہ تم زندگی جی رہے ہو گے لیکن تم تو حال کے کسی فضول سے سینما حال میں بیٹھے کوئی نہایت فارمولا اور گھٹیا سی اردو فلم کا کردار بنے رہے ہو ۔ بھئی اب بھاٹی اور لوہاری سے باہر نکلو کیوں کہ زندگی کوئی ماورائی چیز نہیں بل کہ ایک ٹھوس حقیقت ہے ۔ تمھیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہیے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نوکریوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور اب ستر کے پیٹے میں ہیں، یقیناً ابھی زندگی نے تو ہمیں ریٹائر نہیں کیا ۔ کیا ہوا اگر ہمارے بچے ہمارے پاس نہیں ۔ میرے اور تمھارے درمیان جو فرق واقع ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اتفاق سے تمھاری اہلیہ نہیں رہی جب کہ میری ہے لیکن بچے تو سب میرے بھی اپنی زندگیوں کے تقاضے پورے کرنے میں مصروف ہیں ۔ منیر، بچوں کی ضرورتیں اب ہم سے مختلف ہو چکی ہیں، خود کو ان کے سٹیٹ آف مائنڈ اور فریم ورک میں رکھ کر ضائع مت کرو ۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ۔ دیکھو جو درخت لگاتا ہے اسے عام طور پر اس کا پھل چکھنے کا موقع نہیں ملتا، پھل کوئی اور ہی کھاتا ہے تو کیا محض اس لیے ہم درخت لگانا ہی چھوڑ دیں؟

تم، تم اب تک ویسے کے ویسے ہی ہو، وہی فلسفے بھگارنے والے ۔ قیامت والے دن بھی اپنے لان میں چیری کا پودا لگانے سے باز نہ آنے والے ۔ حالاں کہ تم ابھی تک ایک آئیڈلسٹ ہو جب کہ میں ....

وہ چائے چھوڑ کر نیچے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک اس کی ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے کی پیالی کے قریب بیٹھا رہا۔ صبح ناشتے کی میز پر ہمارے درمیان بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ وہ ہر قیمت پر خود کو مار لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا، ٹھیک ہے اگر مرنا چاہتے ہو تو مرو، لیکن یہ کام تم میرے یہاں سے جانے کے بعد کرو تو اچھا ہوگا، وہ چپ رہا۔ میں چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے دل میں ٹھانی تھی کہ جانے سے کچھ دیر پہلے میں ایک بار، آخری بار اسے قائل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ میں ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک پانچ چھ سال کی بچی تھی۔ وہ خوش ہو کر بولی چاچا جی، کل میری بچی نے پہلی بار حرف الف پر انگلی رکھی ہے۔

بہت اچھی بات ہے بہت ہی اچھی۔ میں نے کہا۔ منیر کچھ نہ بولا وہ عورت کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا اب یہی میرے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے اور میرا کھانا پکاتی ہے۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا، وہ مجھے کسی قدر اداس سی دکھائی دی۔ اپنی بچی سے متعلق بات کرنے والی خوشی اب اس کے چہرے سے غائب تھی۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ چاچا جی آپ جانتے ہیں کہ گڈو کا ابا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ادھر وہ ابراہیم ہے وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ دنیا بڑی خطرناک جگہ ہے صاحب۔ مجھے لوگوں نے بہت ڈرا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس طرح کسی بیوہ عورت کا کسی مرد کے مضبوط سہارے کے بغیر رہنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ پر وہ ابراہیم جسے میں بھی پسند کرتی ہوں، میری بچی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے اسے یتیم خانے میں جمع کرا دو، میں پھنس کر رہ گئی ہوں۔ آگے پہاڑ ہے تو پیچھے کھائی ہے۔ آپ مجھے بتایئے میں کیا کروں۔

تم نے وہی کرنا ہے جو ابراہیم کہتا ہے اس کی بات مان کر آگے بڑھ جاؤ۔ میں بولا

پر جی، میری بچی ……وہ یتیم خانہ……

نہیں ……ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ بچی کو ہم اپنے پاس رکھیں گے۔ یہ ادھر منیر صاحب کے پاس رہے گی۔ پڑھے گی لکھے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

وہ میں، کیوں! منیر گڑبڑایا

منیر، اس کام کو تو تم نے ہی کرنا ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دبایا۔

منیر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے بچی کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔

☆☆☆☆

محمد الیاس

آخری دعا

تحریر میں کوئی ابہام نہ پایا گیا۔ خوش خط، واضح اور سلیس۔ گویا طویل عرصے سے شعور کے کسی پرت میں ترتیب پاتی رہی اور سطحِ قرطاس پر یوں منتقل ہوئی جیسے محض پرنٹ اتارا گیا ہو۔ لکھا تھا:

”میرے اِس اقدام کا کسی کو دوش نہ دیا جائے۔ میری شریکِ حیات، اولاد، میرے عزیز رشتہ دار، اڑوس پڑوس اور دوست احباب، کوئی بھی خطاوار نہیں۔ نہ کسی سے مجھے گلہ ہے۔ بیوی نے میری اجازت سے ملک چھوڑا تاکہ بیٹے اور بیٹی کے پاس رہے۔ میں اپنی مرضی سے تنہا ہوا۔ موجودہ آئی جی میری لکھائی کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اُس کو صرف اطلاع دی جائے۔ وہ خود ہی پڑھ لے گا۔ چوتھی سے دسویں جماعت تک ہمارے ڈیسک پہلو بہ پہلو جڑے ہوا کرتے تھے۔ لوگ اس کو سخت گیر پولیس افسر کے طور پر جانتے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی فطرت میں کتنا معصوم اور نرم دل ہے۔ دسویں جماعت میں اُس نے جو ”My Best Friend“ مضمون لکھا، اُس میں مجھے اپنا بہترین دوست قرار دیا اور مجھے بڑے شوق سے پڑھایا۔ میں نے اپنے مضمون میں کوئی خیالی پیکر تراش لیا اور جو نام لکھا، وہ ہم عصر لڑکوں میں سے کسی کا نہ تھا۔ وہ میری انگریزی کی کاپی مانگتا رہا تاکہ مضمون پڑھ سکے۔ میں ٹال گیا۔ تفریح کے پیریڈ میں اُس نے تنہا بیٹھ کر میری تحریر پڑھ لی اور اتنا رویا کہ کاپی کے صفحات پر ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں سے الفاظ سیاہی کے دھبوں میں بدل گئے۔ میرے اچانک آجانے سے اُس نے کاپی فوراً میرے ڈیسک کے خانے میں رکھی اور زاروقطار روتے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

میں نے یہ اِس نیت سے لکھا ہے کہ میرا ہم مکتب اب ذمہ دار افسر ہے۔ اُس کو سب یاد آجائے اور میری تحریر کی تصدیق کر دے تاکہ کوئی الجھاؤ نہ پیدا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوال اٹھیں گے۔ مثلاً یہ کہ کیسے بظاہر ایک خوش اور مطمئن شخص اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ یقیناً انہونی ہوئی ہوگی۔ دل پر بڑا صدمہ وارد ہوا ہوگا۔ بے وفائی کی گہری چوٹ لگی ہوگی۔ ممکن ہے، کوئی محرومی نارسائی جان کا

روگ بنی ہو۔ بعید نہیں کہ رُوح کے بہت قریب کسی ہم نفس نے مایوس کیا ہو۔ کوئی ملال، کوئی جگر خراش پچھتاوا بھی جان کا روگ بن سکتا ہے۔ امید کا فقدان بھی ان عوامل میں شامل ہے، جس کے نتیجے میں، مزید زندہ رہنے میں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

ایسا کچھ نہیں۔ دراصل میں خود اپنی توقعات پر ہی پورا نہیں اُترا اور اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہوں۔ ازراہِ کرم میرے بارے میں قیاس کے گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔ میں نے اس بنا پر مرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ آج نہیں تو کل مرنا ہے۔ میں زندگی بھر کوئی بھی اہم کام اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکا۔ اللہ کی ذات پر میرا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ لیکن ماسوائے معمولی خواہشوں کے کوئی بھی بڑی آرزو پوری نہ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ اللہ کے حضور دل کی گہرائیوں سے دعائیں مانگیں۔ جس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنا تھی، پوری نہ ہو سکی۔ نہ صرف یہ کہ اپنی مرضی کا پیشہ اختیار نہ کر سکا، ستم بالائے ستم، جو ذریعۂ معاش بنا، وہ یکسر میرے مزاج کے خلاف تھا۔ مجھے حسرت ہی رہی کہ فراغت کا کچھ وقت اپنے گھر میں والدین کے ساتھ گزار سکوں لیکن میرے مقدر میں لکھی مصروفیات اور مسافتیں اُن کی زندگی میں ختم نہ ہوئیں۔ جن پُرسکون مناظر کی آغوش میں آشیانہ بنانا چاہا، اس کے برعکس، پُرشور ہنگامہ خیز شہر میں کنکریٹ کا قید خانہ میرا مسکن بنا رہا۔ مجھے اچھی شریکِ حیات ملی لیکن میں اُس کو وہ آسائشیں مہیا نہ کر سکا، جو خواہش تھی۔ اولاد کو عملی زندگی کی کامیابیوں کے اُس درجے پر نہ دیکھ، جو سوچ رکھا تھا۔

گزری عمر کی چند دہائیوں کو محیط عرصے میں فرصت کے لمحات میسّر ہی نہ آئے۔ گہری لمبی پرسکون نیند کو ترس گیا تھا۔ کام ہی کام اور جاں گسل ذہنی مشقت سے بدن ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ اب فرصت ہی فرصت ہے لیکن نیند نہیں آتی۔ کرنے کو کام نہیں۔ بےکار پڑے رہنے سے بدن شل ہوا رہتا ہے۔

سوچتا ہوں، اپنی اصل عمر میں نے گزار لی۔ فضول جیئے جانے سے لاحاصل مشقت اٹھا رہا ہوں۔ جسم سے کچھ ایسے سگنل ملنے لگے ہیں کہ مفلوج ہونے کو ہے۔ کچھ عرصے سے اللہ کے حضور آسان موت مرنے کی بڑی دعائیں مانگی ہیں۔ میرا وہم رفتہ رفتہ یقین میں بدلنے لگا ہے کہ ماضی کی طرح میری یہ اہم دعا بھی قبول نہیں ہوگی اور بالآخر مجھے سسک سسک کر بے چارگی کی موت مرنا ہوگا۔ آج تک لمحہ بہ لمحہ مقدر کا لکھا بھگت لیا۔ لیکن بے بسی کے عالم میں لمحہ لمحہ موت کے انتظار کی اذیت کو محسوس کرتے ہوئے میری ہمتیں پسپا ہونے لگی ہیں۔ تنہائی میں مجھے اپنی رُوح کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ یہ رُوح کل سے جا ملنے کو بےقرار ہے۔ میں اپنے

ارادے سے جسم کی فصیل توڑ کر اسے اَزلی سفر پر روانہ کرنے لگا ہوں۔

کفن کا سامان پڑا ہے اور کچھ رقم بھی۔ خیرالنساء نے میری بہت خدمت کی۔ بانوے ہزار تین سو ستر روپے کا چیک اُس کے نام لکھ کے لفافے میں ڈال رکھا ہے۔ میرے اہل و عیال کو طویل سفر کی مشقت میں نہ ڈالا جائے۔ وہی چہرہ ہے جو وہ مدتوں دیکھتے رہے۔ خدا حافظ......”

O

اگلے بدھ معمول کے مطابق خیرالنساء تقریباً دس بجے آئی اور اپنی چابی سے گیٹ کھول کے بند کیا۔ اخبار اٹھا کر گھر کے داخلی دروازے کی جانب قدم اٹھانے لگی۔ بائیں ہاتھ میں لیے اخبار پر چھپی تصویر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ بآوازِ بلند “السلام علیکم صاحب جی” کے الفاظ ادا کیے۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر حواس باختہ ہوئی باہر کو دوڑتی چلی گئی۔ سڑک پر چیختے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر مدد کو پکارنے لگی۔ اڑوس پڑوس سے لوگ نکلتے چلے آئے۔

پروفیسر صادق، ایڈووکیٹ لیاقت، ڈاکٹر شفیق، ان کی بیوی ڈاکٹر فرزانہ اور کرنل رفیق اندر چلے گئے۔ باقی لوگوں کو باہر پورچ میں ہی رکنے کا مشورہ دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمیونٹی کی سیکیورٹی وین اور ایمبولینس آ گئی۔

ڈاکٹر میاں بیوی نے موت کی تصدیق کر دی۔ پانچوں معزز ہمسائے خط کی عبارت پڑھ کر دل گرفتہ ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بوڑھے کرنل نے مُتوفّی کے داہنے ہاتھ کے قریب پڑے پسٹل کو نالی کی طرف سے ٹشو میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ نالی کو سونگھا۔ پڑوسیوں پر ایک نگاہ ڈال کر بولا: “اس سے کوئی فائر نہیں کیا گیا۔” ڈاکٹر شفیق نے کہا: “جسم پر گولی کا نشان تو درکنار کہیں خراش تک نہیں......” سارے ششدر ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے گئے۔ اتنے میں کرنل نے پسٹل کی میگزین دیکھ کر بتایا کہ گولیاں جوں کی توں بھری رہ گئیں......” ڈاکٹر فرزانہ آبدیدہ ہو گئی اور بولی: “آخری دعا در اصل قبول ہو چکی تھی......”

☆☆☆☆

خالد فتح محمد

مزار

کھڑکی کے سامنے بیٹھی عورت میری ماں ہے!

وہ صبح سات بجے کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اُس کی نظر گلی میں دور ایک ہی نقطے پر مرتکز رہتی ہے۔ وہ زندگی کے معاملات میں اُلجھے رہنے والی ایک زندہ دل عورت رہی ہے، اُس کا اِس طرح اچانک سب سے کٹ کر ایک بت کی طرح بیٹھے رہنا جہاں پریشانی کا باعث بنا وہاں اردگرد چہ مگوئیوں کا ایک باب بھی کھل گیا۔ ماں میرا واحد سہارا تھی یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں ہی اُس کا اکیلا وارث تھا۔ میرے والد کے فوت ہو جانے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھے۔ مشکلات اور جدوجہد کی طویل سرنگ میں سے گزرنے کے بعد ہم نے زندگی میں اپنی تعمیر کی ہوئی سہولتوں سے لطف کشید کرنا شروع کیا ہی تھا کہ ماں نے کھڑکی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ وہ وہاں شام پانچ بجے تک بیٹھتی اور پھر میں اُس کا اشارہ پا کر اُسے خواب گاہ تک پہنچا دیتا جہاں وہ اپنے پلنگ پر نیم دراز ہو جاتی۔ مجھے اُس کا بے تاثر چہرہ دیکھ کے پریشانی تو ہوتی لیکن میں اُس سے سوال نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے مجھے کبھی سوال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور سوال نا کرنا میری عادت بن گئی تھی۔ سوال نا کرنے کی اِس عادت کی وجہ سے میں ہمیشہ نقصان اُٹھاتا آیا ہوں۔ جب میں ایک طفلانہ تجسس کے دور میں سے گزر رہا تھا اور مجھے ہر چیز اجنبی اور ناشناسا لگتی تھی تو میں ماں سے سوال کیا کرتا تھا۔ پہلے وہ میرے سوالوں پر چہرے پر ایسا تاثر لے آتی تھی کہ میں خوف زدہ ہو جاتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اپنے جذبات چھپانا سیکھوں اور اُن جذبات کی گہرائی کسی پر ظاہر نا ہونے دوں۔

والد کھلے دل والے تھے اور اُن کا نظریہ ہر کسی سے اپنے خیالات کی ساجھے داری کرنا تھا۔ ماں اِس سوچ کے اتنی مخالف تھی کہ اُن دونوں نے اپنی زندگیاں ایک دوسرے کو سمجھے بغیر ہی گزار دیں۔ اُس وقت اُن کے اختلافات میں مجھے اپنے لیے ایک دل چسپی نظر آتی تھی اور میں دونوں کو پتا چلے بغیر اُن کے اختلافات کو مزید گہرا کرتا رہتا۔ میں واحد اولاد ہونے کی وجہ سے گھر کا ایک اہم فرد تھا اور دونوں میری رائے کو اہمیت دیتے۔ یہ وہ دور تھا جب میری کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ مجھے اپنی تعلیم میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی تھی جو والد کو قطعاً پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے: ”میں اتنا چھوڑ کے جا رہا ہوں کہ تمھارے بچے بھی آرام کی زندگی گزار سکیں گے۔“

ماں کو میرا تعلیم کو ترجیح دینا پسند تھا۔ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتی اور کہتی کہ مَیں زندگی میں اپنے لیے منصوبے بناؤں اور پھر اُن کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دوں۔ ٹونٹی سے لگاتار قطرہ قطرہ پانی گرنے سے کھرے کی سطح میں ایک ناہمواری آجاتی ہے اِسی طرح ماں کے مجھے مسلسل اُکسانے سے میرے اندر ترقی کا جذبہ میری سوچ سے بھی بڑا ہوتا گیا اور میں والد کی لاپرواہی کو کسی حد تک ماں کی آنکھ سے دیکھنے لگا۔

اِس کے باوجود والد میرے آئیڈیل تھے!

میں اُن کے ساتھ چھٹی کا دن گزارتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اُنھیں میری طرح اتوار کا انتظار ہوتا۔ ہم اتوار کسی نہر کے ریسٹ ہاؤس میں گزارتے جس کی اُنھوں نے بکنگ کروائی ہوتی یا کسی تاریخی اہمیت کے مقام کو دیکھنے جاتے یا کہیں بیٹھ جاتے جہاں وہ اپنی باتیں سنا سکیں۔ اُنھیں باتیں کرنے کا بہت شوق تھا اور میں ایک اچھا سننے والا۔ ماں کو یہ سب پسند نہیں تھا، وہ اِسے وقت کا ضیاع سمجھتی۔ وہ خود تو کافی باتیں کرتی تھی لیکن ایسی باتیں جو روزمرہ کے معاملات ہوں؛ اُسے تاریخ یا گفتگو میں اُٹھنے والے متعدد علمی موضوعات سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ والد کافی گھومے ہوئے تھے اور کبھی کبھی اپنے آپ کو vagabond کہتے۔ وہ اکثر اپنے سفروں کے قصے سناتے جن میں سے کچھ سچے لگتے اور چند من گھڑت لیکن ہوتے وہ سب بہت دل چسپ۔

یہ وہ دن تھے جب میں نے زندگی کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ والد اور ماں ایک دوسرے سے بالکل دور ہو چکے تھے اور میں دونوں کے قریب ہوتے ہوئے اُن سے کنارہ کر چکا تھا۔ میں محسوس کرتا کہ اگر میں نا ہوتا تو والد شاید ماں سے علیحدگی اختیار کر چکے ہوتے کیوں کہ اُس کا اُن کے ساتھ رویہ ہی ایسا تھا؛ وہ اُنھیں کبھی سنجیدگی سے نہیں لیتی تھی اور ہمیشہ کسی نا کسی الزام کی زد پر رکھتی۔ بعض اوقات والد مایوسی کا شکار نظر آتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اُنھیں مایوس دیکھ کر ماں کسی قدر خوش ہوتی، اُس کی مخموری آنکھوں میں چمک آجاتی اور ہونٹوں کے کنارے شرارت بھری خوشی سے کپکپانے لگتے۔ ماں کے ساتھ میرے تعلق میں ایک روحانی پہلو تھا؛ مجھے اُس میں ایک ایسا نور محسوس ہوتا جو مجھے روشنی میں نہلا دیتا۔ میں اُسے دیکھتے ہی چلے جانا چاہتا تھا۔ شاید وہ بھی اپنے جادو کو سمجھتی تھی اور مجھے اُس کیفیت میں دیکھ کے دھیرے دھیرے مطمئن سا مسکراتی رہتی۔ مجھے اُس کے سحر میں گم ہونے کا ایک مزہ آتا تھا لیکن اُس کی برتری مسکراہٹ سے چڑ آجاتی۔ تب میں والد کی طرف مائل ہو جاتا!

ایک دن والد مجھے ایک مزار پر لے گئے۔ وہ شاید اتنے مایوس ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے مزاروں میں پناہ لینے کی کوشش کی۔

’’میں یہ دنیا بھی دیکھنا چاہتا تھا۔‘‘ اُنھوں نے مجھے راستے میں بتایا۔ یہ ایک خاصا طویل سفر تھا۔ ہم سیالکوٹ کے ضلع کے کسی دور افتادہ گاؤں میں گئے تھے جہاں ایک بوڑھے برگد کے سائے میں چھوٹا سا مزار

تھا یا مجھے چھوٹا لگا کیوں کہ اِس سے پہلے میں نے مزار دیکھے نہیں تھے۔ یہ گنبد نما ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس کے اردگرد تھڑا تھا جس پر سفید رنگ کی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں جن کو برگد میں سے چھن کر آتی ہوئی بہاری کرنیں نہلا رہی تھیں۔ مزار میں داخل ہونے کے لیے تین سیڑھیاں چڑھنا تھیں جن کے ساتھ چند عورتیں جھو کے بیٹھی سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ مجھے یہ منظر دل چسپ لگنے کے ساتھ ساتھ ڈراونا بھی لگا؛ مجھے اُن کے چہروں پر جمی شدت سے گھبراہٹ ہوئی۔ ہم جب مزار میں داخل ہوئے تو ایک سیلا سا اندھیرا میری نظروں سے ٹکرایا؛ مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی خواب میں ہوں۔ مزار کے اندر انسانی جسموں کی بو، گلاب اور اگربتیوں کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ مل کے طبیعت کو بوجھل سا کر رہی تھی؛ مجھے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں والد کی طرف دیکھا، وہ اطمینان سے کھڑے فاتح پڑھ رہے تھے، میں نے بھی ہاتھ اُٹھا لیے۔ ہمارے آنے سے وہاں ماحول کچھ بھاری سا ہو گیا: سب لوگ حیرت، دل چسپی اور مرعوبیت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں موجود سب لوگوں کے چہروں پر اطاعت اور فرماں برداری کے تاثرات دیکھ کے میں کچھ خوف زدہ اور متاثر بھی ہوا۔ والد نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکال کر قبر پر بچھی سبز چادر پر رکھے۔ وہاں پہلے سکے اور چھوٹے نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ سب لوگوں نے والد کے ہاتھ کا نظروں سے تعاقب کیا اور نوٹ دیکھ کر ہمارے باہر نکلنے کے لیے تعظیم سے راستہ دیا۔

’’یہ ایک الگ دنیا ہے۔‘‘ والد نے راستے میں بات شروع کی۔ ’’اِس دنیا میں داخل ہونا جتنا آسان ہے نکلنا اُتنا ہی مشکل۔ میں نے زندگی میں کئی تجربے کیے ہیں اور یہ اُن میں سے ایک ہے۔ میں مزار پر جا کر بزرگ سے بھیک نہیں مانگتا، بس ماحول کی پراسراریت مجھے ایک گہرا سکون دیتی ہے۔ پراسراریت سمجھتے ہونا؟‘‘ اُنھوں نے میری طرف دیکھ کر میرے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔

’’جی ہاں!‘‘ میں اُن کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اصطلاحات سے کافی حد تک واقف ہو چکا تھا۔

’’ہر مزار کا ماحول دوسرے جیسا ہی نظر آتا ہے لیکن ایسے ہوتا نہیں۔ ہر مزار کے ماحول میں بزرگ کی شخصیت بھی شامل ہوتی ہے جو یقیناً دوسروں سے مختلف ہی ہوتی ہے اِس لیے ماحول بھی مختلف ہوگا لیکن عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔ وہ ہر مزار کو اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے استعمال کرتا ہے حالاں کہ مزار تو ایک روحانی تسکین کے لیے ہوتے ہیں۔ میں جب کسی مزار پر آتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ایسے گھر میں ہوں جہاں سکون کا غلبہ ہے۔‘‘ اُس وقت ہم قلعہ سوبھا سنگھ، جس کا اب نام بدل دیا گیا ہے، میں سے گزر رہے تھے۔ ریلوے لائن کے پار شیشم کے گھنے جنگل تھے اور خشک ڈیکھ ندی میں ریت چمک رہی تھی۔ میں نے اُس مصروف قصبے کو ایک

نظر دیکھا۔ والد کی نظر سامنے سڑک پر تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ سکون کے متلاشی ہیں۔ گھر میں سکون کے نا ہونے کا ذمے دار کون ہے؟ بنیادی طور پر گھر کو پرسکون رکھنے کی ذمے داری تو ماں کی بنتی ہے لیکن اُس کا رویہ اتنا غیر لچک دار ہے کہ وہ والد کی برابری کو قبول نہیں کرنا چاہتی اور والد اتنے کمزور کہ اپنی برتری ثابت نہیں کر سکتے۔ والد کا مزاروں پر جانا جہاں مجھے exciting لگا اُن پر اُتنا ہی ترس بھی آیا۔ اُنھیں سکون میسر نہیں تھا جسے وہ مزاروں کی پراسرار خاموشی میں ڈھونڈتے تھے۔ میں اُن کے ساتھ کئی مزاروں پر گیا، ہر جگہ اُن کا ایک ہی معمول تھا۔ وہ فاتحہ پڑھ کے خاموش کھڑے رہتے، قبر پر پیسے رکھتے اور اُلٹے قدم رکھتے ہوئے باہر آجاتے۔

میں وہاں سکون محسوس کرنے کی کوشش کرتا لیکن مجھے اسرار میں ڈوبی ہوئی خاموشی کا احساس ہوتا!

ایک دن ماں کو پتا چل گیا کہ میں والد کے ساتھ مزاروں پر جاتا ہوں۔ والد اور میں نے یہ طے تو نہیں کیا تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان میں مزاروں پر جانا ایک راز تھا جو میری لاپرواہی سے فاش ہو گیا۔ والد ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں تھے اور میں ماں کے پاس بیٹھا اُس کی روزانہ کی کہی ہوئی باتیں اُس شام بھی سن رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میں اُن باتوں سے اُکتایا ہوا تو تھا لیکن عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ماں اتنی سخت مزاج تھی کہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتی۔ میں وہ اُکتا دینے والی باتیں سنتے ہوئے اتنا بیزار ہو گیا کہ میں نے اُسے بے دھڑک بتا دیا کہ اُس کی ایسی باتوں سے بچنے کے لیے والد مزاروں پر جانا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مجھے لگا کہ وہ سکتے میں آ گئی ہے۔ اُس کا رنگ زرد اور ہونٹ نیلے ہو گئے، میں خوف زدہ ہو گیا کہ اُس کا دل بند ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں والد کو بلانے کا خیال آیا لیکن میں نے سوچا کہ شاید ماں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اُنھیں دیکھنا چاہے۔ پھر اُس کے چہرے کا رنگ معمول پر آنے کے بعد وہاں ایسا تاثر آیا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنے غصے میں تھی کہ مجھے لگا کہ اُس کے چہرے کی بوٹیاں بکھر جائیں گی۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی؛ مجھے لگا کہ وہ میرے اوپر جسمانی حملہ کر دے گی۔

”تم بھی ساتھ جاتے ہو؟“ اُس نے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں سے بمشکل یہ الفاظ نکالے۔ اِن لفظوں میں کھی ہوئی نفرت جھلسا دینے والی لو کے تھپیڑے کی طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے گئی۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا؛ شاید خود کو مجتمع کر رہا تھا۔ مجھے ماں کی شعلہ برساتی آنکھیں اپنے پر محسوس ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ جھوٹ بولنے کی کوشش کے باوجود سچ بول گیا۔

”ہاں!“ مجھے لگا کہ میں نے دانستہ والد کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ مجھے اُن کی معصومیت کا تحفظ کرنا چاہیے تھا۔

''وہ بزدل ہے جو دیکھے کے بجائے ان دیکھے کے تعاقب میں ہے۔ '' یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ماں نے کسی طرح والد کا ذکر کیا ہو۔ والد نے اپنی کبھی ختم نا ہونے والی باتوں میں ماں کا کسی طرح ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید دونوں ایک غیر تحریر شدہ معاہدے کے تحت ایک دوسرے کا ذکر کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ مجھے ماں کے فقرے سے بھی حیرت ہوئی۔ وہ تو ہر وقت سبزی اور گوشت پکانے کی ترکیبوں کے بارے میں باتیں کرنا پسند کرتی تھی؛ دیکھا اور ان دیکھے کے فرق نکالنا تو والد جیسے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگوں کا کام تھا۔

میں حیرت زدہ اُسے دیکھتا رہا!

اُس کی آنکھوں میں مجھے پہلے ویرانی اور پھر وحشت نظر آئی۔ اُس کی کیفیت اُس آدمی کی سی تھی جس کا اپنے باپ کے قاتل سے اچانک سامنا ہو گیا ہو۔ مجھے لگا کہ اُن چند لمحوں میں وہ ایک شدید کشمکش میں سے گزر رہی ہے۔ مجھے وہ ایک چپک جانے والے مومی جالے میں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی؛ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ''اُسے اگر فرار کی ضرورت تھی تو کوئی اور راستہ ڈھونڈتا؛ جوگی بن جاتا۔ '' مجھے اِس فقرے نے بھی اُلجھن میں ڈال دیا۔ اگر وہ ایک شدید کشمکش میں سے گزر رہی تھی تو میں بھی ایک طرح کی کشمکش کی کیفیت میں تھا۔ وہ مجھے حیران کر گئی تھی؛ مجھے ماں کے بجائے وہاں کوئی اور ہستی بیٹھی نظر آئی جس سے میری شناسائی نہیں تھی۔ میں اُس سے اِس اچانک تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتا تھا لیکن اُسے سوال کرنا پسند نہیں تھا۔ میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات معمول پر آنا شروع ہو گئے اور وہ مجھے اپنی ماں ہی لگنے لگی۔ ''تم میری باتوں سے حیران ہوئے ہو؟ '' اُس کی آواز میں اب ایک ٹھہراؤ تھا جو مجھے گہرا لگا اور مصنوعی بھی۔ مجھے حیرانی اِس بات سے بھی ہوئی کہ اُس نے ایک سوال پوچھا تھا۔ میں اثبات میں سر ہلانا چاہتا تھا لیکن اب اُس کی ہیبت پھر سے مجھے اپنی گرفت میں لینے لگی تھی؛ اُس کی جگہ اگر والد ہوتے تو میں یقیناً جواب دے دیتا۔ ماں ایک ناپیش گفتنی ہستی تھی اِس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ ''آؤ میرے ساتھ!'' اور وہ آہستہ سے اُٹھی، مجھے اُس کے کھڑے ہونے کا عمل کافی باطمینان لگا؛ جیسے وہ میری بے یقینی کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا، والد کے بند کمرے پر نظر ڈالی اور پھر اپنی آنکھیں میرے اوپر روک دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت سے بھری مسکراہٹ تھی جیسے ماں کو چھیڑ دے کر بھاگ جانے والے بچے کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ میں اُس کی باتوں سے حیران ہوا تھا، وہ ایسی فلسفیانہ باتیں کہہ گئی تھی جو اُس کے ساتھ وابستہ نہیں کی جا سکتی تھیں۔

ماں کے کمرے تک کے چند قدم میں اُس کے پیچھے چلا۔ والد اور ماں ایک عرصے سے الگ الگ کمروں میں رہ رہے تھے اور لاؤنج جو مشترک بیٹھنے کی جگہ تھی اُس پر ماں قابض تھی اور والد کو میں نے کئی سالوں سے

وہاں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ماں ہمیشہ اپنی مخصوص کرسی پر سارا وقت بیٹھے گھر کو اپنی نظر میں رکھتی۔ ماں کمرے تک ایک اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے گئی۔ عموماً وہ ایک ٹانگ دبا کر چلا کرتی تھی لیکن اُس سہ پہر وہ مجھے چند برس پہلے والی ماں لگی۔ اُس کے کمرے کے ساتھ ایک طرف جڑا ہوا غسل خانہ تھا اور دوسری طرف چھوٹا سا سٹور روم۔ وہ سیدھا سٹور روم میں گئی اور روشنی جلا کے اُس نے ٹین کی چادر کے تین بڑے ٹرنکوں کے منہ کھول دیے۔ وہ ٹرنک کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں حیرت سے ترتیب سے لگی ہوئی اُن کتابوں کو دیکھتا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتی تھی؛ ایسے لگا کہ ہم دونوں کسی سازش میں شریک ہیں۔

''میں نے بھی چار حرفوں کے ساتھ شناسائی پیدا کی ہوئی ہے۔'' اُس نے باری باری ڈھکنے بند کرتے ہوئے کہا: ''مطالعہ کسی کی جاگیر نہیں۔ میں ایک کم مطالعہ عورت نہیں ہوں۔ تمھارا باپ وہاں بیٹھ کر۔'' اُس نے لاؤنج کی طرف اشارہ کیا: ''کتابوں اور علم کی باتیں کیا کرتا تھا اور میں جاہلوں کی طرح منہ کھولے اُس کی باتیں سنا کرتی تھی۔ وہ باتیں جہاں میرے لیے ایک اذیت تھیں اور مجھے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی تھیں وہاں میرے اندر ایک نئی عورت جنم لیتی تھی جو نا کسی کی بیوی تھی اور نا ہی ماں، وہ بس ایک عورت تھی جس نے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔'' اُس نے ایک لمبی سانس لی اور میری طرف دیکھا۔ میں اُس سے نظر ملانا چاہتا تھا اور مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں پھر بھی خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا؛ یہ میرے لیے ایک revelation تھا۔ وہ لاؤنج کی طرف چل پڑی۔ میرا کمرہ اوپر والی منزل میں تھا لیکن اُس وقت میری وہاں جانے کی ہمت نہیں تھی؛ ماں نے مجھے زندہ گاڑ دیا تھا۔

میں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا اور وہ دن یاد کرنے لگا جب ہم تینوں یہاں بیٹھے گھنٹوں باہمی دلچسپی کی باتیں کیا کرتے تھے، پھر کہیں سے اُکتاہٹ اور ناپسندیدگی چوتھے فرد کی طرح بیچ میں آن موجود ہوئیں اور وہ دونوں دور ہوتے چلے گئے۔ اب میں نے ماں کو ایک اور نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اُس کی باتوں میں معنی تلاش کرنے لگا اور اُس نے بھی سبزی گوشت پکانے کی ترکیبوں پر بات کرنا چھوڑ دیا۔ والد، ماں اور میرے درمیان میں پیدا ہونے والے نئے رشتے سے واقف نہیں تھے۔ وہ اُسی طرح چھٹی والے دن مجھے ساتھ لے جاتے۔ اب اُنھوں نے مزاروں پر جانے کے ساتھ ساتھ کرکٹ کے میچ دیکھنے لگے تھے۔ اُن کے حبیب بینک میں تین اکاؤنٹ تھے اور اُنھوں نے بینک کی کرکٹ ٹیم کا ہر میچ دیکھنا شروع کر دیا۔ چھٹی والے دن وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ اُن کے پاس ہر کھلاڑی کا مکمل ڈاٹا ہوتا تھا اور وہ موقع ملنے پر اُنھیں مشورہ اور ہدایات بھی دیتے۔

ہم اقبال سٹیڈیم فیصل آباد سے آ رہے تھے۔ ''دیکھو بیٹا!'' اُنھوں نے کبھی مجھے بیٹا کہہ کر نہیں بلایا تھا، وہ

مذاق میں کہا کرتے تھے کہ وہ مجھ سے تھوڑا ہی بڑے ہیں۔ اُنھوں نے ایک لمبی سانس لی جس میں ایک چھوٹی سی آہ تھی۔ میں نے تھوڑی دل چسپی اور کسی حد تک حیرانی کے ساتھ اُن کی طرف دیکھا۔ میں نے اُن کا چہرہ کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔ والد مجھے وہ نہیں لگے جو میں روز دیکھتا آیا تھا۔ اُن کے چہرے پر عمر کے پنجوں کی خراشیں جا بجا لگی ہوئی تھیں۔ والد کی آنکھوں کے گرد جھریوں نے ایسے گھونسلا بنا رکھا تھا جس کے تنکے گردن تک پھیلے ہوئے تھے اور وہ مجھے پہلی مرتبہ بوڑھے دکھائی دیے۔ اُن کی باتیں، قہقہے، مسکراہٹیں اور آنکھوں کی چمک اتنی جوان لگا کرتی تھی کہ میرے خیال میں اُنھوں نے ہمیشہ جوان رہنا تھا۔ میں پریشان سا اُنھیں دیکھے جا رہا تھا اور وہ سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ''دیکھو بیٹا!'' اُنھوں نے دہرایا۔ میں نے اپنی سوچ کی ڈبکی سے باہر نکل کے سانس لی۔ ''زندگی میں کوئی commitment ہونی چاہیے۔ میں نے زندگی بغیر commitment کے گزار دی۔ ڈاک بنگلوں میں دن گزارنا، تاریخی مقامات کی سیر اور پھر اُن پر تحقیق، مزاروں پر حاضری دینا، کئی گھنٹوں کی لمبی ڈرائیو پر جانا اور کرکٹ کے میچ دیکھنا زندگی تو نہیں لیکن میں نے بنا لی تھی۔ میں نے اُتنا ہی کام کیا جس سے گھر چلے اور تم پڑھ سکو۔ مجھے اُس سے زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ دراصل زندگی کے ساتھ بے وفائی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ تاش کے پتوں کی طرح زندگی کبھی معاف نہیں کرتی۔ کہا جاتا ہے کہ اچھے پتوں والے ہاتھ کو اگر صحیح طرح استعمال نا کیا جائے تو پتے معاف نہیں کرتے۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے ہمیشہ اُن کی باتیں سننے کا مزہ آتا رہا ہے۔ اُس دن میں کچھ خوف زدہ ہو گیا۔ اُن کی باتوں میں ہمیشہ اُمید ہوتی تھی اور اُس دن مایوسی مجھے سردیوں کے بادلوں کی طرح بھاری لگی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بولتے جائیں تا کہ اُن کے اندر کی گھٹن کسی طرح ختم ہو جائے۔ ''یہ یکسانیت شاید میری سزا ہے۔ میں دراصل جو بھی کر رہا ہوں اُس یکسانیت کو دور کرنے کے لیے ہے۔'' وہ تھوڑا سا ہنسے، اُن کی نظر سڑک پر ہی تھی، ''تم زندگی میں یکسانیت کے بجائے تبدیلی کو ترجیح دینا اور اپنے خیالات اور سوچ کی تعلق داروں کے ساتھ ساجھے داری کرنا۔'' مجھے پہلی مرتبہ والد کی اُلجھن اور ناکامی کی وجوہات کا احساس ہوا۔ ماں کے بھی کچھ ایسے ہی مسائل تھے جن کا حل اُس نے، کسی کو پتا چلے بغیر، کتابوں میں ڈھونڈ لیا تھا؛ دونوں ہی یکسانیت کا شکار رہتے۔ والد کی فرار میں لپٹی ہوئی سوچ اُن کی زندگی کے عملی پہلوؤں پر بھاری تھی۔ ماں کی گھٹن اِس سے مختلف تھی؛ وہ ساجھے داری کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ماں کے رویے میں ایک درشتی تھی جسے اُس نے کبھی درست کرنے کی سعی نہیں کی۔ ''میں اِس طویل یکسانیت کی وجہ سے اُکتاہٹ کا شکار ہوتا چلا گیا اور پھر سہارے ڈھونڈنے لگا۔'' اُنھوں نے میری طرف دیکھا، میں نے اُن کے بڑھاپے سے نظر بچانے کے لیے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ بے چین سے ہیں؛ مجھے اُن پر ترس آیا۔ ''مجھے اب احساس

ہوا ہے کہ زندگی نے مجھے معاف نہیں کیا۔” ہم نے باقی کا سفر خاموشی میں طے کیا۔

اُس سفر کے چند دن بعد وہ فوت ہو گئے!

والد کے فوت ہونے کے بعد کھلا کہ ہم مالی طور پر اُس طرح مستحکم نہیں تھے جس طرح والد کی زندگی میں ہمارا خیال تھا، اُن کے مالی معاملات بھی لاپرواہی کا شکار رہتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ماں نے معاملات اپنے ہاتھ میں اِس انداز میں لیے گویا وہ میری ماں ہونے کے ساتھ باپ بھی ہو۔ یہ ایک طویل جدوجہد تھی جس میں ہم دونوں نے شکست کو نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ میں نے والد کے ڈوبے ہوئے کاروبار کو گہرے پانی میں سے نکال کر کنارے پر کھڑا کر دیا۔ ماں اِس تمام عرصے میں میرے پیچھے ایک ستون کی طرح کھڑی تھی۔ ہم ایک طویل سرنگ میں سے گزر کر روشنی میں آ گئے تھے اور کسی حد تک اپنی کامیابی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، والد کے برعکس، زندگی کو اپنا خیر خواہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنی شادی کے بارے میں بھی سوچتا۔ ماں کی دھاک کچھ ایسے بیٹھی ہوئی تھی کہ اُس کے ساتھ ایسی کوئی بات کرنا ممکن نہیں تھا جس کے بارے میں اُسے پیشگی مطلع نا کر دیا گیا ہو۔ میں اپنے اکیلے پن سے اُکتا گیا تھا اور والد کی یکسانیت اور اُس کے ساتھ وابستہ اُکتاہٹ کی وجوہات میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ مجھے کبھی محسوس ہوتا کہ وہ میری شادی نہیں کرنا چاہتی؛ شاید اُس کے لیے شادی ایک ناکام تجربہ تھا اور وہ اپنے بیٹے کو اِس عمل کا حصہ بننے سے روکنا چاہتی ہو! مجھے ایسے ہی لگا اور شاید یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ میں انتظار کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔

ہمارے درمیان میں کسی قسم کا کھچاؤ نہیں تھا، ماں ہر وقت خوش اور مطمئن نظر آتی۔ مجھے حیرت بھی ہوتی کہ کیا اُسے والد کے فوت ہونے کا ہی انتظار تھا؟ ماں اب اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے رہنے کے بجائے گھر میں ہر وقت اِدھر اُدھر چکر کاٹتی رہتی لیکن والد کے کمرے میں کبھی نا جاتی۔ اُن کے کمرے کا دروازہ ہمیشہ بند ہوتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ وہاں گرد، جالوں اور چھپکلیوں نے قبضہ کر لیا ہو گا۔ والد کی جوانی کی ایک تصویر اُن کے رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوتی تھی جسے میں اپنے کمرے میں رکھنا چاہتا تھا لیکن ماں کا مجھ پر اتنا دبدبہ تھا کہ میں اُس سے والد کے کمرے اور اُس تصویر کے بارے میں پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس تصویر میں وہ کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے مسکرا رہے ہیں اور یہ وہ معصومیت تھی جو مرنے کے بعد اُن کے چہرے پر تھی۔ اُن کے بند دروازے کو دیکھ کر میں اُن کی زندگی سے لاتعلقی اور اپنی ذات سے پیار یاد آنے کے ساتھ ہی اُداس ہو جاتا، میرا دل بھی کسی مزار کی پراسرار خاموشی میں کھڑے ہونے کو کرتا لیکن مجھے زندگی میں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ مجھے اُن کے لاتعلق رویے کا سوچ کر رشک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی۔

مجھے ماں کا اِس طرح پُر اطمینان ہونا ناپسند ہونے کے ساتھ پسند بھی تھا۔ اُس نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا

جس میں وہ بیٹھتی اور سب ایک دوسرے کے گھروں میں دعوت کھاتے۔ اپنے گھر میں ایسی دعوتیں میرے لیے ایک امتحان ہوتیں۔ ماں بہترین کے علاوہ کسی اور معیار سے مطمئن نہیں ہوتی تھی اِس لیے مجھے اُس کے معیار کی سطح کو قائم رکھنے کے لیے کافی پریشانی اُٹھانا پڑتی۔ ہر چیز مشینی طریقے سے ہونی چاہیے تھی اور انسانی غلطی کا امکان قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہ ماں کی ہم عمر آسودہ حال عورتوں کا ایک گروپ تھا جو ایک اجتماعی بےفکری کی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ پکنکوں پہ جاتیں، تاش پارٹیاں کرتیں، ایک دوسرے کے لیے تحائف خریدتیں، ریستورانوں میں کھانے کھاتیں اور بیوٹی پارلروں کے چکر لگاتیں۔ والد کے فوت ہونے کے بعد ماں کی زندگی ایک مسلسل قہقہہ تھا جسے میں سمجھنے یا اپنی گرفت میں لینے سے قاصر تھا لیکن ماں کی خوشی میرے لیے باعث اطمینان بھی تھا۔ وہ گھر سے سج دھج کے نکلتی اور تازہ دم واپس آتی۔ مجھے اُس کی قوتِ ارادی پر حیرت ہوتی اور خوشی بھی اور بعض اوقات جب میں مایوسیوں کے گھیرے میں ہوتا تو حسد کا احساس بھی ہوتا۔

ماں نے ایسا معمول بنایا ہوا تھا جس میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ وہ دوپہر سے پہلے روزانہ کہیں نا کہیں چلی جاتی، جاتے وقت اُس کے ہونٹ ایک مسرت سے چمک رہے ہوتے اور واپسی پر اُس کی چال میں ایک غرور ہوتا جو اُس کے اطمینان کی سرگوشی کر رہا ہوتا۔ اگر میں گھر پہ ہوتا تو ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے، وہ ایک میٹھی سی آہ بھرتی، پانی کے چند گھونٹ پی کے گھر پر ایک ناقدانہ سی نظر دوڑاتی اور یہاں سے وہ ایک عام گھریلو عورت بن جاتی، میری وہ ماں جس کے ساتھ میری ساری عمر سے شناسائی رہی تھی۔ وہ ملازمہ کو ہدایات دیتی، جواب طلبی کرتی اور پھر اُسے اپنے کام کرتے ہوئے دیکھتی۔ اُس کے چہرے کی نرماہٹ، غرور اور مٹھاس کے بجائے خاتونِ خانہ کا 'یہ کیا ہے' یا 'یہ کیوں نہیں' والا تاثر ہوتا جو مجھے اطمینان بھی دیتا اور خوف زدہ بھی کر دیتا۔

مجھے وہ کبھی مصنوعی لگتی، اُس گڑیا کی طرح جو چابی سے چل رہی ہو!

پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ گڑیا سے ماں بنتی جا رہی ہے!

وہ اُسی طرح خوب صورت تھی لیکن اُس خوب صورتی میں ایک اُداسی در آتی جا رہی تھی، جیسے وہ کسی گم شدہ چیز کو ڈھونڈتے ہوئے ڈھونڈنا بھول گئی ہو۔ اُس کی اُداسی میں ایک لاتعلقی بھی تھی جس میں سے مَیں اُسے شناخت کرنے کی کوشش میں رہتا۔ میں اب شادی کرنا چاہتا تھا، میری نظر میں کوئی لڑکی تو نہیں تھی، میں چاہتا تھا کہ وہ خود نا صرف میرے ساتھ بات کرے، میرے لیے بیوی ڈھونڈنے کے عمل کا آغاز بھی کرے۔ میں اُسے اپنی مصروفیات، تنہائی اور مستقبل کے اپنے ارادوں سے آگاہ کرتا رہتا لیکن وہ کوئی ردِعمل ظاہر نا کرتی، بس ایک خاموش سی لاتعلقی سے میری بات سنتی رہتی۔

ایک دن ماں باہر نا گئی اور میں نے اُس کے گھر میں رہنے کو کوئی اہمیت نا دی۔ اُس دن میں بھی گھر ہی

رہا۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھی اپنی انگلیوں سے کھیلتی رہی اور میں اُس کی خاموشی کی وجہ کا پتا چلانے کی خواہش کے باوجود اُس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ پھر اُس کا وہاں بیٹھے رہنا ایک معمول بن گیا۔ میں جب اپنے دفتر کے لیے نکلتا تو وہ وہاں بیٹھ چکی ہوتی اور اُس کی نظر سامنے گلی میں ایک نقطے پر ٹکی ہوتی۔ وہ وہاں کیا دیکھتی تھی؟ میں اور کئی باتوں کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اُس سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور وہ بھی میری پتا چلانے کی بے تابی کو سمجھتی تو ہو گی لیکن اپنی کسی سوچ کے ساتھ ساجھے داری کرنا اُس کی زندگی کا معمول نہیں تھا۔ وہ گلی میں دیکھتی رہتی اور میں اُسے دیکھتا رہتا۔ میں اپنے کام کو نظر انداز کر رہا تھا اور میری اس نظر اندازی کی تائید کیے جانا اُس کے اصولوں میں سے نہیں تھا لیکن اُس نے میرے اپنے پاس رہنے پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ گھر میں رہنے سے میرے کاروباری معاملات پر منفی اثرات ثبت ہونا شروع ہو گئے ہیں تو میں نے ماں کا خیال رکھنے کے لیے ایک نرس رکھ لی۔ اب شام کو وہ ماں کو اُس کے کمرے میں پہنچاتی۔

ماں نے باہر جانا مکمل طور پر چھوڑ دیا تھا!

ایک دن اُس نے مجھے کام پر جانے سے روک دیا۔ اُس کا یہ تقاضا معمول سے ہٹا ہوا عمل تھا۔ اُس نے کبھی والد یا مجھے کام پر جانے سے نہیں روکا تھا۔ مجھے اُس کا روکنا اچھا لگا اور میں کچھ پریشان بھی ہوا۔ مجھے والد کے ساتھ فیصل آباد سے واپسی کے سفر پر ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ ماں اپنی کرسی پر بیٹھی گلی میں دیکھتی رہی اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا؛ وہ بس گلی میں دیکھے جا رہی تھی۔ نرس کچھ دیر اسی کمرے میں بیٹھی رہی اور پھر وہاں سے اُٹھ گئی۔ ماں کو بھی شاید اُس کے اُٹھنے کا انتظار تھا۔

”میرے پاس آؤ!“ مجھے ماں کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ مجھے اُس کے کسی بھی قسم کی بات کرنے کی اُمید نہیں تھی۔ اُس کا لہجہ ہمیشہ درشت رہا تھا اور مجھے اُس کی آواز میں گندھی مٹھاس پر حیرت بھی ہوئی۔ میں کچھ کہے بغیر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنی کرسی پر حرکت کی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں نے خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، مجھے لگا کہ ہم ایک دوسرے کو تول رہے ہیں۔ میری نظر میں شک اور تجسس آ گئے تھے جب کہ وہ اسی طرح مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس مسکراہٹ میں مجھے ماں کی ایک نئی شکل نظر آئی۔ میں بھی جواب میں مسکرانا چاہتا تھا لیکن اس انوکھی سچویشن سے کچھ خائف ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے والد کے بند کمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور خوف، بے یقینی اور کم اعتمادی ایک برقی رو کی طرح میرے جسم میں دوڑ گئے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب دونوں، ایک دوسرے کو بتائے بغیر، گویا کسی معاہدے کے تحت، الگ الگ کمروں میں چلے گئے تھے۔ وہ مجھے وہاں کیوں لائی تھی؟ میں متجسس تو تھا ہی مجھے ایک انجانا سا خوف بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پھیل

گئی؛ اِس مسکراہٹ میں اُداسی اور محرومی تھے۔ میرے اندر ایک خلا وجود پاکر پھیل گیا اور میں اُس خلا میں اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا۔ مجھے اچانک ایک گہری تنہائی نے اپنی گود میں لے لیا۔

"میرے خیال میں مَیں تھک گئی ہوں یا ہار بیٹھی ہوں۔" اُس کی آواز میں تھکاوٹ تھی؛ پتا نہیں کیوں؟ پر مجھے اُس پر ترس آیا۔ "تمھارا باپ جیت گیا۔ وہ جب رخصت ہوا تو میں سمجھی کہ میں جیت گئی ہوں لیکن اب مجھے شدید قسم کی تنہائی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ جب تھا تو میں اکیلی ہونے کے باوجود تنہا نہیں تھی، اب تنہا بھی ہوں۔" اُس نے بڑھ کر والد کے کمرے کا دروازہ کھولا اور میرا خیال تھا کہ وہاں گرد، جالے، چھپکلیاں، لال بیگ، ہنڈیاں، بند کمرے کی سیلی سی ہواڑ ہو گی۔ مجھے ایک خوش گوار جھٹکا لگا، والد کا کمرہ صاف، باترتیب اور روشن تھا۔ میری نظر فوراً والد کی تصویر کے تعاقب میں گئی۔ وہ اُن کے میز پر سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ "میں اِس کمرے میں منتقل ہو رہی ہوں۔ اب شاید تنہا نا رہوں۔" اُس نے شرماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ہم چند لمحے جو میری زندگی جتنے طویل تھے، کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مجھے اُسی طرح کھڑے کھڑے اپنی تنہائی کا پھر احساس ہوا اور ماں اُسی وقت کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں نے سوچا کہ ماں بھی کہیں مزاروں پر جانا نا شروع کر دے!

☆☆☆☆

شعیب خالق

کہانی بنام کہانی کار

بائیسویں صدی کے نجانے کون سے عشرے کا گزر رہے اور کہانی اپنے کہانی کار کو خلائی عدالت کے کٹہرے تک لے آئی ہے۔

اپنی نوعیت کے اس منفرد مقدمے کی کارروائی، خلاء میں معلق ایک غیر معمولی عدالتی عمارت کے اندر جاری ہوا چاہتی ہے۔ مقدمے کے متن کی گہرائی کو سامنے رکھتے ہوئے عدالت زمین سے کھینچ اوپر اُٹھالی گئی ہے۔ کہانی کے دائر کردہ مقدمے کا بنیادی نقطہ ہی چوں کہ زمین کے ساتھ لپٹی زندگی سے متعلق ہے سو عدالت زمین کی جانبدارانہ فضا سے اُچھال، باہر نکال لینا ہی بہتر سمجھا گیا ہے۔ خلائی علاقے کے انتخاب میں کہانی کی رائے مانتے ہوئے چاند کے گردشی دائرے سے کچھ ہی اوپر کا علاقہ منتخب کیا گیا ہے تا کہ زمین عدالت کی نگاہوں سے گم نہ ہو سکے۔ یونہی کہانی کار کے اصرار کو بھی اہمیت دیتے ہوئے عدالت کا فرش، چھت اور دیواریں شیشے کی بنادی گئی ہیں تا کہ کائنات بھی مقدمے کی تمام تر کارروائی کے دوران ایک خاموش گواہ کے طور پر شش جہاتی عدالت کے روبرو موجود رہے۔ عدالت کا تمام فرنیچر بھی آر پار دکھائی دینے والے میٹریل کا اس لیے بنایا گیا ہے کہ خاموش گواہ کی نگاہیں کسی بھی جانب سے کوئی رکاوٹ نہ محسوس کریں۔

چھوٹے قد کا جج، شفاف چیمبر سے نکل عدالت میں داخل ہوا تو کھُسر پھُسر کی آوازیں، شیشے کے فرش پر جج کے مختصر قدموں کی دھیمی آہٹ ہی سے دُبک کر خاموش ہو گئی ہیں۔ وکیل استغاثہ و صفائی، مؤکلین کے قریب دھری کرسیوں سے اُٹھ کر جج کے بیٹھنے تک کھڑے رہے۔ دائیں ہاتھ والے کٹہرے میں کہانی نقاب پہنے اپنی بڑی اور روشن آنکھوں میں درد کی کاٹ لیے، جج کی آمد پر تعظیماً سر جھکا لیتی ہے۔ بائیں ہاتھ والے کٹہرے میں کھڑا کہانی کار، سر نہیں جھکاتا بل کہ باریک فریم والی نظر کی عینک پہنے، بدستور جج کی طرف مسرت بھری نگاہوں سے دیکھے چلا جاتا ہے۔ جج بے تاثر چہرہ اُٹھا، ناک پر دھری موٹے فریم والی عینک اور اپنی گھنی بھنوؤں کے درمیان سے نگاہ عدالت کے سامنے والے حصے پر ڈالتا ہے۔ سامنے دھری تمام کرسیاں خالی پڑی ہیں مگر اُن خالی کرسیوں کی جانب سے سنائی دینے والی سرگوشیوں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں مگر وہ دکھائی نہیں دے رہے۔ جج خالی کرسیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے کسی دھیان میں نجانے کیا سوچ رہا ہے۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا چلا گیا تو خالی کرسیوں سے مچلتی آوازوں کی سرگوشیانہ جھنجھناہٹ مقدمے کے آغاز کا

تقاضا لیے اُبھرنا شروع ہوئی ہے۔

''آرڈر......آرڈر......آرڈر......مقدمے کی کارروائی کا آغاز کیا جائے'' جج نے وکیل استغاثہ کو بھاری آواز بنا کر مخاطب کرتے اور عینک اُتار سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے۔

''جناب عالی، میری مؤکلہ اس معزز عدالت میں 'کہانی بنام کہانی کار' کے عنوان سے جو مقدمہ لے کر آئی ہے، اس کے چند نکات میں عدالت کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ کہانی کار نہ صرف خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے بلکہ وہ اپنی فکر کا دھاگہ عام لوگوں کے فہم میں بھی انکار کی صورت پرو دینا چاہتا ہے۔ جناب عالی پہلی بات یعنی خدا کے وجود سے انکار پر میری مؤکلہ کا مؤقف آگے چل کر آئے گا مگر عام لوگوں کے فہم تک خدا سے انکار کی رسائی کا جو کھیل کہانی کار میری مؤکلہ کی معرفت کھیل رہا ہے اُسے عدالت رکوائے۔

دوسرا نقطہ جناب عالی کون نہیں جانتا کہانی کی عزت و منزلت اور اس کی قدامت جس کے سامنے لفظوں کی ایجاد کل کا معاملہ ہے اور فاضل کہانی کار کا کردار لفظوں کی ایجاد کے بعد کہیں آتا ہے جبکہ وہ میری مؤکلہ کی عزت نہیں کرتا، اسے اہمیت نہیں دیتا اور اسے اپنی کوئی رکھیل بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ تیسرا نقطہ......

''آبجیکشن یور آنر'' وکیل صفائی نے ہاتھ اُٹھا کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا جس کے جواب میں جج نے وکیل استغاثہ کو رکنے اور وکیل صفائی کی طرف سر کو جنبش دیتے ہوئے بولنے کا اشارہ کیا ہے۔

''تھینک یو، یور آنر، دراصل اپنے فاضل دوست وکیل استغاثہ نے جو دو نقطے بیان کیے ہیں، میں سمجھتا ہوں باقی کے نقطے انہیں دو نقطوں کے ہی گرد گھومیں گے اس لیے میری وکیل استغاثہ سے گزارش ہے کہ وہ انہیں دو نقطوں کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کریں تا کہ باقاعدہ بحث کا آغاز کیا جا سکے۔''

''جناب عالی پہلے نقطے میں دو باتیں ہیں کہانی کار کا خدا کے وجود سے انکار اور اُس انکار کی ترسیل، خدا سے انکار یا اقرار، کسی بھی فرد کا داخلی اور ذاتی مسئلہ ہے لیکن کہانی کار کیا اس بات سے آگاہ نہیں کہ کائناتی احساسِ کمتری کے توڑ کیلیے خدا کا وجود ازحد ضروری ہے؟ خدا کے وجود سے انکار تو ہر عہد میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اصل مسئلہ اس انکار کی عام لوگوں تک رسائی کے باعث میری مؤکلہ اربوں لوگوں کے یقین کو بے یقینی میں بدلنے کی ہرگز آرزومند نہیں۔ اس کیلیے تو خدا کا وجود انسانوں کی خوشی کا باعث بھی ہے۔ وہ تمام دنیاوی تلخیاں اور مظالم اس لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ خدا کے حضور انہیں انصاف ملے گا اور پھر کبھی نہ ختم ہونے والی گداز زندگی کا آغاز ہوگا۔ سو میری مؤکلہ کی عدالت سے یہ درخواست ہے کہ کہانی کار کے استحصال سے کہانی کو آزادی دلائی جائے اور اربوں لوگوں کی امیدوں کے اس واحد سہارے کے انکاری ہتھیار، کہانی کار پھینک دے۔ شکریہ جناب عالی''۔

وکیل استغاثہ اپنی کرسی پر بیٹھا اور جج سے نظریں گھما کر وکیل صفائی کی جانب دیکھا جو اب جج کی طرف دیکھتے ہوئے چند قدم آگے بڑھ کر بولنے لگا ہے۔

’’یور آنر، میرے فاضل دوست نے اپنے بیان میں جو لفظ استعمال کیے ہیں وہ کچھ یوں ہیں ’کائناتی احساس کمتری کے توڑ کیلیے خدا کا ہونا از حد ضروری ہے‘ تو یور آنر، میں پہلے کائناتی احساس کمتری کے باعث خداؤں کے جنم سے بات شروع کروں گا۔ قبل از تاریخ کا انسان، آسمان اور سورج، چاند ستاروں کی پر اسراریت اپنے تازہ شعور میں کہیں گھڑنے لگا اور یوں اس گھڑت سے آسمانی دیوی اور دیوتاؤں کے کردار اس کو گھائل اور اپنی طرف مائل کرتے چلے گئے۔ دراصل قبل از تاریخ اور زمانہ کائنات کو ایسے نہیں دیکھ رہا تھا جیسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ وہ قدیم لوگ تو محض حسیات کے تحیر آمیز ذائقے اپنے ذہنوں اور خلیوں میں خوف کی صورت پیوست کیے چلتے چلے آ رہے تھے۔ اُن کیلیے کائنات تو دور کا جادو تھا اور وہ خود زمین کی گولائی سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ وہ تو سورج کے گرد زمین اور زمین کے گرد چاند کی گھوم سے بھی واقف نہیں تھے۔ مگر آج کا انسان کائنات کو کھنگال رہا ہے۔ بائیسویں اور تیئسویں صدی کے انسانوں نے اگر خدا کے نام پر زمین ہی اپنے مدار سے نکال باہر نہ پھینکی تو اس وقت کائنات کو دیکھنے والی نگاہیں، مذہب اور خدا کے جنجال سے مکمل آزاد ہو چکی ہوں گی۔ دراصل یور آنر حیات بعد الموت ہی مذاہب اور خدا کی دنیا کا محدود سا دائرہ چلی آ رہی ہے۔ سو میرے موکل کا استدلال یہ ہے کہ تمام انسانوں کے ذہنوں میں خدا کی قدیم متھ سے جڑی یہ جدید متھ بائیسویں صدی کے خاتمے سے پہلے ہی اپنے انجام تک پہنچا دی جانی چاہیے۔‘‘

’’آبجیکشن جناب عالی‘‘ وکیل استغاثہ نے مخالف وکیل کو روکتے ہوئے کہا اور جج نے اسے بولنے کا اشارہ کیا ہے۔

’’جناب عالی وکیل صفائی اپنے فکری مغالطے کو عدالت پر مسلط کرنے سے اجتناب فرمائیں اور خدا کا ہونا اور نہ ہونا ہی اس مقدمے کا واحد نقطہ نہیں ہے بل کہ میں سمجھتا ہوں میری مؤکلہ اور کہانی کار کے کردار جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں۔ اُن پر بات کرنا یہاں ہونے والی بحث کا ایک اور اہم نقطہ ہے۔‘‘

خالی کرسیوں سے طنزیہ کھسر پھسر کی آوازوں کے دوران کہانی کار نے وکیل صفائی کو اشارہ کیا اور وہ اس کے قریب جا کر اُس کی سرگوشی سن رہا ہے۔ وکیل استغاثہ نے بھی داد طلب نظروں سے کہانی کی جانب دیکھا مگر کہانی کا نقاب اُس کا تاثر چھپائے ہوئے ہے۔ وکیلِ استغاثہ نے وکیل صفائی کا اپنے موکل سے مشورہ قدرے طویل ہوتا دیکھ پھر سے بولنا شروع کر دیا ہے۔

’’جناب عالی آپ جانتے ہیں کہانی کا تعلق محض کسی ایک کہانی کار کے ساتھ تو نہیں، زمین کے تمام بر اعظموں کے لگ بھگ تمام ممالک اور اُن کے کہانی کاروں کے ساتھ میری مؤکلہ کے گہرے تاریخی اور تخلیقی تعلقات ہیں۔ مگر فاضل کہانی کار نے میری مؤکلہ کو باندی سمجھ رکھا ہے۔ سو عدالت سب سے پہلے کہانی کار کے مالکانہ اور مخاصمانہ رویے کو ترک کرنے کا حکم صادر فرمائے وگرنہ بحث آگے نہیں بڑھ سکے گی۔‘‘

عدالت کی ایک سمت جہاں زمین چھوٹی اور چاند اپنے دائرے میں گھومتا عدالت کے عین قریب سے

گزرتے ہوئے بہت بڑا دکھائی دے رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کہانی نے یونہی چاہت بھری نظروں سے کہانی کار کی جانب ایسے دیکھا ہے جیسے وہ اس منظر کے بیان میں اُس کے جزئیات بھرے متوقع جملوں کی مٹھاس سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔

”وکیل صفائی استغاثہ کے اُٹھائے گئے سوال کا جواب ریکارڈ پر لائیں“

”یورآنر، میرے فاضل دوست دراصل کہانی کے رومانی بہاؤ میں ڈوبے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی ابھارا جا سکتا ہے کہ کیا کہانی اپنی کوئی سوچ رکھتی ہے؟ نہیں یورآنر کہانی صرف اپنی فارمولائی صورت لیے ہوئے ہے۔ جیسے وقوعہ، زمان و مکان، ابتداء، درمیان اور اختتام۔ کہانی تو محض بت ہے اس کے اندر روح پھونکنے والا تو کہانی کار ہے۔ ابتدا اور اختتام تک تمام کڑیاں عمل اور ردِعمل کے ساتھ کہانی کار ہی کے دماغ اور قلم کا کرشمہ ہیں۔ کہانی کار کے سامنے کہانی ایک لاش ہے جسے تخلیقی کفن پہنا کر کاغذ کی قبر میں اُتار دیا جاتا ہے“۔

عدالت میں پہلی بار خالی کرسیوں پر قدرے بلند ہنسی کی آوازوں نے آسیبی فضاء میں اضافہ کر دیا ہے۔

”آرڈر ...... آرڈر .... آرڈر ....وکیل استغاثہ و صفائی اپنے اپنے مؤکلین کے کرداروں کی نرگسیت پر ہی زور دیتے چلے آ رہے ہیں جبکہ عدالت مقدمے کے اصل موضوع پر بحث سننا چاہتی ہے، لہٰذا دونوں وکلاء حضرات خاموشی سے بیٹھ جائیں۔ اب کہانی اور کہانی کار خود اپنا مقدمہ سامنے لائیں تا کہ عدالت کو کسی نتیجے تک پہنچائیں۔ کہانی پہلے اپنے بیان کی ابتداء کرے۔“

جج نے حکم صادر فرماتے ہوئے کہا اور کہانی نے بولنے سے پہلے اپنا نقاب الٹ دیا ہے۔ کہانی کے چہرے کا حسن اور اس کی چکاچوند پر کائنات بھی چونک اٹھی اور ایک ستارہ روشنی کی لکیر بنا عدالت کے نزدیک سے گزرا۔ کہانی نے پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ روشنی کی لکیر کو دیکھا۔ پھر یونہی مسکراتے ہوئے جب خالی کرسیوں کی جانب نگاہیں پھیریں اور ......”آرڈر .... آرڈر .... آرڈر ....کہانی اپنا مقدمہ بیان کرے۔“

”عزت مآب جج صاحب، میں اپنے بیان کی ابتدا آپ ہی کے ایک جملے سے کرنا چاہوں گی جس میں آپ نے نرگسیت کا ذکر کیا ہے۔ دراصل میری اور کہانی کار کی نرگسیت کے آس پاس ہی کہیں خدا کا تعلق چھوٹتا اور کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ میرا کہانی کار کے ساتھ اختلاف قطعاً گہرا نہیں مل کر انتہائی باریک ہے۔ جس خدا سے کہانی کار انکار کرتا ہے، میں بھی اس خدا کا اقرار ہرگز نہیں کرتی“۔

یک دم کہانی کے بیان پر غائب کو حاضر ثابت کرتی سرگوشیاں عدالت میں ہچکولے کھانے لگیں اور اس دوران وکیل استغاثہ حیران و پریشان فوراً اُٹھ کر کٹہرے کے پاس گیا اور اپنی تشویشانہ سرگوشی کہانی کے گوش گزار کی لیکن کہانی نے سرگوشی سُنی ان سُنی کرتے ہوئے اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا ہے۔

”آرڈر......آرڈر.........آرڈر.......کہانی اپنا بیان جاری رکھے“ جج نے کہانی کے بے نقاب حسن سے بھرپور چہرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا ہے۔

”عزت مآب جج صاحب، وہ خدا جو سوچتا، دیکھتا، سنتا، بولتا اور انسانی حسیات کے قول میں گناہ وثواب تولتا ہے، وہ صرف غریبوں کا خدا ہے اور جس باریک اختلاف کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہ اسی نقطے سے شروع ہوتا ہے۔ زمین پر اربوں ان پڑھ، جاہل، بے روزگار، بے یارو مددگار، مجبور و ناتواں اور بھوک کے دکھوں کی ماری مخلوق کا واحد آسرا یہی خدا ہے۔ کہانی کار جانتا ہے کہ امیر وخوشحال لوگ خدا کو روزمرہ محاورے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ورنہ خدا کی انہیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ طبقہ اشرافیہ کے لوگ بہت اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں کہ سرمائے میں ”کن“ کہنے کی خدائی صفت موجود ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اس زمین پر انسانوں کو خدا نہیں بلکہ سرمایہ چلا رہا ہے۔ اکیسویں صدی سرمائے کی جیت بن کر سامنے آئی تھی اور اب بائیسویں صدی اس جیت پر مہر تصدیق لیے ابھری ہے۔ ایسے میں تمام مذاہب، محض زمین کے مجبور وناتواں دکھوں اور بھوک کے مارے غریب ولاچار لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں، مگر اُن لوگوں کی تعداد بھی اس قدر زیادہ ہے کہ انہیں یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہانی کار سے میرا اختلاف ہی یہی ہے۔ وہ ایک طرف تو زمین کی پہچان انسانی انگوٹھے کا نشان قرار دیتا ہے اور دوسری طرف انہی انگوٹھے والے انفرادیوں کی گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتی آنکھوں سے ٹپکنے والے رومان بھرے آنسوؤں کو بھی رد کر رہا ہے۔ کہانی کار خدا کا انکار کرتے ہوئے یہ کیوں بھول رہا ہے کہ وہ کروڑوں اربوں لوگوں کی زندگیوں کا آخری سہارا ان سے چھین لینا چاہتا ہے اور ....اور میں یہاں ....عدالت تک جو آئی ہوں تو میرا داخلی کرب مجھے یہاں تک ....لے کر آیا ہے جس سے عدالت آگاہ نہیں“ کہانی نے آخری جملوں کی ادائیگی میں جس رقعت آمیز انداز سے اپنا کرب چھپایا ہے۔ اسے سن کر غائب وحاضر اور عدالت سکتے میں چلی گئی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد آ ہیں سرگوشیوں میں اضافہ ہوتا دیکھ جج بھی سر جھٹک کر جیسے لمحہ موجود میں واپس لوٹ آیا ہے۔

”آرڈر..........آرڈر.........آرڈر..........کہانی کے داخلی کرب سے عدالت آگاہی چاہتی ہے۔“

”عزت مآب جج صاحب“ کہانی نے آنکھوں کی دھندلاہٹ آنسو پونچھ دور کی اور جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے بول رہی ہے“۔ ”مجھے کہانی کار سے جو پیار ہے وہ پیار زمین کے انسانوں کی محبت، ان کے ایمان اور یقین کے آگے ڈگمگا گیا ہے۔ کہانی کار کا انکار پر ایمان اور یقین بھی میں یکسر رد نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے ساتھ میرے پیار کا ایمان اور یقین وابستہ ہے۔ جج صاحب، میرا داخلی کرب میرا پیار ہے اور یہ اُن تخلیقی لمحات کے کرب میں گندھا ہوا ہے جن میں کہانی کار اپنے نظریے اور فلسفے کو بیان کرنے کیلیے مجھے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ میں اُن بے بس، بے کس اور لاچار لوگوں کے دلوں پر وار کرتی ہوں جو ہر دکھ خدا کی رضا جان کر برداشت کرتے اور دلوں کو مطمئن رکھتے ہیں۔ جناب جج صاحب میں کہانی کار سے اتنی ہی واقف ہوں جتنا

کوئی انگوٹھے کا نشان خود سے واقف ہوتا ہے۔ کہانی کار بدنیت نہیں اور نہ ہی منفی فکر رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے لوگ ظلم، زیادتی اور ناانصافی کے خلاف روزِ محشر کے ماورائی رومانس سے باہر نکلیں اور اپنی ذات پر ایمان و یقین کے ساتھ دنیا کا رنگ بدل ڈالیں۔ وہ خدا کو مالکِ کائنات اگر نہیں مانتا تو وہ انسانوں کو اشرف الکائنات ضرور گردانتا ہے۔ مجھے اس کی انسانوں کے ساتھ محبت و چاہت پر ذرا بھی شبہ نہیں، لیکن کہانی کار کی سوچ سے اتفاق کرنے والے لوگوں کی تعداد اُن لوگوں سے کہیں کم ہے جو خدا کے وجود کا اقرار نبھا رہے ہیں۔ ایسے میں میری محبت انسانوں کی اکثریت کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ میری تمام دنیا کے کہانی کاروں کے ساتھ محبت ایک مجبوری بھی ہے۔ ہمارے تعلق کی کڑی زمین پر اُگ آنے والی شعورزدہ زندگی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ یہی زندگی خالی ہاتھوں کی راہنمائی لیے تہذیبی دور میں داخل ہوئی۔ نئی پرانی سمتیں اپنی شکل سنوارتی آگے بڑھیں اور انھوں نے مذاہب کا روپ اوڑھ لیا یونہی سست و لاغر صدیاں، لیور اور پہیے کی دریافت لیے اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب تک آ گئیں اور یوں اب انسانی شعور کی رفتار کمپیوٹر کی برق رفتاری کو اُڑس چکی ہے۔ عزت مآب جج صاحب انسان کی اس تمام ہوشربا شعوری اور مادی ترقی کے باوجود خدا انسانی نفسیات کا ایک ٹھوس حصہ بنا آج تک چلا آ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں آنے والی صدیوں کے بعد، سنتا، سوچتا، بولتا اور انسانی حسیات کے قول میں گناہ و ثواب تولتا خدا کائنات اور انسانوں کے خلیاتی تسلسل سے بھی کٹ جائے گا مگر جج صاحب اگلی آٹھ دس صدیاں جب تک زمین پر زندہ رہنے کے وسائل مکمل ختم نہیں ہو جاتے اور انسان مریخ یا کسی اور سیارے پر منتقل نہیں ہو جاتا۔ تب تک خدا کی انسانوں کو اشد ضرورت رہے گی۔ سو میری آخر میں معزز عدالت سے یہ التجا ہے کہ کہانی کار کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں سے کوئی گوہر نایاب کی تلاش چھوڑے اور اس کائنات کی انتہائی نایاب زندگی جو زمین کی سطح پر چل اور تڑپ رہی ہے۔ اس کی کہانیاں لکھے اور خدا کا پیچھا چھوڑ دے''۔

کہانی کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے مگر اس نے منہ ہاتھوں میں نہیں چھپایا بلکہ خالی کرسیوں اور جج کی طرف دیکھ رہی ہے۔ عدالت پر سناٹا چھا گیا ہے۔ غائب و حاضر، سب خاموش اور درد مند احساس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اچانک جج کا زوردار قہقہہ ہر کسی کو حیران چونکاہٹ میں پرو لیتا ہے۔ قہقہے کی بازگشت سننے والوں کو سکتے میں لیے ہوئے ہے۔ کہانی بھی آنسو پونچھ کر حیرت بھری نظروں سے جج کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کہانی کار کے چہرے پر پہلی بار فکرمندی کا تاثر اُمڈ آیا ہے۔ وکیل استغاثہ و صفائی کسی ہارے ہوئے وکیل کی شرمندگی چہرے پر چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خالی کرسیوں کی چُپ کسی گھُپ آسیب کی مانند محسوس ہو رہی ہے۔

جج کا قہقہہ رُکے کچھ لمحے گزر چکے ہیں اور اب وہ جیسے اپنے اندر کہیں ہنس رہا اور چہرے پر سنجیدہ تاثر چڑھانے کی بھی کوشش کر رہا ہے، مگر ہر بار اندر کی ہنسی اس کی سنجیدہ گری کو توڑ بھی رہی ہے۔ جج نے اپنی کیفیت

پر قابو پا لیا اور اب وہ پُراعتماد سنجیدگی میں ڈھلا اور گویا ہوا ہے۔

''کہانی کے بیان میں چھپے کرب نے انتہائی اذیت ناک دکھ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ وہی دکھ ہے جس کے توڑ کیلیے میرے اندر سے قہقہہ پھوٹا تھا''۔ جج نے ٹھنڈی آہ بھری اور افسردہ انداز کہانی کار کی طرف دیکھ بول رہا ہے۔ ''عدالت چاہے گی کہ کہانی کار اپنا بیان ریکارڈ پر لائیں''۔

''یور آنر، کہانی کا بیان یقیناً لائق تحسین ہے جس نے آپ کے اندر دُکھ اور پھر اس کے توڑ کا قہقہہ بلند کیا، مگر یہ دکھ اور قہقہہ عدالت کی جانبداری کی طرف بھی اشارہ لیے ہوئے ہے''۔ کہانی کار نے چند لمحوں کی خاموشی میں گردن گھما فکرمند تاثر کے ساتھ خالی کرسیوں کی طرف دیکھا تو بے اعتبار کھسر پھسر آہستہ آہستہ غصیلے شور کی شکل اختیار کرتی چلی گئی اور...... ''آرڈر...... آرڈر...... آرڈر...... کہانی کار کے الزام نے مقدمہ مشکوک بنا دیا ہے۔ اس لیے میں یہ بات اب عدالت کے علم میں لانا چاہوں گا کہ فیصلہ میں نے نہیں کرنا۔''

یک دم عدالت سناٹے میں چلی گئی مگر چند ہی لمحوں بعد طنزیہ لہریں خالی کرسیوں پر دبی دبی ہنسی کے ساتھ منڈلانے لگیں۔ کہانی ورطۂ حیرت میں ڈوبی ہوئی اپنی خوبصورت آنکھوں سے جج کی طرف دیکھے چلی جا رہی ہے۔ دونوں وکیل اپنی کرسیاں ایک دوسرے کے نزدیک لے آتے اور خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے سرگوشیوں میں عقل بانٹ رہے ہیں۔ کہانی کار جو سب جانتا ہے، مسکراتا اور خالی کرسیوں کی جانب نگاہ لحہ بھر روکتا اور گردن گھما جج کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''محترم جج صاحب'' کہانی کار کے طنزیہ لہجے پر خالی کرسیاں کھنکھناتی ہنسی میں ڈول گئیں مگر جیسے ہی جج نے خالی کرسیوں کی جانب قدرے آنکھیں پھیلا کر دیکھا تو ہنسی یک دم تھم بھی گئی ہے۔

''آپ نے جو کہا کہ فیصلہ آپ نے نہیں کرنا، یہ کہنے کی بھی آپ کو ضرورت نہ جانے کیوں محسوس ہوئی تو خیر عدالت کی فضا اور آداب بہر حال آپ کے حق میں جاتے ہیں۔ جناب محترم کہانی نے اپنے بیان میں انسانوں ہی کے کندھوں پر کھڑے ہو کر زمین کی نرگسیت کو دیکھنا چاہا ہے جبکہ آج زمین اور انسانوں سے محبت ایک عامیانہ اور سطحی سا جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ دوسری جانب زندگی اور وقت کا پراسرار سفر نظام شمسی کے دیگر سیاروں پر آبادکاری کے مراحل اور اُس کے حصار سے بھی باہر کوئی ٹھکانے تلاشے گا مگر میرے محترم، ایسا بھی ممکن ہے کہ اسی دوران کوئی مخلوق زندگی کی نئی شکل لیے کہیں ہم سے آ ملے اور ان سے مل کر ہمیں پتہ چلے کہ وہ تو بے خدا ہیں۔ سو جب ہم مستقبل میں دور تک جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسے میں ہمیں آج کا خول اتار دینا ہوتا ہے باقی رہ گئی خدا کے ہونے اور نہ ہونے کی بات تو کہانی کی زبانی یہ میرا پیارہی ہے جو اس نے میرے انکار کو اپنا اقرار مانا ہے۔ نہ وہ میری باندی ہے اور نہ ہی میں اُس کا آقا ہوں۔ سو اس موضوع پر مزید بات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ البتہ کہانی نے زمین کے ان انسانوں کے بارے میں جس جذباتیت کا اظہار کیا ہے جو غریب اور کچلی ہوئی مخلوق ہیں اور جن کے پاس خدا کے سوا کوئی آسرا نہیں اور نہ ہی کوئی اور ان کی سننے

والا ہے۔ تو میرے محترم جو انسان زمین سے دوسرے سیارے پر منتقل ہونے سے محروم رہ جائیں گے وہ زمین پر اپنے ہی ہاتھوں تباہ و برباد کر دیے گئے زندہ رہنے کے زمینی وسائل پر ماتم کریں۔ خدا سے روتے ہوئے میٹھے پانی کی دعائیں مانگتے پھریں۔ ان کے بارے میں سوچ کر کائنات کی طرف لپکتی نئی زندگی اپنا وقت کیوں برباد کرے۔ یا کنگ آسمان پر امید لگائے لوگوں کے بارے میں سنجیدگی سے کیوں سوچے؟ میرے محترم اب زندگی کی عمر بڑھانے اور اسے سدا بہار بنانے کی صدیوں کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ کہانی کا میں دل کی گہرائیوں سے مشکور رہوں کہ اس نے خدا کو چھوڑ، انسانوں کی اولیت، افضلیت پر زور دیا ہے۔ ...... باقی انگوٹھے کے نشان والا نقطہ......" کہانی کار اپنے انگوٹھے کا نشان دیکھتے ہوئے بات روک کر ہنسا اور پھر ہنسی کے آخری ڈول باتوں کی لپیٹ میں آ رہے ہیں۔

"وہ............ دراصل .... انگوٹھے کا نشان زمینی زندگی کا استعارہ ہے۔ یہ نشان اپنی قطعی داخلی کائنات کا خدا ہے اور اسے خارجی خدا کی اب ضرورت نہیں رہی۔ وہ خارجی خدا بائیسویں صدی کے اختتام تک اپنی رخصتی کے قریب جا پہنچے گا اور آخر میں محترم جج صاحب آپ اگر فیصلہ نہیں کرنے والے تو صرف اعلان ہی فرما دیں کہ بائیسویں صدی کو دیکھتے، سنتے، سوچتے اور بولتے خدا کی آخری صدی قرار دیا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد فیصلہ اگر آسمان سے اترتا ہے تو عدالت پہلے ہی آسمان پر اتری کھڑی ہے۔" آخری جملے کے بعد کہانی کار نے قہقہہ لگایا جس کی بازگشت سے جج ہراساں اور گنگ تاثر لیے جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ قہقہے کی بازگشت کے درمیان ہی معترف ارتعاش بھری کھسر پھسر بھی سنائی دے رہی ہے۔

"آرڈر...... آرڈر...... آرڈر......" جج کی بھرائی آواز کے ساتھ مقدمے کا کرب آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک رہا ہے۔ جج اپنے اندر کے قہقہے کا توڑ روکتے اور خود پر قابو پاتے ہوئے بولنے لگا ہے۔

"دونوں فریقین نے دراصل کائنات کے دو بڑے قدیم دکھوں کی نشاندہی کی ہے، ایک زمین سے جڑے دکھوں کا کرب اور دوسرا آسمان سے جڑے دکھوں کا عذاب، اور یہی خلائی عدالت میں پیش کیے گئے مقدمے کا بنیادی نکتہ بن کر سامنے آیا ہے۔ زمینی دکھ خدا کی موجودگی کے اقرار میں قرار پاتے ہیں اور آسمانی دکھ خدا کی کائنات میں موجودگی کا انکار اور انسان کو ہی اشرف الکائنات ماننے کا اظہار سمجھا گیا ہے۔ کہانی اور کہانی کار کائناتی احساس کمتری کے نکتے پر متفق بھی ہیں اور دونوں فریقین کے حسیاتی دلائل بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مقدمے کی کارروائی اپنے اختتام کو پہنچی اور اب کہانی اور کہانی کار مقدمے کے فیصلے سے آگاہ کیے جائیں گے۔ خالی کرسیوں پر موجود، غائب جیوری، کہانی یا کہانی کار کے حق میں ہاتھ اٹھا کر اپنا شماریاتی فیصلہ صادر فرمائیں۔ شکریہ!

جج کا بیان ختم ہوتے ہی خالی کرسیوں پر مفاہمانہ سرگوشیوں کی کھسر پھسر چند لمحے سنائی دی اور پھر غائب جیوری نے غائب ہاتھ اٹھا کر غالباً کسی ایک کے حق میں فیصلہ بھی کر دیا ہے۔

رشید مصباح

خاک زادے

(1)

رات کتنی کالی اور وحشت ناک ہے۔ اردگرد پھیلے ہوئے عمر رسیدہ گھنی شاخوں والے درختوں سے جھولے جھولتی چمگاڈروں کی تیکھی آواز ماحول کی ہیبت میں مزید اضافہ کر رہی ہیں، پہاڑی ڈھلوان پر پتھروں سے بنائے گئے اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر نیچے دریائے گول کا چلو بھر بہتا پانی اٹکھیلیاں کرتا شمال مغرب سے جنوب کی جانب بڑی آہستگی سے بہہ رہا ہے۔ گھپ اندھیرا جو اس کے اندر بھی تھا اور باہر بھی، اس کے دماغ کو اذیت سے لبریز کر رہا تھا۔

گل شیر بنگرئی نے اپنے بائیں بازو پر بندھی ایک دہائی پرانی گھڑی پر نظر دوڑائی تو اُسے کچھ نہ سجھائی دیا پھر اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ رات کے دو پہر بیت چکے ہیں اور تیسرے پہر کا آغاز ہونے کو ہے۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ابھی تھوڑی دیر بعد پچھلی رات کا چاند سامنے والی چٹیل پہاڑی کی اُوٹ سے آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگے گا تو سورج سے مستعار لی روشنی کا کچھ حصہ چاند سے زمین پر بھی اُتر آئے گا اور ساری فضا سرمئی رنگ کی ہلکی ہلکی روشنی سے منور ہو جائے گی۔ اس سرمئی روشنی کا وہ بڑا دل دادا تھا۔ ایک عجیب سے ٹھنڈک اور اندھیرا سحر انگیز ماحول بنا دیتا تھا، اُس نے پچھلے پہر کے چاند کے انتظار میں چارپائی پر لیٹے دائیں سے بائیں کروٹ لی اور گہرے سیاہ آسمان پر تاروں کی بارات کو گھورنے لگا۔ کالے آسمان کے عین وسط میں گرد آلود دودھیا رنگ کی ایک چوڑی پٹی آسمان کے آر پار پھیلی ہوئی تھی۔ ’’کہکشاں‘‘ اُس نے دودھیا گرد آلود پٹی کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ کائنات میں ایسی کتنی ہی لاکھوں بلکہ کروڑوں یا اس بھی زیادہ مزید کہکشائیں، جن میں سے ایک کہکشاں کے کسی کونے میں سورج بھی ستارے کی حیثیت سے رقصاں ہے۔ تاروں بھر کالے آسمان میں ایک ستارہ کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا، اُس کی نظر اس ستارے پر ٹھہر گئی، اُسے بچپن میں دادی اماں سے سنی ہوئی ماورائی کرداروں والی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ لیکن ایک خیال نے اُس کے دماغ پر حملہ کیا، وہ سب کہانیاں تو فرضی تھیں۔ وہ سائنس کے دور میں رہا ہے اور کائنات میں پھیلی ہوئی ہر چیز دھیمے دھیمے اپنی حقیقت آشکار کرتی جا رہی ہے۔ یہ ستارہ بھی جس کی تیز روشنی اس کالے ماحول میں اس کی

آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ شاید اب آسمان سے پہلے کسی کہکشاں کا ماضی کا حصہ ہوا اور اب یہ ٹوٹ پھوٹ کر خلا میں بکھر گیا ہو۔ تو پھر اس کی یہ روشنی کیا ہے؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور دوسرے ہی لمحے جواب حاضر تھا، ممکن ہے میری زمین ہزاروں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہو اور یہ روشنی اُس ستارے تک لمبے سفر پر اس وقت روانہ ہوئی ہو جب ابھی انسان مچھلی کی شکل میں گہرے سمندروں میں پانی سے اٹھکیلیاں کر رہا ہو۔ اور اب جب یہ روشنی مجھ تک پہنچی ہے تو ستارہ معدوم ہو چکا ہو۔ اُس نے سوچا اس اندھیری رات میں مجھے نظر آنے والے بہت سے ستارے اس کیفیت سے گزر چکے ہوں گے۔ اس پر ایک بار پھر مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کیا بصارت ہمیشہ دھوکہ دیتی؟ لیکن وہ پھر خود یہ سوچنے لگا بصارت نہیں وقت دھوکا دیتا ہے...... بصارت اگر روشنی کی رفتار سے مقابلہ کر سکتی تو سارے واہمے ختم ہو جاتے۔ وقت لایعنی ہے......اس کے ہونے اور نہ ہونے کا تعلق واقعات کے ظہور سے ہے۔ مکان ہی زمان کی دلیل ہے۔

وہ تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے ملک کے تیسرے درجہ کے علاقے کا باشندہ تھا جو قبائلی علاقے سے بہہ کر آنے والے کمزور سے دریائے گومل کے اردگرد پھیلے پہاڑوں کا رہنے والا تھا، جہاں کے اکثر پہاڑ چٹیل اور سنگلاخ تھے اور چند پہاڑوں کو سبزے کی چادر اور سخت جاں درخت نصیب ہوئے تھے، پہاڑوں کے درمیان کئی ایک جگہ اونچی نیچی زمین والی وادیاں تھیں جہاں یہاں کے باسیوں نے انگور اور لوکاٹ کے باغ لگا رکھے تھے۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت بھیڑ بکریاں چرانے کے پیشے سے منسلک تھی اور انھیں اپنے علاقے سے باہر کی دنیا سے بہت کم واقفیت تھی، دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فرنگیوں نے سنگلاخ پہاڑوں کو کاٹ کر ژوب سے ڈیرہ اسماعیل تک ایک پتلی سی سڑک تعمیر کی تھی اور کوئٹہ سے ژوب تک چھوٹی گیج کی ریلوے لائین بچھائی، لیکن پچھلی دہائی تک سڑک اور ریلوے لائین دونوں اپنا وجود کھو چکیں تھی اور صرف سڑک کے پتھروں کے نشان رہ گئے تھے جہاں سے دن میں چار چھ ٹرک اور ویگن گزرتیں۔ سورج کے ڈھلنے کے بعد اس راستے سے کوئی سواری گزرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اندھیری رات میں مال واسباب اور جان کا بچ جانا ان ہونا واقعہ ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن پچھلی صدی کے خاتمے سے کچھ عرصہ پہلے ملک میں نئے فوجی حکمران کا دور شروع ہوا تو اس سے بدلی ہوئی سیاسی اور فوجی صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے نئے سرے سے ایک کشادہ اور جدید عہد کی سڑک تعمیر کروائی۔ اور گومل زیم ڈیم کی تعمیر کا آغاز ہوا جو گذشتہ ایک دہائی کے زیادہ عرصے سے چیونٹی کے چال دھیمے دھیمے تعمیر کے مراحل طے کرتا جا رہا ہے۔

سنگلاخ پہاڑوں کے کچھ حصوں میں بجلی کے کھمبے لگ چکے ہیں اور خوش حال گھرانوں تک بجلی کی سپلائی بھی پہنچ چکی ہے۔ ژوب سے کلاچی تک کے علاقے میں سڑک کے ساتھ ساتھ چند مقامات پر فوجی کیمپ بھی

بنائے جا چکے ہیں اور اس کے گھر والی پہاڑی کے سامنے دریائے گومل کے اُس پار والی پہاڑی پر دو ٹاور بھی تعمیر ہو چکے تھے جو اب علاقے کے بڑے حصے میں مواصلات کے نظام کو مربوط رکھنے کا کام دیتے ہیں، لیکن سارے علاقے کے مکینوں کی ذہنی، جسمانی اور مالی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں۔ ہاں یہاں گذشتہ دو دہائیوں میں دو چیزوں کو بہت فروغ ملا ہے۔ ہر بوڑھے اور نوجوان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نسل کا اسلحہ آ چکا ہے اور جہاں بھی چند گھروں کی بستی ہے وہاں دینی مدرسہ کھل چکا ہے۔ ان مدرسوں کو چلانے والے کافی خوش حال ہو گئے ہیں۔ سنا ہے ان سب کو پرائے دیسوں سے ان مدرسوں کو چلانے کے لیے وافر رقم ملتی ہے، ہر مدرسہ میں لاؤڈ سپیکر ہے، انھیں چلانے کے لیے بجلی موجود ہے اور جہاں بجلی نہیں پہنچی وہاں بڑے بڑے جنریٹرز لگے ہوئے ہیں۔ مدرسوں کے طالب علموں کو اچھی رہائش اور خوراک بھی میسر ہے لہٰذا بہت سے غریب غربا نے اپنے بچوں کا مستقبل سنوار کے لیے انھیں ان مدرسوں کے حوالے کر دیا ہے۔ جہاں کالی یا سفید پگڑیاں باندھے بچے مدرسے کی چار دیواری کے اندر صبح سے شام تک اِدھر سے اُدھر بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔

(۲)

ژوب کے شمال مغرب میں وزیری قبائل آباد ہیں، جنوب کی جانب کلاچی تک کے علاقوں میں گنڈاپور اور بنگلزئی قبائل کا ٹھکانہ ہے۔ میرا تعلق بنگلزئی قبیلے کی ایک ذیلی شاخ سے اور میرا والد اس شاخ کا سردار ہے جسے اپنے قبیلے میں اہم ترین رتبہ حاصل ہے۔ علاقہ میں کوئی بھی مسئلہ پیدا ہو تو پولیٹیکل انتظامیہ میرے باپ سے ہی رابطہ کرتی ہے۔ میرے والد کے اس پہاڑی کے قدموں میں واقع مختصر وادی کے کچھ حصے میں کھیت ہیں جہاں اس نے انگور کے باغات لگا رکھے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ انگور کے درخت نہیں ہوتے بلکہ بیلیں ہوتیں۔ کھیت میں بانس گاڑھ کر کے ان کے اوپر لوہے کی تاروں کا جال بن دیا جاتا ہے اور انگور کی بیلیں ان تاروں کے جال پر اپنی شاخیں پھیلائے سبز رنگ کی خوبصورت چھت بنا دیتی ہیں۔ ایک کھیت میں لوکاٹ کے چھوٹے قد والے درخت ایستادہ ہیں۔ انگور اور لوکاٹ کی بیلیں اور درخت موسم آنے پر پھل کے گچھوں سے بھر جاتے ہیں، اور باغات کے مالکان کے دل بھی باغ باغ ہو جاتے۔ یہی ہماری آمدنی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ لیکن اب اسلحے اور مدرسوں کے کاروبار نے بھی بہت سے لوگوں کے دن پھیر دیے ہیں۔ اسی وادی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سو کے قریب گھر ہیں۔ گھر کیا ہیں پتھروں سے بنائے گئے چھپر یا پھر خیموں میں بسائے گئے کنبے، یہاں ایک پرائمری سکول بھی ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم اسی سرکاری سکول سے حاصل کی تھی اور پھر اُس کے بعد مجھے ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک سکول بھیج دیا گیا، جہاں میں پورے پانچ تک ہاسٹل کی زندگی کے مزے لوٹتا رہا۔ میٹرک پاس کیا تو مجھے ڈیرہ کے ہی ایک ڈگری کالج میں

داخلہ مل گیا۔ یہاں بھی مجھے ہوسٹل کے مکین کی حیثیت سے سیلن زدہ حجرہ نما کمروں میں زندگی کے چار قیمتی سال بسر کرنے پڑے۔ میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو میری مزید تعلیم میں دلچسپی نہیں تھی، میں دس سال سے کچھ اوپر عرصہ شہر میں گزار چکا تھا، لیکن میرے اندر کا قبائلی بنگلوری علی شیر پوری طرح زندہ تھا۔ میں نے سوچا میں اپنے پہاڑی گاؤں واپس لوٹ جاؤں، لیکن بڑے شہروں کے دروازے آنے والوں کے لیے کھولے اور واپس جانے والوں کے لیے بند ہوتے ہیں۔ لیکن میں اپنے پہاڑی گاؤں کو بھول نہیں پایا تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا اور میرے والد کا اصرار تھا کہ میں بدلتے ہوئے زمانے اور ماحول کے ساتھ چلنے کے لیے مزید تعلیم حاصل کروں۔ یونیورسٹی کی تعلیم۔ لیکن بی اے میں نمبر کم آئے تھے اور یونیورسٹی میں داخلہ دشوار تھا۔ والد صاحب نے علاقے کے پولیٹیکل ایجنٹ کو تحفے اور کچھ نقد رقم دے کر بنوں یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں میرے داخلے کا انتظام کردیا۔ اس طرح میں ڈیرہ سے بنوں منتقل ہوگیا۔

(۳)

چاند فضا میں سرمئی روشنی بکھیرتا ہوا اپنے ہم سفر پر رواں دواں تھا رات کا تیسرا پہر اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ لیکن علی شیر کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اُس نے پوری رات کروٹیں بدلتے اور گزرے دنوں کے سارے منظر آنکھوں میں اُبھرتے ڈوبتے دیکھے۔ اچانک فضا فوجی طیاروں کی کرخت آواز سے گونج اٹھی اور پھر پہاڑوں سے ٹکرا کر سیٹیاں بجاتی ہوئی گھومنے لگی۔ اس کی نظر فوراً آسمان کی طرف اُٹھی جہاں سفید دھواں چھوڑتے ہوئے طیارے تیزی سے وزیرستان کی طرف چلے گئے تھے۔ علی شیر پریشان ہوکر اُٹھ کے چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے ذہن میں ان دیکھے منظر ابھرنے لگے۔ وزیرستان کے کسی علاقے میں گولے برس رہے ہوں گے اور کئی مکان ملبے کا ڈھیر بننے کے ساتھ ساتھ آگ کی لپیٹ میں آ چکے ہوں گے اور لازماً بہت انسان بھی لقمہ اجل بن چکے ہوں۔ اُسے دہشت گردوں سے نفرت تھی اس کے علاقے میں بہت سے وزیر مہاجروں کے خیموں لگ چکے تھے اور اسلحہ بردار جتھوں کے جتھے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے تھے۔ لیکن اسے دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ بہت سی معصوم جانوں کے زیاں پر گہرا دکھ بھی ہوتا اور وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ محبت اور جنگ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر اس نے سوچنا شروع کردیا محبت اور جنگ میں ایسا کیوں ہے؟ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ محبت اور جنگ دونوں انسان دشمن عمل ہیں۔ محبت میں تو اُسے بھی دلچسپی تھی لیکن یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے؟ ...... وہ حیرانی سے سوچنا شروع کردیتا اور حیران کن بات تو یہ ہے کہ جنگ کرنے والے بھی اسی ملک کے باشندے اور جنگ بازوں کا پیچھا کرنے والے بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ پھر جنگ کیسی؟ تب دیر تک سوچنے کے بعد اُسے خیال آیا کہ یہ اپنوں کی اپنوں سے جنگ نہیں نظریوں اور مفادات کی جنگ ہے ...... نئے

اور پرانے کی جنگ ...... سامراج اور غیر سامراج کی جنگ ...... لیکن سامراج تو نئے کا نمائندہ ہے اور غیر سامراج پرانے کا بچاری تو پھر صحیح کون ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تب اس نے ذہن سے سب کچھ جھٹکتے ہوئے سوچا۔ نہ نئے کے نام پر جنگ لڑنے والا نیا ہے اور نہ پرانا کے پردے میں جنگ باز پرانا ہے۔ سارا مسئلہ وسائل پر قبضے اور لوٹ مار کا ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ ان دونوں نے اس کے وطن کو جنگ کا میدان کیوں بنایا ہے۔ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتا ہے اور اس کے وطن کی تہذیب، تمدن اور معیشت ڈھلوان پر ہے۔ نیچے دریائے گومل بھی تو ڈھلوان پر ہی بہہ رہا ہے۔

بنوں یونیورسٹی کہنے کو ایک سرکاری یونیورسٹی تھی لیکن اس کا ماحول کسی دینی مدرسہ سے ملتا جلتا تھا۔ ہر کلاس روم میں درمیان پردہ، جس کے ایک طرف لڑکیاں بیٹھتیں اور دوسری جانب لڑکے براجمان ہوتے۔ کلاس ختم ہوتی تو لڑکے پہلے کلاس روم سے باہر آتے پھر لڑکیاں اور آخر میں پروفیسر۔ راہداریوں میں چاروں طرف متقی پرہیزگار چوکیدار کھڑے رہتے۔ کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کینٹین تو الگ الگ تھی لائبریری کو بھی دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا، ساری یونیورسٹی میں اسلامی بھائی اسلامی بہنوں کی حفاظت مامور تھے۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں علی شیر کو سخت وحشت ہوتی تھی۔ اس سے کھلا ماحول تو اس کے اپنے علاقے کا تھا مگر اب تو وہاں بھی وزیری بھائیوں کے ساتھ ازبک اور تاجک مجاہدین نے آ کر ڈیرے لگا لیے تھے اور بچوں بوڑھوں اور نوجوانوں کو نئے سرے سے دین سکھایا جا رہا تھا۔ وہ جو کتابوں میں پڑھتا اور ہوسٹل کے کامن روم میں رکھے ٹی وی چینلز پر دیکھتا۔ یونیورسٹی کے ماحول میں سب کچھ اس کے الٹ تھا۔ اُسے یونیورسٹی اپنے گاؤں سے زیادہ پسماندہ معلوم ہوتی اور اس کا دل چاہتا کہ اس ماحول سے بھاگ نکلے۔ لیکن تعلیم مکمل کرنا اس کے سیاست دان قبیلے کے سردار باپ کا فرمان تھا جس کی وہ کسی صورت حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔

اس گھٹن زدہ اور وحشت بھرے یونیورسٹی جیل کے ماحول کے باوجود وہ اپنی ایک کلاس فیلو شریں گل جو شافزئی قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی کے نزدیک ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں کی راہ و رسم بڑھی تو انھوں نے یونیورسٹی سے باہر ملاقات کے مواقع نکال لیے، وہ کلاسز ختم ہوتے ہی باری باری یونیورسٹی کے قید خانے سے فرار حاصل کر کے، شہر کے بازاروں میں اکٹھے گھومنے چلے جاتے، شریں گل نے نقاب اُوڑھا ہوتا ہے اور علی شیر نے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے سر پر مشہدی باندھی ہوتی اور آنکھوں پر سیاہ چشمے چڑھائے ہوتے کبھی کبھی وہ کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں کھانا کھانے جا گھستے اور گھنٹوں بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے یوں ان کی دوستی آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی اور ساتھ ساتھ زندگی بنانے کے وعدے وعید ہونے لگے ان کا خیال تھا کہ یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی وہ مزید تعلیم کے لیے والدین پر دباؤ ڈال کر کسی دوسرے بڑے شہر کی کسی اور

یونیورسٹی میں ایم۔ فل میں داخلہ لے لیں گے۔

ابھی علی شیر ایم۔ اے سیاسیات میں سال دوئم کے اختتامی مراحل میں تھا کہ ایک دن اس کے باپ کا کارندہ خاص اُسے گاؤں لے جانے کے لیے آدھمکا۔ اُس نے علی شیر کو بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اُسے فوراً اس کے ساتھ واپس گاؤں جانا ہوگا۔ علی شیر ساری صورت حال جان کر پریشان ہوگیا اور پھر کسی کو اطلاع کیے بغیر ہی آنے والے کے ساتھ گاؤں روانہ ہوگا۔ اس کے باپ کا منشی اپنے ساتھ جیپ لایا تھا کہ انھیں گاؤں پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شام ڈھلنے سے قبل وہ دونوں پہنچ گئے۔ اردگرد کے علاقے کے لوگ اور قبیلے کے تمام افراد کے ساتھ ساتھ سب عزیز و اقارب بھی جمع ہو چکے تھے، جنازہ تیار تھا۔ بس اس کی آمد کا انتظار تھا وہ اپنے پہاڑی گاؤں پہنچا تو ہر کوئی اُسے پرُسہ دینے لگا۔ وہ سب سے سر جھکا کے ملتا ہوا جلدی جلدی ابھی جان چھڑا کر اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔ سب عورتیں بین کر رہی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی اُس کی ماں دھاڑیں مارتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور اس سے لپٹ کر بلند آواز میں رونے لگی۔ اس نے ماں کو دلاسا دیا اور اپنے آنسو آنکھوں سے چھلکائے بغیر ہی اندر ہی اندر حلق میں اُتار لیے کہ وہ مرد تھا...... قبائلی مرد...... جو کبھی دوسروں کے سامنے رویا نہیں کرتے اور وہ تو سردار کا بیٹا تھا جس کا آنسو بہانا اس کی قبائلی اور خاندانی روایات کے خلاف تھا۔ وہ ماں کو دلاسا دے کر باہر مردوں میں میت کے پاس آ گیا، میت کے منہ سے سفید چادر الٹ کر جی بھر کے باپ کے چہرے دیکھا کہ یہ اس کے لیے باپ کا آخری دیدار تھا وہ کئی منٹ دم سادھے کھڑا رہا اور پھر مدرسہ کے مولوی صاحب آگے بڑھے، انھوں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا، ”بس خدا کو یہی منظور تھا اب وہ اپنی حقیقی دنیا میں چلا گیا جہاں ہم سب کو بھی ایک دن جانا ہے“ اور انھوں نے آگے بڑھ کر میت کا چہرہ کفن کی چادر سے ڈھانپ دیا۔

ایک بڑے ٹیلے کو ہموار کر کے گاؤں میں نئے بنائے گئے بڑے مدرسے کے سنگ مرمر کے پتھروں والے صحن میں اس کے والد کا ازبک نسل کے بڑے مفتی صاحب نے جنازہ پڑھایا۔ جنازہ پڑھنے سے قبل اس نے مفتی صاحب کے کہنے پر زندگی میں پہلی دفعہ اپنی شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر کیے۔ بہت بڑا جنازہ تھا۔ لوگوں کی کثیر تعداد تھی بہت سے مجاہدین بھی جنازے میں شامل تھے، جنھوں نے جنازہ پڑھتے ہوئے کاندھوں سے رائفلیں اور کلاشنکوفیں لٹکائی ہوئیں تھیں۔ جنازہ ہو چکا تو مفتی صاحب نے طویل دعا مانگی۔ پھر میت کو لحد میں اُتارا گیا اور منوں مٹی ڈال کر اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ اس کے بعد مفتی صاحب کے کہنے پر سات مجاہدین جن میں سے تین ازبک، دو وزیری اور ایک ہنگرئی تھا، مجمعے سے نکل کر ایک طرف قطار بنا کر کھڑے ہو گئے، ان سب کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں جنھیں انھوں نے فضا میں بلند کر کے نعرہ تکبیر ”اللہ

اکبر” کی آواز بلند کی اور پھر یکمشت سب نے فضا میں کلاشنکوفوں کے برسٹ داغ کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا کیوں کہ ازبک مفتی صاحب کے کہنے کے مطابق وہ اللہ کے بزرگ ترین بندے تھے جنھوں نے اپنی زمین میں سے ایک ٹیلہ مدرسہ تعمیر کرنے کے لیے عنایت کیا تھا۔

تدفین کی رسومات عین سلفی طریقے سے ادا ہو چکیں تو سب مرنے والے کے گھر کی طرف ہو لیے جہاں پرسہ داروں کے لیے کئی پہاڑی بکرے اور دنبے ذبح کر کے کھانا تیار کیا گیا تھا۔ سب نے اپنی اپنی طمع اور استطاعت کے مطابق کھانا تناول کیا اور مرحوم کے اکلوتے بیٹے علی شیر سے تعزیتی سلام لیتے ہوئے اپنے اپنے بسیروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح ہوئی تو زندگی اپنے معمول پر تھی بس علی شیر کے گھر میں ابھی سوگ کا سما باقی تھا۔ صبح کے 9 بجے ہوں گے کہ بڑے مدرسے کے سپیکر سے اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ مدرسہ کے میدان میں جمع ہو جائیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مدرسے کا صحن لوگوں سے بھر گیا۔ صحن کے عین وسط میں ایک بڑی کرسی خالی پڑی تھی۔ مفتی صاحب نے علی شیر کو اس پر بیٹھنے کی دعوت دی اور علاقے کے ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ نے علی شیر کے سر پر نئی پگڑی باندھ کر اس کے ہنگروئی قبیلہ کا سردار ہونے کا اعلان کیا اور علی شیر سے گلے مل کر اُسے مبارک دی۔ پھر یہی عمل مفتی صاحب نے دہرایا اور اس کے بعد سب نے لائن میں لگ کر باری باری علی شیر کا جو سردار علی شیر ہنگروئی بن چکا تھا ہاتھ چوما اور آگے بڑھتے گئے، کئی گھنٹے بعد یہ کھیل ختم ہوا تو سردار علی شیر بُری طرح تھک کر اپنے عزیز کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچتے ہی وہ چارپائی پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اُس کا جسم تھکاوٹ سے چور چور دکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، کبھی اس کے ذہن میں بنوں یونیورسٹی کے مناظر گھومنے لگتے کبھی وہ بڑے مدرسہ کے صحن میں پہنچ جاتا اور کبھی شریں گل کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا۔ اس دوران اُس کی آنکھ لگ۔

شام ڈھلے اُس کی آنکھ کھلی تو گھر میں سناٹا تھا۔ تمام مہمان جا چکے تھے، اُس کی ماں صحن میں بال بکھرائے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی وہ خاموشی سے جا کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس کے منہ سے بس اتنا نکلا ”ماں بس یہی زندگی ہے۔ صبر اور شکر۔ بس یہی زندگی ہے“ اور اس کی ماں نے ہمت کر کے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی ”بیٹے تیرا باپ نہیں رہا۔ تو اب اپنے قبیلے کا سردار ہے اب تو شہر یونیورسٹی نہیں جائے گا۔ بس پہاڑوں کے دامن میں رہ کر قبیلے کی خدمت کرے گا“۔ وہ ماں کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ کبھی اپنے ماں باپ کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔ اس نے شکستہ لہجہ میں جواب دیا۔

”اچھا ماں“

آہستہ آہستہ وقت خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ علی شیر اپنے باپ کے منصب پر فائز ہو کر روایتی قبائلی مسائل میں الجھ گیا لیکن کبھی کبھی بنوں شہر، بنوں یونیورسٹی اور شریں گل اُسے بہت شدت سے یاد آتے۔ لیکن وہ گئے دنوں کو خواب سمجھ کر اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ یوں ایک سال بیت گیا۔ ایک صبح وہ اپنے گھر کے حجرے میں بیٹھا دوستوں سے گپ شپ میں مصروف تھا کہ نوکرانی نے حجرہ کے دروازہ کے پاس سے آواز لگائی کہ بڑے مدرسہ کے نئے مفتی صاحب تشریف لائے ہیں اور وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ملاقات کے لیے دروازے پر موجود ہیں۔ شیر علی فوراً اٹھ کر گھر کی چوکھٹ تک گیا، اس کی ماں وہاں پہلے سے موجود تھیں، نوجوان خوبرو مفتی صاحب اجازت لے کر سلام کہتے گھر کے اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کی جوان سال بیگم بھی اندر داخل ہوئیں اور ماں جی سے گلے ملنے لگی اس دوران اس کے منہ سے نقاب سرکا تو علی شیر نے دیکھا۔ ”یہ تو شریں گل ہے“ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ علی شیر نے چہرے پر زبردستی بناوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے مفتی صاحب کو اپنے حجرے میں لے آیا اور ماں جی شریں گل کو جو کہ اب بیگم مفتی صاحب تھیں کو گھر کے اندر لے گئیں۔

چند دنوں کی کھوج کے بعد علی شیر پر یہ راز کھلتا ہے کہ نئے ازبک مفتی صاحب اس علاقے میں مجاہدین کے نئے کمانڈر بن کر منگھان ایجنسی سے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ مفتی صاحب کا شریں گل کے باپ سے گہرا یارانہ ہے وہ غیر ملکی مجاہدین کو عرصہ دراز سے اسلحہ سپلائی کرتا ہے اور یہی اس کا کاروبار ہے جس سے وہ کروڑوں کماتا ہے۔ مفتی صاحب پہلے سے دو بیویاں رکھتے ہیں لیکن شریں گل پر نظر پڑتے ہی ان کے منہ میں پانی آ گیا اور ایک بڑی رقم کے بدلے میں شانزئی سمگلر سردار سے شریں گل کا رشتہ مانگ لیا۔ شانزئی سردار بھی بڑی رقم اور مستقبل کے کاروباری فائدے کے سبب کچھ نہ کہہ سکے، یوں مفتی صاحب تیسری دلہن شریں گل کی صورت میں نکاح لائے۔ مفتی صاحب اور ان کی بیگم شام ڈھلے واپس مدرسہ سے وابستہ گھر چلے گئے اور علی شیر بنگلزئی سردار گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا کالی رات کے تارے گنتا رہا، لیکن نیند اس کی آنکھوں کا رستہ بھول گئی تھی۔

صبح ہوئی تو اس کی ماں اسے جگانے کے لیے آئی تو وہ پہلے سے ہی جاگ رہا تھا۔

ماں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”علی شیر تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ اب تم شادی کر لو۔ علی شیر نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔ ”ماں پہلے مدرسوں اور دہشت گردی کی جنگ ختم ہو لے پھر میں محبت کی جنگ کا سوچوں گا!

☆ ☆ ☆ ☆

ایوب اختر

’’بارہ بانوے‘‘ کا رحیم بخش

کسی بھی گاؤں کا یہ اس کا پہلا سرکاری دورہ تھا۔ دفتری احکامات کے مطابق اُسے پبلک ٹرانسپورٹ یعنی بس میں جانا پڑ رہا تھا۔

اگرچہ اُسے اپنا سامان پیک کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا مگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ڈھونڈنے، اکٹھا کرنے کی وجہ سے وہ ذہنی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ بیڈ پر آتے ہی اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی گھڑی اٹھائی اور الارم سیٹ کرتے ہوئے بیوی سے کہا:

’’نایاب! تم چھ بجے اُٹھ جاؤ گی ناں!؟‘‘

’’ جی میں اٹھ جاؤں گی اور تمہیں بھی اُٹھا دوں گی۔‘‘

’’ مجھے وہاں اپنا سیل فون Off رکھنے کو کہا گیا ہے لیکن اُدھر جس گیسٹ ہاؤس میں مجھے ٹھہرنا ہے اُس کا نام، پتہ اور فون نمبر میں نے ایک چٹ پر لکھ دیا ہے، یہ چٹ تمہاری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھی ہے۔‘‘

’’ یعنی دِن میں رابطہ ممکن نہیں ۔۔۔۔؟‘‘

’’ ہاں! سرکاری مجبوری ہے ۔۔۔‘‘

’’Well اللہ کرے تمہارا یہ Tour بھی کامیاب رہے۔‘‘

اگلے دِن جب وہ لاری اڈہ پہنچا تو بس روانہ ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔ اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ بچپن میں اُس نے اسی طرح کی منہ والی راکٹ بسوں کو دیکھا تھا۔ ہارن کی آواز پر وہ چونکا۔ اُس نے کنڈیکٹر کو سامان دیتے ہوئے تاکید کی وہ اسے احتیاط سے رکھے۔ اب وہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور رحیم بخش سے ابتدائی گفتگو کے دوران ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ذہین اور خوش طبع انسان ہے جس کے ساتھ سفر خوشگوار گزرے گا۔

بس تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شہری آبادی بہت پیچھے رہ گئی تو وہ بولا:

’’اُدھر گاؤں میں کیسا موسم ہے؟‘‘

’’موسم بہت اچھا ہے صاحب! بہار آئی ہوئی ہے۔‘‘

’’سنا ہے کہ خطرناک پہاڑی سفر ہے۔‘‘

’’جی صاحب جی! خطرناک روٹ تو ہے مگر اِدھر کے ڈرائیور بھی بڑے ماہر استاد ڈرائیور ہیں۔‘‘

’’رحیم بخش! میں نے کئی قسم کے پہاڑ دیکھے اور ان سب میں ایک خاص کشش محسوس کی۔۔۔‘‘

’’جی صاحب جی! ذرا سوچیں پہاڑ نہ ہوتے تو اتنی خوب صورت وادیاں کہاں سے آتیں۔ پہاڑ تو زمین کی شان ہیں صاحب! بارشوں کے بعد تو ان کا روپ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ان پہاڑوں کی بہت عمریں ہیں صاحب! یہ ہمیں ہمارے آباؤاجداد کی یاد دلاتے ہیں۔ ہمارے دادا پڑدادا نے انھیں دیکھا، آج ہم بھی انھیں دیکھ رہے ہیں، یہ مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں صاحب! انھوں نے اللہ، نبیؐ کی باتیں سنیں، پیغمبروں، فرشتوں کو دیکھا ان کا بڑا مقام ہے صاحب! یہ پہاڑ بڑے پاک ہوتے ہیں صاحب!‘‘

اور رحیم بخش کی باتیں پہاڑوں نے سن لیں وہ واقعی مسکرا رہے تھے۔

’’تم ٹھیک کہتے ہو رحیم بخش! پہاڑ بہت مقدس ہیں۔‘‘

راکٹ بس اب پہاڑوں کے دامن میں بچھی ہوئی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ چھوٹے بڑے جس گاؤں کو دیکھتا کھو سا جاتا۔ اسے ہر گاؤں، ہر گھر یوں لگا جیسے وہ بنایا نہ گیا ہو بلکہ زمین سے اُگ آیا ہو۔

ان گھروں کی اس زمین میں بنیادیں نہیں جڑیں ہوں گی۔ اس نے سوچا۔

رحیم بخش کے کھانسنے پر وہ چونکا تو رحیم بخش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

’’اگلے گاؤں میں ہم کھانے وانے کے لیے رُکیں گے۔ یہاں کا کھانا بھی صاحب! آپ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔‘‘

اس نے مسکراتے ہوئے ایک نظر رحیم بخش کو دیکھا اور بس سے باہر کے منظروں میں کھو گیا۔

سڑک کے دونوں طرف دُور تک پھیلے ہوئے کھیت، لہلہاتی فصلیں اور ان میں کھڑے خوب صورت درخت صدیوں پرانے پہاڑ، ندیاں، نالے، پھول دُور کہیں کچا اکا دکا گھر، پگ ڈنڈیاں اور ان بل کھاتی ہوئی پگ ڈنڈیوں کی رازوں بھری چمک۔۔۔

وادی میں ہر طرف دُور دُور تک حُسن پھیلا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی حسین جگہوں کے لوگ اور ان کے جذبے کتنے خوب صورت ہوں گے۔ وہ اس وادی کے آخری گاؤں میں داخل ہوئے تو رحیم بخش نے بس کی رفتار کم کر دی۔ گاؤں میں اُس کی جان پہچان کے لوگ اسے سلام کرتے تو وہ کسی کو ہاتھ کے اشارے سے تو کسی کو ہارن بجا کر جواب دیتا۔ ہوٹل آ گیا تو رحیم بخش نے بس ایک طرف کھڑی کر دی۔

’’آیئے صاحب! آپ کو کھانا کھلائیں۔‘‘ رحیم بخش نے سیٹ سے اُٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی رحیم بخش کے ساتھ بس سے نیچے اترا۔ ہوٹل کے ملازموں نے رحیم بخش کو گھیر لیا تو ان سے سلام دُعا کے بعد رحیم بخش نے کنڈیکٹر کو اپنے پاس بلایا۔

’’بالے پُتر! جا اندر جا کر نور احمد سے کہہ کہ پلیٹیں شلیٹیں صاف ستھری دے اور ساتھ میں پیاز بھی کاٹ

لے ۔ اسے بتانا صاحب ساتھ ہیں، کوئی گلہ نہ آئے ۔"

"جی اچھا اُستاد جی!" بالے نے کہا اور ہوٹل کے کچن کی طرف چل دیا۔ ہوٹل کے سامنے ہوٹل کے ملازم راکٹ بس کو بڑے شوق اور محنت کے ساتھ صاف کر رہے تھے ۔ وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں دیوار پہ لکھا ہوا تھا۔

"ست بسم اللہ ۔ جی آیاں نوں ۔"

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ بھنا ہوا گوشت، تڑ کے والی مونگ کی دال ۔۔۔۔

"رحیم بخش! میں یہ کھانا کبھی نہ بھول سکوں گا۔ یہ ذائقہ مجھے اس گاؤں کی طرف کھینچے گا" اُس نے کہا، رحیم بخش مسکرا رہا تھا۔

"بس اس سے آگے ہمارا سفر ایک گھنٹے کا ہے ۔"

رحیم بخش نے دوبارہ سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہی ہر طرف ہریالی، چھوٹے بڑے پہاڑ، ندیاں نالے اور صاف نیلا آسمان ۔۔۔۔۔ بس بہت تیز بھاگ رہی تھی ۔ ایک بہت بڑے پہاڑ کا طواف کرتی ہوئی سڑک سے گزرتے ہوئے اُس نے رحیم بخش سے پوچھا۔

"رحیم بخش! تم نے ابھی تک بتایا نہیں تمہارا اپنا کون سا گاؤں ہے ۔"

"جہاں آپ نے اُترنا ہے وہاں سے تھوڑا آگے ۔۔۔ چھوٹا سا گاؤں ہے صاحب!"

اب اُس نے رحیم بخش کو مزید کریدتے ہوئے پوچھا:

"تمہارے بیوی بچے بھی وہیں گاؤں میں ہوتے ہیں کیا؟"

"نہیں صاحب! ہم میاں بیوی تو شہر میں رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جب رحیم بخش ایک دو خطرناک موڑ مڑ گیا تو بولا "صاحب! ابھی جہاں سے ہم نے کھانا کھایا، بہت پہلے میں اس گاؤں میں ایک بارات لے کر آیا تھا ۔ اُس وقت بسیں بھی بس ایسے ہوا کرتی تھیں ۔ لڑکی والوں کے گھر سے تھوڑی دُور بس کھڑی کی ۔ انجن بہت گرم ہو گیا تھا ۔ قریبی گھر سے پانی لینے گیا تو بس صاحب! پتا ہی نہ چلا اور وہاں معاملہ ہو گیا ۔ اُس رات میں دیر تک جاگتا رہا ۔ قصہ مختصر یہ ہے صاحب! میں نے بڑی مشکلوں سے بازی آخر جیت لی اور میں اُس لڑکی کو بیاہ کر لے آیا ۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی میں اسے سیر سپاٹے کے لیے شہر لے گیا ۔ اُسے شہر پسند آ گیا اور میں گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آیا ۔ باپ پہلے ہی مر گیا تھا دو سال بعد ماں بے چاری بھی چل بسی ۔ شادی کے بارہ سال بعد اللہ نے اپنا کرم کیا ۔ اب ہمارا ایک بیٹا ہے ۔ بہت پیارا ہے صاحب! دو سال کا ہونے کو ہے ۔ اور میری بیوی میری اپنی مرضی کی عورت ہے صاحب! پر صاحب! یہ عورت بھی کچے دھاگے پہ لگی گرہ جیسی ہوتی ہے جسے بڑی سوجھ بوجھ سے کھولنا ہوتا ہے

ورنہ اِتنی آسانی سے یہ گرہ نہیں کھلتی۔ ہاں! دھاگا ٹوٹ جاتا ہے۔'' اور یہ کہتے ہی رحیم بخش ایک خطرناک ڈھلوانی موڑ بڑی آسانی سے کاٹ گیا تو وہ بولا:

''رحیم بخش! پھر تو بھابھی سے خوب نبھ رہی ہوگی!''

رحیم بخش نے بس کی سپیڈ ذرا سی کم کی اور پہاڑ اُترتے ہوئے بولا'' صاحب! اچھی نبھ رہی ہے۔ پر ایک بات ہے صاحب! یہ ''بارہ بانوے'' آٹھ نو سال سے میرے پاس ہے۔ اس کے ایک ایک پرُزے سے میں واقف ہوں اور اس کا ایک ایک پرزہ مجھ سے واقف ہے۔ آپ میری بات پر ہنسو گے صاحب! پر یقین کرو اس بے جان چیز میں بھی جیسے کوئی خاص بات ضرور ہے۔ جتنا اسے میں سمجھتا ہوں اُتنی ہی یہ مجھے سمجھتی ہے۔ ہم دونوں ایک ہوتے ہیں تو سفر کا پتا ہی نہیں چلتا اور صاحب! شادی کو چودہ سال گزر گئے پر وہ ایک ہونے والی بات ہماری محبتوں کے بیچ میں ہی پڑی رہی۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ جوانی کا کوئی اُبال تھا۔ محبت نہیں تھی۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے صاحب! مشکل سے مشکل موڑ بھی آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ بہ ہر حال صاحب جی! پھر بھی مولا کا کرم ہے۔ اچھی نبھ رہی ہے۔''

''بارہ بانوے'' خطرناک موڑ مڑتی ہوئی اب ایک نئی وادی میں داخل ہو رہی تھی۔

''بس صاحب اب ہماری منزل قریب ہے۔'' رحیم بخش نے ایک بہت بڑے گاؤں کی آبادی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

وہ بہت خوش تھا کہ اُسے اس خوب صورت وادی میں کچھ دن گزارنے کا موقع میسر آیا۔ بس رک گئی تو رحیم بخش کے ساتھ وہ بھی بس سے اترا۔ بالے کنڈیکٹر نے اسے اس کا سامان لا کر دیا۔ گیسٹ ہاؤس میں اس کے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی، کچھ سرکاری لوگ اسے لینے کے لیے لاری اڈے پر آئے ہوئے تھے۔ اس نے رحیم بخش کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس کی بہت تعریف کی۔ وہ گیسٹ ہاؤس جانے کے لیے جیپ میں بیٹھتے ہوئے بھی کہہ رہا تھا۔ ''رحیم بخش میں تمہیں اور تمہاری ''بارہ بانوے'' کو یاد رکھوں گا۔''

کھانے وغیرہ کے بعد رات کو جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے گیا تو اسے اپنے گھر کا بیڈ روم یاد آ گیا۔۔۔ جیسے ابھی نایاب اندر داخل ہوگی۔ اس سے کوئی بات کرے گی، مسکرائے گی اور دیر تک مسکراتی رہے گی۔ خود کو آئینے میں دیکھے گی۔ اپنے خوب صورت بال کھولے گی۔ پنیں، کلپ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھے گی اور۔۔۔ وہ ابھی اپنے اس خیالی منظر میں محو تھا کہ فون کی گھنٹی بجی تو چونکا۔ اُس نے فوراً ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف نایاب تھی۔

''اوہ! یقین کرو میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''رہنے دو۔ فون تو ہو نہیں سکا تم سے۔ میں اتنی دیر سے کوشش کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے نمبر ملا ہے۔ مجھے اتنی فکر تھی۔ تم نے کہا تھا کہ خطرناک پہاڑی سفر ہے۔ شکر ہے تم خیریت سے پہنچ گئے۔۔۔ اپنا خیال رکھنا

،فون کرتے رہنا۔“

”ہاں ہاں میں فون کرتا رہوں گا۔ تم بھی اپنا خیال رکھنا اور سنو! شام کو ملازمہ کے ساتھ ”پبلک پارک“ چلی جایا کرنا۔ تھوڑی بہت Outing ہو جائے گی اور تمہاری واک بھی۔“

”Well!---تم بھی ناں!---- بالکل آزاد نہ ہو جانا، سگریٹ بہت کم پینا---“

اُس نے پیار بھری سنجیدگی کے ساتھ بیوی کو اس کی طرف سے ”بہت کم“ کی رعایت پر شکریہ کہا اور ”بہت کم“ سے بھی کم کا وعدہ کیا۔

اُس کا اس گاؤں میں کام بڑھتا چلا گیا۔ وہ ہر رات نایاب کو فون کرتا اور وہ اُسے جلدی واپس آنے کا کہتی۔ گیارہ دِن بعد اس کا کام اپنے اختتام کو پہنچا تو فوراً اس کے دماغ میں ”بارہ با نوے“ کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اگر ”بارہ با نوے“ یہاں آتی ہے تو یقیناً یہاں سے جاتی بھی ہو گی۔“ اُس نے سوچا اور بغیر کسی تاخیر کے لاری اڈے پہنچ گیا۔ لاری اڈے سے واپسی پر وہ بہت خوش تھا۔ بار بار جیب سے ٹکٹ نکال کر دیکھتا۔ سیٹ: وی آئی پی۔ گاڑی نمبر: 1292۔

”کل صبح ہوتے ہی میں گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے کو چھوڑ دوں گا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوں گا جہاں دُنیا کی سب سے اچھی عورت، میرا پیار، میری نایاب میری منتظر ہے۔“ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ: ”پہاڑوں سے اُٹھتی، زمین سے پھوٹتی ان خوب صورتیوں کو چھوڑنے کا مجھے کوئی ملال نہیں تو یقیناً وہ رنگ جو میں اپنے ساتھ یہاں لایا ہوں سب رنگوں سے حسین ہیں۔ میرے اندر کے رنگ، میرے اپنے رنگ، وہ رنگ کہ جن پر آج تک کوئی اور رنگ نہ جم سکا۔ بے شک محبت میرے بخت کا سب سے روشن ستارہ ہے۔“ وہ دیر تک وہاں کھڑا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ پیشِ نظر میں فطرت کے حُسن رنگوں کی سرگوشیوں پہ کان دھرتا رہا، سوچتا رہا۔ وہ ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا۔ بولتا رہا۔ رات بیت گئی، اندھیرا چھٹ گیا تو دور کہیں سے آنے والی ککڑوں کڑوں کی آواز پر چونکا۔ اسے ابھی اپنا سامان پیک کرنا تھا۔ صبح جب وہ لاری اڈے پہنچا تو رحیم بخش اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے ملے۔ حال احوال پوچھا۔ بالے کنڈیکٹر نے اس کا سامان بس کی چھت پر رکھا۔ تھوڑی دیر بعد ”بارہ با نوے“ کا انجن سٹارٹ ہو گیا۔ اب وہ ایک بار پھر ”بارہ با نوے“ میں رحیم بخش کے ساتھ تھا۔ گاؤں کی سب گلیاں، ندیاں، نالے، پھول، بوٹے، درخت اور گھروں کی چھتوں، منڈیروں پر بیٹھے ہوئے ہنستے مسکراتے اس کی باتوں کے سب لفظ پیچھے رہ گئے تو اسے لگا جیسے وہ ایک دنیا چھوڑ رہا ہو۔ ایک ایسی دنیا جس میں چند دن گزارنے کے بعد اس کے خیال میں وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گیا تھا۔ پہلے پہاڑی سلسلے کا پہلا موڑ، آگے دُور تک جاتی ہوئی ڈھلوانی سڑک، جس کی نکڑ پر ایک چھوٹا سا تنگ پُل---رحیم بخش اور ”بارہ با نوے“ ایک ہوئے تھے۔ سڑک کے اطراف میں

فطرت کے رنگ ہنس رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وہ اب ایک نئی وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ اس وادی میں رحیم بخش کا سسرالی گاؤں بھی تھا۔ جب وہ گاؤں آیا تو ''بارہ با نوے'' کی چال بدل گئی۔ پھر بہت سے گاؤں، وادیوں میں سے ہوتی ہوئی ''بارہ با نوے' اب اونچے پہاڑوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خطرناک کالے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے نایاب یاد آ گئی۔ گھر یاد آ گیا۔ گھر کے لان میں بچھی ہوئی کرسیاں، دھیرے دھیرے آتی ہوئی رات، اوس میں بھیگی باتیں، بحثیں، کچھ پل خاموشی کے، پھر سانسوں کا شور، چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو، کیاری کیاری شرمائے سے کچھ نیلے نیلے بھورے سرخ گلابی پھول۔ ایک اور دنیا۔ اس کی اپنی دنیا۔''

''بے شک دُنیا بہت خوب صورت ہے۔'' اُس نے سوچا اور اگلے ہی لمحے وہ ایک خیال میں الجھ گیا۔ اس نے رحیم بخش کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور بولا:

''رحیم بخش! میں اپنی بیوی سے کہہ بیٹھا تھا کہ اس مرتبہ میرا سفر خطرناک پہاڑی سفر ہے اور میری بیوی تب سے دعائیں مانگ رہی ہے کہ میں خیریت سے اُس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ٹیلی فون پر بھی وہ بار بار مجھ سے یہی کہتی رہی کہ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ خدا کرے تم خیریت سے واپس آ جاؤ۔ رحیم بخش! تم جو روزانہ راستوں پر ہوتے ہو، تمہاری بیوی کی تشویش کا کیا عالم ہوگا؟ وہ بے چاری تو ہر وقت ہی بہت فکر مند رہتی ہوگی۔'' رحیم بخش کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں، وہ مسکرا رہا تھا۔ بس کی رفتار ایک دم کم ہوگئی۔ آگے خطرناک موڑ تھا اور جب رحیم بخش وہ موڑ بھی مسکراتے ہوئے کاٹ گیا تو بولا:

''صاحب! ڈھونے والے پیار محبت کی سب فصلیں ڈھو گئے۔ اب تو کہیں کوئی تنکا بھی اگر مل جائے تو غنیمت ہے۔ آپ کی باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں صاحب۔۔۔ پر صاحب! پتا نہیں کیوں اپنا تو ان سب باتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ''بارہ با نوے'' سے پہلے کی بات ہے۔ کوئی کام وام نہیں تھا۔ تین ماہ سے گھر میں فارغ بیٹھا تھا۔ پہلا ماہ تو خیر صلح سے گزر گیا۔ اس کے بعد بیوی نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھ! نیک بخت! تو فکر نہ کر، میں نے اپنے دوستوں سے بھی کہہ رکھا ہے۔ مجھے بس آج کل میں لوکل روٹ کی ڈرائیونگ مل جائے گی۔ پر صاحب! وہ نہیں مانی اور جب ایک دن میں نے اسے بتایا کہ نوکری مل رہی۔ پیسے بھی اچھے ہیں مگر خطرناک پہاڑی روٹ ہے تو وہ جھٹ سے بولی:

''سڑکیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں رحیمے! اللہ کا نام لے اور لاری کی چابیاں پکڑ۔ سب جمع پونجی ختم ہو چکی ہے۔ تو لاری نہیں چلائے گا تو گھر کیسے چلے گا۔''

وہ پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی اور میں پتا نہیں کہاں کھویا رہا۔ اگلے دن صبح سویرے میں نے ''بارہ با نوے'' کی چابیاں پکڑیں۔ سب سے پہلے مالک کی اجازت سے اسے ورکشاپ لے گیا۔ مکینک کو دکھایا، جو جو کام نکلنا تھا وہ سب اپنی مرضی سے کرایا۔ بعد میں سروس کرائی اور اگلے دن جب ''بارہ با نوے'' کا انجن اسٹارٹ ہوا

تو صاحب! وہاں کھڑے سب ڈرائیور حیران رہ گئے۔ تب سے "بارہ بانوے" میرے ہی پاس ہے۔ ایک رات باہر آتی ہے، ایک رات گھر ہوتا ہوں۔ میری بیوی کو کوئی فکر تشویش نہیں ہے صاحب! وہ بہت خوش ہے۔ آج میری سب سے بڑی اچھائی میری اچھی تنخواہ ہے صاحب!" اور یہ کہتے ہی رحیم بخش نے بے اختیار اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "بارہ بانوے" کی چال بدل گئی۔ جیسے وہ رحیم بخش کو جھنجوڑ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد رحیم بخش سنبھل گیا تو وہ بولا:

"رحیم بخش! ان سب باتوں کے باوجود ہم ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ہمارے غم، ہماری خوشیاں سانجھی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہم زندگی گزار دیتے ہیں۔۔۔۔ کیوں؟"

"اس لیے صاحب کہ ہم ایک دوسرے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایک سیانے کی بات ہے کہ مرد اپنی عورت کا ایسے عادی ہو جاتا ہے جیسے ایک بچہ چوسنی کا۔"

وہ رحیم بخش کو دیکھتا رہ گیا۔

"تم بہت ذہین ہو رحیم بخش! تمہارے پاس ہر سوال کا جواب ہے۔"

"نہیں صاحب! یہ بات نہیں۔ میں یہ باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے محبت دیکھی ہے، محبت کی روشنی، محبت کا نور دیکھا ہے۔ اپنی ماں کے چہرے پر، اپنے باپ کے چہرے پر۔ میرا باپ ایک کسان تھا۔ جب وہ شام ڈھلے زمینوں سے واپس آتا تو میری ماں "بسم اللہ، بسم اللہ، آؤ! آؤ!" کرتے اس کے آگے بچھ جاتی۔ وہ چارپائی پر بیٹھتا تو اس کے قدموں میں آ بیٹھتی۔ اس کے جوتے اتارتی اور اس کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر تک دباتی رہتی۔ میرا باپ یہ کہتے کہتے تھک جاتا کہ "بس حلیمہ! بس کر چھوڑ دے" اور میری ماں پاؤں دباتے نہ تھکتی۔ پھر میرا باپ مجھے پکارتا۔ "او پتر رحیم بخش!" اور میں بھاگتا ہوا باپ کی چھاتی کے ساتھ چمٹ جاتا تو وہ مجھے بہت پیار کرتا۔ مجھے اپنے باپ کے جسم سے بھلی سی خوش بو آتی۔ مٹی کی خوش بو۔ تب یہی خوش بوئیں تھیں صاحب! اور یہ کہتے ہوئے رحیم بخش کا ہاتھ سٹیرنگ سے اٹھ گیا۔ وہ اپنی آنکھیں ملنے لگا تو "بارہ بانوے" ایک دم آہستہ ہو گئی۔

اگلے گاؤں میں وہ کھانے کے لیے رکے۔ اب یہاں سے شہر تک صرف دو گھنٹے کا سفر تھا۔ بس چل پڑی تو اس کے لیے نیند پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور وہ سو گیا۔ لاری اڈے پر رحیم بخش نے اسے جھنجوڑا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک بار پھر خوش گوار سفر کے لیے رحیم بخش کا شکریہ ادا کیا اور رحیم بخش کو اپنے گھر کا پتا سمجھاتے ہوئے آنے کی دعوت دی۔ بالے کنڈیکٹر نے سامان لا کر رکھا تو رحیم بخش بولا "صاحب! میری کسی بات کا برا نہ منانا۔ آپ کی بیوی یقیناً اچھی عورت ہو گی۔ وہ ہماری بھرجائی ہے۔ اسے ہمارا سلام کہنا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و سکھی رکھے۔"

گھر جاتے ہوئے وہ تمام راستے رحیم بخش کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا اس کی

خوشی میں ایک ڈر سا شامل ہوتا جا رہا تھا۔ کال بیل کا بٹن دباتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نایاب نے گیٹ کھولا تو اسے دیکھ کر خوشی وحیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ تب اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک نظر صحن اور لان کی سب چیزوں کو دیکھا۔ برآمدے سے ہوتا ہوا وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ نایاب اس کے جوتے اتارے گی۔ اس نے پاؤں ٹیبل پر رکھ دیے۔

"کیا بات ہے بہت تھک گئے ہو؟"

"ہاں! صبح سے بوٹ پہن رکھے ہیں اس لیے۔"

"تو انھیں اتار دو ناں ------ تم شوز اتارو! میں تمھیں سلیپر لا دیتی ہوں" اور یہ کہتے ہی نایاب سلیپر لینے چلی گئی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ آج وہ خود اس کے لیے چائے بنا کر لائے گی مگر جب نایاب نے ملازمہ سے چائے بنانے کا کہہ دیا تو وہ مرجھا سا گیا۔ وہ اس کیفیت سے نکلنا چاہتا تھا۔

"نایاب! میں نے تمھیں بہت مس کیا" اس نے نایاب کے قریب ہوتے ہوئے کہا تو وہ بولی؛

"رہنے دو---بناؤ مت۔ خوب لنچ، ڈنر کیے ہوں گے۔ گھومے پھرے ہو گے---کیسی جگہ تھی؟"

وہ اب اپنے آپ کو سمیٹنے کی حتمی کوشش کرتے ہوئے بولا "بھئی سرکاری آدمی تھا، سرکار نے خدمت تو کرنی تھی اور جگہ کا کیا بتاؤں۔ سمجھو جنت سے ہو کر آیا ہوں۔"

نایاب فوراً بولی "تبھی اتنے دن لگا کر آئے ہو۔ ویسے سرکار تمھیں ان دنوں کا ٹی اے، ڈی اے تو اچھا دے گی ناں؟"

وہ کچھ نہ بولا، بس مسکرا دیا۔ وہ اس سے پہلے اس طرح کبھی بھی نہیں مسکرایا تھا۔

یہ اس کی اس طرح پہلی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆☆

محمد ظہیر بدر

اشتباہِ نظر

چھے فٹ لمبا قد، صاف رنگ، چہرے پر خشخاص کی طرح داڑھی کے خال خال کالے سفید بال، آنکھوں پر نظر کی عینک، سادہ سے کپڑے، گفتگو کا دھیما انداز، یہ سب کوائف مل کر عبدالباری کے مہذب ہونے کا تاثر دیتے تھے۔ ادھر ادھر کے ہمسایوں کو چھوڑ، محلے میں اس سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی۔ ہمسایوں کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ اس کے گھر سے اس کی بیوی سے لڑائی کی آواز صرف ہم دو ہمسایوں کو بدمزہ کرتی تھی۔ ورنہ وہ ہمسائیگی کے جملہ حقوق سے بخوبی آگاہ تھا۔ شادی یا مرگ کوئی موقع خدمت کا جانے نہ دیتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرے سسر کا انتقال ہوا تو دو دن تک کھانا اس کے ہاں سے آیا گیا۔ محلے میں دو تین پلاٹ کہ جن پر ابھی مکان نہیں بنے تھے۔ وہاں پڑی واسوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ رات کو چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ وہ جب رات کو دیر گئے واپس آتا تو اپنی کار کی بتیاں گلی کا موڑ مڑتے ہی اس لیے گل کر دیتا کہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سوئے ہوؤں کی نیند میں خلل نہ ڈالے۔ اس کی وجہ سے ایک بار اندھیری گلی میں اس کی گاڑی دیوار سے بھی رگڑ کھا گئی تھی۔ مگر اس کا یہ معمول جاری رہا۔ وہ ان پڑی واسوں کو بھی اسی محلے کے باسی سمجھتا اور ان کے آرام کا بھی دیگر محلے داروں کی طرح خیال رکھتا تھا۔ مجھے اس کی سب سے بھلی بات یہ لگتی تھی کہ اس نے گلی میں کبھی اپنی کار کا ہارن نہ بجایا تھا۔ بل کہ گاڑی دروازے پر روک کر اترتا اور ڈور بیل بجاتا۔ اس کے برعکس محلے کے سب کار سوار گلی میں داخل ہوتے ہی ابا کی حویلی سمجھ کر جو ہارن پر ہاتھ رکھتے تو اٹھانا بھول جاتے۔

ایسے نفیس مزاج شخص کا اپنی بیوی کے ساتھ یہ رویہ میرے لیے الجھن اور تجسس کا باعث تھا۔ جب سے وہ اس محلے میں آئی تھی۔ آئے دن شوہر سے پٹنا اس کا معمول تھا۔ میں انیلا کے ساتھ کھل کر اظہار ہمدردی کرنے کے باوجود اس کے خاوند کی کھل کر مذمت نہ کر سکتی تھی۔ کئی بار اس سے علیک سلیک بھی ہوئی۔ میں نے کبھی بھی اس کی آنکھ میں اپنے لیے کوئی مَیل یا دعوت نہیں محسوس کی تھی۔ ہمارا اس کے گھر بھی آنا جانا تھا۔ کئی بار اکٹھے کھانے کی میز پر بھی بیٹھنا ہوا۔ اس نے کبھی کوئی چیز پکڑانے کے بہانے انگلی کے پوروں سے میرے لمس کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر لچے اور گھٹیا مردوں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ مرد کتنی ہی چالاکی اور چابکدستی دکھائے۔ عورت مرد کی آنکھ کا میل اور اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرنے میں مرد سے کئی گنا زیادہ حساس اور تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ پٹتی تو میرے ساتھ آ کر اپنا دکھ بانٹتی۔ میں نے کئی بار کہا تھا کہ اگر نبھا نہیں

ہےتو پھر اپنے خاوند سے طلاق لے لو۔ علیحدگی کی شق ازدواجی معاہدے میں اسی لیے رکھی جاتی ہے کہ فریقین کو اپنی اپنی پسند کا اختیار ہو۔ مجھے اس وقت بہت غصہ آتا، جب وہ کہتی میرے جسم پر اس کا حق ہے۔ میں پوچھتی، یہ کیسا حق ہے۔ وہ سرد آہ بھر کر کہتی۔ اب کیا بتاؤں۔ پھر کبھی سہی اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتی۔ جب وہ میرے ہاں سے اٹھتی تو نارمل ہو چکی ہوتی۔ اس کے اس رویے سے اب مجھے اس سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ میں من ہی من میں سوچتی کیسی ڈھیٹ اور کٹھور ہے۔ پڑھی لکھی ہو کر بھی جاہل اور گنوار بیویوں کی طرح شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہے۔ لعنت ہے ایسی وفا پر۔ ایک دن میں نے اپنے میاں سے کہا۔ ''یہ کیا وفا ہوئی کہ ایک شخص آپ کو تختۂ ستم بنائے رکھے اور آپ وفا کے نام پر پٹتے رہیں۔''

میرے میاں نے ہنس کر کہا۔ ''وفا تو اسی کو کہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر اسی کو وفا کہتے ہیں تو پھر میاں مجھ سے ایسی وفا کی امید نہ رکھنا۔''

وہ ہنس کر بولے۔ ''تمھارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو مجھے اسی روز یقین ہو گیا تھا۔ جب تم نے شریعت کا سہارا لے کر میرے والدین کی خدمت سے معذرت کر دی تھی''۔ مجھے یاد آ گیا کہ واقعی وہ شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے لے کر اس سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ جبکہ والدین اور ان کے دیگر بیٹے اور بہویں ان کے آبائی مکان میں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ تو گویا آج پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی اس شخص نے آج تک میری اس بات کو یاد رکھا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔ ''آپ اتنے کینہ پرور ہیں۔ اتنے سال پرانی بات آپ نے آج تک دل میں رکھی ہوئی ہے''

'' دل میں نہیں دماغ میں۔'' انھوں نے مجھے ٹوکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''۔۔ اسے کینہ نہیں کہتے اور عائلہ بیگم! کسی بات کے ردعمل کو روک لینا اور آئندہ کسی وقت کے لیے اٹھا رکھنا۔ الگ بات ہے۔ مگر کسی عمل پر ردعمل نہ دینا۔ دوسری بات۔''

''بات تو ایک ہی ہوئی نا۔'' ہماری گفتگو اب سنجیدہ بحث میں تبدیل ہو چکی تھی۔

انھوں نے کہا۔ ''ایک ہی بات کیسے ہوئی۔ کبھی تم نے محسوس کیا؟''

''مگر آپ کے دل میں ۔۔۔۔۔''

'دل میں نہیں۔' میاں نے پھر تصحیح کی۔

''دماغ میں تو ہے نا۔'' میں نے حجت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

میاں بولے۔ ''دماغ میں تو ہر چیز خود بخود اور اپنی مرضی سے رہتی ہے۔ اس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ البتہ...... انسان کسی کو معاف کرنا چاہے یا اسے نظر انداز کرنا چاہے تو اس پر اس کا اختیار ہے۔ مگر یاد رکھنا یا نہ رکھنا۔ یہ انسانی شعور کا الگ شعبہ ہے۔''

یہ تو میں بتانا بھول ہی گئی کہ میرے میاں نفسیات کے پروفیسر ہیں مگر مجھے ان کی دیگر عادتوں میں ایک

عادت جو سب سے زیادہ بھلی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس پروفیشن کو کالج کی چار دیواری ہی میں چھوڑ کر آتے ہیں۔ مگر آج یوں لگتا تھا جیسے یہ نفسیات کا مضمون ان کے ساتھ گھر چلا آیا تھا۔ ان کا لیکچر کوئی پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ دقت کی بات یہ تھی کہ مجھے قائل بھی ہونا پڑا۔ پڑھے لکھے آدمی میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ دلائل سے مان لیتا ہے۔ خیر سے میں نے بھی باٹنی میں آنرز کیا ہوا ہے مگر سائنس کا تعلق کیوں کہ جذبوں اور رویوں کے بجائے علل اور معلول اور مادی تخلیق سے ہوتا ہے اس لیے میں کوئی ٹھوس دلیل دے کر اپنا دفاع کرنے سے قاصر تھی، بل کہ آج جو انھوں نے بات کی تو مجھے بہت سے ایسے واقعات یاد آ گئے کہ جب انھوں نے میرے والدین کی اخلاقی اور مالی مدد کی۔ میرے میکے کے متعدد کاموں میں ان کا اثر اور رسوخ اور رابطے کام آئے۔ جہاں کہیں میرے میکے میں میری ضرورت پڑی انھوں نے، میری طرح، کبھی بھی شریعت کا سہارا لے کر یہ نہیں کہا کہ شادی کے بعد عورت پر صرف اس کے شوہر کا حق ہوتا ہے۔ پھر میں کیسے نہ ہارتی، کیسے نہ قائل ہوتی۔ بل کہ مجھا پنے کہے ہوئے پر آج شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ انھوں نے مجھے کبھی بھی میرے سسرال جانے پر مجبور نہیں کیا۔ بل کہ ہمیشہ تحریک میری طرف ہی سے ہوئی۔ چند ایک مرتبہ میں نے اس بات کا گلہ بھی کیا کہ کبھی کسی نے مجھے آنے کی دعوت نہیں دی۔ اس پر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تمھیں کسی نے منع بھی تو نہیں کیا۔ تمھاری تواضع میں کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی۔ جب تمھاری مرضی جاؤ۔

اس رات میں کافی دیر تک آنکھیں بند کر کے لیٹی اپنی ازدواجی زندگی کا روزنامچہ پڑھتی رہی۔ کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا جب مجھے پیاس لگی۔ میں بستر سے اٹھی۔ برابر میں وہ میری سوچوں سے بے نیاز گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے ان کے پورے وجود پر ایک عقیدت بھری نگاہ ڈالی، سپردگی کے ساتھ آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ آج کتنے برسوں بعد، شاید زندگی میں پہلی بار، میں اس اطمینان بخش سپردگی کے ساتھ ان کے ساتھ لیٹی تھی۔ پہلی رات کے احساس سے آج کی رات کے احساس تک کا سفر پندرہ سال میں طے ہوا تھا۔ معاف کیجیے گا۔ میں انیلا کی کہانی کے درمیان آپ کو اپنے ازدواجی حالات بتانے لگ گئی۔ باتونی مردوں کی طرح ہم اکثر عورتوں کی بھی یہ عادت ہوتی ہے کہ بات بے بات اپنے ذاتی تجربوں سے مخاطب کو بور کرتی رہتی ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے واقعات کے پیچھے راوی کی کوئی نہ کوئی تسکین ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہے۔ اپنے میاں کے برتاؤ کا ذکر کر کے دراصل اپنی ازدواجی زندگی میں مجھے بھی ایک گونہ احساس برتری حاصل ہو رہا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی انیلا کی۔ پھر ایک بار انیلا کی حالتِ زار دیکھ کر میرا دل پسیجا تو میرے اصرار پر میرے میاں نے انیلا کے خاوند سے بات کرنے کی ہامی بھر لی کیوں کہ ان کی آپس میں اچھی یاد اللہ تھی۔ میں نے انیلا کو بتایا مگر انیلا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ذہن میں مشرقی، وفا شعار، صابر اور معاملہ فہم بیوی کا جو تصور تھا۔ وہ ہو بہو اس کی تصویر تھی۔ جو ستم سہتی ہے مگر اس پر بھی مطمئن رہتی ہے، یہ سوچ کر کہ چلو اس ستم پر اس

کا مجازی خدا تو خوش ہے۔ وہ بہر حال اس کی خوشی کو مقدم رکھتی ہے۔ میں اب اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ یہ جملہ میں نے آج پہلی بار انیلا کے منہ سے سنا تھا۔ اس کے ماتھے پر ضرب کا تازہ نشان تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ پر خون جما ہوا تھا۔ اس کے شوہر نے آج پھر اسے پیٹا تھا۔ مگر آج وہ خود کہہ رہی تھی کہ اب سمجھنے سمجھانے کا وقت لد گیا آج اس نے میری بیٹی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔'' آج اس کا لہجہ پہلے جیسا شکستہ نہیں غصیلہ تھا۔

''ہاتھ!! تمھاری بیٹی پر؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں؟'' مجھے افسوس اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

''فرانس کا ایک ڈنر سیٹ تھا۔ اس کی ایک پلیٹ کہیں صفائی کرتے ہوئے ٹوٹ گئی۔ بس وہیں اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میرے ہاتھ میں کفگیر تھا میں نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے مارا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ خبردار جو میری بیٹی پر آئندہ ہاتھ اٹھایا تو۔ میں گرجی۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ادھر میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ کہے بغیر بازو دبا کر باہر نکل گیا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی۔ تو میں نے کہا۔ ''انیلا، لگتا ہے تمھارے برے دن ختم ہو گئے۔'' وہ جواب میں لمبی سانس لے کر آہستہ سے بولی۔ اسی لیے میں نے تمھیں کہا ہے نا کہ اب سمجھنے کا وقت لد گیا۔ اب مجھے طلاق چاہیے ورنہ میں اس سے خلع لے لوں گی۔ کیوں کہ اب وہ مجھ پر جو ظلم کرے گا وہ شاید مجھ سے تو برداشت ہو جائے مگر میرے والدین شاید اسے برداشت نہ کر سکیں۔''

''تمھارے والدین؟'' مجھے اس کی یہ منطق سمجھ نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''بات یہ ہے کہ آج تک اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا۔ اس کا ذمہ دار میں اپنے والدین کو سمجھتی تھی۔ کیوں کہ میری شادی کے وقت انھوں نے نکاح نامے کی جو نکیل اس کے ناک میں ڈالی تھی۔ یہ سب اسی کی جھنجھلاہٹ تھی۔''

''نکاح نامے کی نکیل؟ میں سمجھی نہیں!'' وہ عجیب سی مبہم سی باتیں کر رہی تھی۔ آج وہ مجھے پر اسراری لگ رہی تھی۔ میری بات سن کر اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''دراصل میرے والدین نے میرے ساتھ اس کا نکاح نہیں کیا تھا۔ مل کر میرا سودا کیا تھا۔''

''سودا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! میرا حق مہر پانچ لاکھ روپیہ، بیس ہزار ماہوار خرچہ اور دو لاکھ کے زیور ہبہ اس کے علاوہ ان کا دس مرلے کا موروثی مکان بھی میرے نام۔''

''اچھا!'' میری حیرانی اور بڑھ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''شادی کی رات ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے جنس کے دام زیادہ دے دیے ہیں۔ بس اسی احساس زیاں نے اسے وحشی بنا دیا ہے۔ وہ جب مجھے دیکھتا ہے

اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔''

''دھوکا؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔''

''ہاں، دھوکا، ستا مال اسے مہنگے میں بیچا گیا تھا۔ دراصل۔ دراصل میں شادی سے پہلے ہی۔۔۔'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اوہ! اب میں سمجھی تو گویا اسی لیے وہ تمھیں پیٹتا ہے۔ کیا اسے پتہ تھا؟'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''شاید، مگر اس نے مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ البتہ اس کے رویے سے لگتا تھا کہ وہ جان گیا ہے۔ مگر مجھے وہ پیٹتا، برا نہیں لگتا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ میرے والدین نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے مہنگا بیچ دیا تھا۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ وہ جب مجھے مارتا تو میں جا کر اپنے امی ابو کو بتاتی۔ ان کے چہرے پر دکھ اور کرب دیکھ کر میرے اندر کسی جذبے کو اطمینان ملتا۔ کیوں کہ اپنے لیے دکھ کی یہ فصل انھوں نے خود ہی بوئی تھی۔ سو یہ فصل انہی کو کاٹنا تھی۔ مگر مجھے ان کے دکھ کی نوعیت اور شدت کا اندازہ اس وقت نہیں ہوا جب تک اس نے میری بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ مگر عائلہ! شاید اب میں اس کی مار تو برداشت کرلوں مگر وہ کرب نہ برداشت کر سکوں جو میرے والدین کو ہوتا ہے۔ اب اس کا ہاتھ کھل گیا ہے میری بیٹی پر بھی۔'' میں نے کہا۔ ''تمھارا ہاتھ بھی تو اس پر اٹھ گیا ہے نا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اب وہ تم پر بھی ہاتھ اٹھانے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا۔'' اس نے میری دلیل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔''

''وہ کیا، کیا سوچ لیا ہے۔''

''یہی کہ عبدالباری سے طلاق لے لوں'' اس نے بڑے نارمل لہجے میں کہا۔ ''اب میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے بڑے تیقن سے اپنا ارادہ بتا دیا۔

''اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو۔'' میں نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔

''کرے گا، کیوں نہیں کرے گا۔ نکاح نامے کی ایک شق جو اس کی مرضی سے شامل کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ میں پانچ سال تک اس سے طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ بصورت دیگر حق مہر کی رقم اور مکان مجھے واپس کرنا پڑے گا۔ تین دن پہلے یہ پانچ سال پورے ہو گئے ہیں اور...... یہ واقعہ پیش آ گیا۔

کئی ماہ سے میرے ذہن میں بندھی ہوئی تمام گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی گئیں۔ میرے سامنے ایک مظلوم، بے بس ماں اور وفا شعار بیوی کے بجائے ایک شاطر اور کامیاب بزنس پرسن بیٹھی ہوئی تھی۔ اُف میرے اللہ اس قدر اشتباہِ نظر! ...... وہ جب بھی پٹ کر میرے پاس آتی۔ کئی کئی دن تک اس پر ہونے والا ظلم مجھے بے چین رکھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا کہ سارے شوہر ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اگر میرا شوہر ایسا نہیں تو کل کو ضرور ایسا ہو جائے گا۔ میں نے اس کی یہ بے باک باتیں سن کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے ایک مکار مسکراہٹ کی جھلک رہی تھی۔ میں نے بددلی سے کہا۔ تم طلاق لے کر کیا کرو گی۔ اس نے بڑے اعتماد

سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اشرف ......“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ”اشرف ...... یہ اشرف کون ہے؟‘ میں نے یہ نام پہلی بار اس کے منہ سے سنا تھا۔ ”دراصل میری آپا کی شادی کے لیے اس کے سسرال والوں نے کار کا تقاضا کر رکھا تھا۔ اماں ابا کی نیندیں حرام تھیں۔ بات بے بات ہم بہنوں کو پیٹتے اور کوستے۔ اسی دوران ابا کے دفتر میں ان کے افسر عبدالباری نے مجھے کہیں دیکھا تو لٹو ہو گئے۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باعث انھوں کسی نوجوان لڑکی کا رشتہ نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے شادی کا ارادہ اور بھاری رقم کی پیش کش کی تو ابا نے غنیمت جانا۔ میری نسبت میرے کزن، اشرف سے طے تھی اور میں اس سے بے پناہ پیار بھی کرتی تھی۔ ہم محبت میں اتنا آگے جا چکے تھے کہ میں اس سے دوری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں ڈٹ گئی اور گھر والوں کو صاف صاف کہہ دیا۔ اماں نے بہت منایا۔ ابا نے پیٹا مگر میں نہ مانی۔ اماں سینے پر دوہتڑ مار کر کہا، ہائے تم پیدا کیوں ہوئیں۔ ہائے ہائے تم پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی۔ میں ٹس سے مس نہ ہوئی مگر جب اماں نے زہر کھانے کی دھمکی دی تو میں نے کہہ دیا کہ اگر اشرف کہہ دے تو ...... ابا معاملہ فہم تھے انھوں نے یہ سارا دکھڑا اشرف کو جا سنایا۔ اشرف بھی ابا سے جذباتی طور پر بلیک میل ہو گیا۔ اس نے اپنے والدین کے سامنے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔ اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں جب آخری بار اسے ملی تو اس نے کہا تھا۔ اگر کبھی زندگی میں ضرورت پڑی تو سب سے پہلے مجھے آواز دینا۔“

انیلا کی کہانی کوئی نئی کہانی نہیں تھی۔ والدین کا اولاد سے اس کو جننے اور پالنے کی قیمت کسی نہ کسی صورت میں وصول کرنا تو ہمارے پسماندہ معاشرے کا معمول ہے۔ میں نے اس کی کہانی سن کر تاسف سے کہا۔

”مگر انیلا تم اب ایک بیٹی کی ماں ہو!“

انیلا نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میری بیٹی کا باپ کون ہے؟ یہ سن کر میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے اس سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اس کا جواب صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆☆

جانِ عالم

برگد، مسرت اور روتی ہوئی نظم

فون کی پہلی گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''کون۔؟'' دوسری طرف سے ایک سپاٹ نسوانی آواز نے پوچھا۔

''جان۔!'' میں نے کہا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''آجائیں۔'' میں نے کچھ جانے بنا کہہ دیا۔

''کب۔؟''

''جب آپ چاہیں۔''

''ٹھیک۔'' دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

''کیا میں اندر آسکتی ہوں؟''

''جی۔!''

''میں مسرت ہوں۔'' اُس نے اجڑی ہوئی خوبصورت آنکھوں سے اپنے نام پر طنز کیا۔ اُس کے چہرے پر آنکھیں، شام کے دریچے پر چراغ کی اُداس لو کی طرح تھیں اور مجھے شام ہمیشہ سے اداس کرتی رہی ہے۔

''میں۔ جان۔!'' میں نے اُسے خود سے ملایا۔

''میں جانتی ہوں تمھیں۔

میں پچھلے پانچ سال سے تمھیں جانتی ہوں۔

تمھارے لفظوں میں بڑی طاقت ہے۔ تمھارے لفظ مجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔ لفظوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

''ہاں۔!'' میں اتنا ہی کہہ پایا۔

''تم اپنے لفظوں کی طرح ہو۔ خوبصورت۔ تمھیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ لفظ کائنات ہے اور تمھارے پاس کائناتیں ہیں۔''

میں اس کے لفظوں کی طاقت میں اپنی ساری کائنات سمیت بہنے لگا۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

''زندگی میں بہت سی باتیں پہلی بار ہوتی ہیں لیکن ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے یہ پہلے ہو چکی ہیں۔ جیسے۔۔۔جیسے۔۔۔میرا یہاں آنا پہلی بار نہ ہو۔ کیا تم نے بھی ایسا محسوس کیا ہے؟''

اُس نے جب مجھ سے پوچھا تو مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے مجھ سے پہلے بھی کئی بار یہ سوال کیا ہے۔

''ہاں۔! میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ میں جس پتھر کے پاس بیٹھا کرتی ہوں وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ جب میں اُٹھ کر جاتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے اُس نے مجھے روکا ہو۔ ہو سکتا ہے میں پہلے کوئی پتھر تھی جو اس پتھر کے ساتھ یہیں پڑا رہا۔ اور یہ۔۔۔یہ مجھے اُس وقت سے جانتا ہو۔ تم آواگون میں یقین رکھتے ہو؟'' اچانک وہ پانچ ہزار سال پیچھے جا پہنچی۔

''ہم دو جنم پر یقین رکھتے ہیں۔ پیدائش کے بعد اور مرنے کے بعد کا جنم۔''

دو جنم تو ہم سب کو نظر آتے ہیں۔ ہوا، نہ ہوا۔ کون جانے دو سے پہلے کتنے جنم ہو چکے ہوں۔ پانی۔۔!۔۔ملے گا؟'' وہ حال میں آ گئی۔

''ہاں۔۔۔کیوں نہیں۔''

''دُنیا صرف آوازیں اور آوازوں کا سفر ہے۔ لہریں۔۔۔اور لہروں پر سوار آوازیں۔

چیزوں کو اُن کے جسم کے باہر سے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اُن کے اندر عقل جھانکتی ہے۔ اور ہم نے زندگی جینا ہے تجربہ نہیں کرنا۔ ہم نے اندر نہیں جھانکنا۔

یہ۔۔۔یہ ٹھنڈے پانی کا گلاس۔۔۔اس کی بیرونی سطح پر قطروں کی چادر۔۔۔پانی پینے سے زیادہ مجھے اس شفاف چادر کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔۔۔میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ پانی باہر کیسے آیا۔۔۔!'' وہ بولے جا رہی تھی۔

''مجھے وجود کے زاویوں سے کیوں دیکھتے ہو......؟؟ میرے لیے تم روح کی آنکھ بن جاؤ جو وجود سے

بے نیاز ہوتی ہے۔ جو پلکوں، پپوٹوں اور ابروؤں سے آزاد ہوتی ہے۔۔۔۔!!''

اچانک کمرہ برگد بن گیا۔ اُس کے چہرے کا گوشت اُڑنے لگا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے گوتم بن گئی۔

''ضرورت کیا ہے؟'' میں اچانک کسی بھکشو کی طرح گوتم سے سوال کر بیٹھا۔

''ضرورت! ضرورت سے نجات کا نام ہے۔'' گوتم کی آواز اُس کے پیٹ کے خالی گنبد سے گونجتی ہوئی میری سماعت تک آئی تو میری بھوک مرنے لگی۔

''ضرورت ہے کہ ہم ضرورتوں سے نکل جائیں۔ خالی ہو جائیں۔ خالی ہو جانا، سب سے مشکل کام ہے۔ اور خالی ہوئے بغیر تم میں کچھ بھی نہیں سما سکتا۔

نروان۔۔۔ خالی ہونا ہے۔۔۔ اس احساس سے بھی خالی کہ تم خالی ہو۔۔۔ اور اُسی لمحے تم بھر جاتے ہو۔۔۔ مسرت سے۔۔۔ خوشی سے۔۔۔ اور یہی زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے۔''

میں اندر سے خالی ہونے لگا۔۔۔ مسرت میرے اندر داخل ہو رہی تھی۔۔۔ ایک خوشی۔۔۔ میرے اندر جڑیں پھیلا رہی تھی۔۔۔ میری بھوک مٹنے لگی۔۔۔ مکان۔۔۔ دفتر۔۔۔ بازار گرنے لگے۔۔۔ اور میرے چہرے کا گوشت گلنے لگا۔

''نہیں۔۔۔۔!!!!!

میری آواز کے ارتعاش سے برگد گر پڑا۔ کمرے کا ملبہ اُٹھ کر دیواریں بنانے لگا اور دوسرے لمحے وہ اپنے چہرے پر گوشت اُگائے میرے سامنے آ بیٹھی۔

''کوئی نظم سناؤ۔۔۔ جو اِس وقت کی خوشی کو روک لے۔۔۔!!'' ہاں وہ نظم سناؤ۔۔۔ ''وہ ایک لمحہ۔۔۔'' تمھاری یہ نظم کئی بار میرے ساتھ روئی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ تم نے کس ملاقات میں اس نظم کو جنم دیا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ تم نے یہ نظم مجھے کسی پہلے جنم میں سنائی ہے۔ اور یہ نظم تم نے میرے لیے لکھی ہے۔''

میں نے نظم شروع کی:

وہ ایک لمحہ، جو ایک لمحے کو رک گیا تھا
(وقت رکنے لگا۔ بازار، کمرہ، دفتر، دیواریں گرنے لگیں۔ اور برگد کا درخت پھر اُگنے لگا)
وہ ایک لمحہ، جو ایک لمحے کو رک گیا تھا

وہ ایک لمحہ، کہ جس نے دونوں کے جسم تک بھی اُتار پھینکے
برہنہ روحیں، صداؤں کے چیتھڑوں سے، جسموں کو ڈھانپتی تھیں
وہ کرسیوں پر جو ایستادہ وجود تھے، بے وجود تھے وہ
وہ ایک لمحہ جو ایک لمحے کو رُک گیا تھا، وہ کہہ رہا تھا
”میں وقت کو اور کتنا روکوں؟
کہو نا کہنا ہے جو بھی تم نے“
مگر وہ چپ تھے، وہ کیسے کہتے
کہ کہکشاؤں کے راستے میں دیے جلانے کا کیا سبب ہے
وہ کیسے کہتے، کہ کرسیوں پر وجود جو بے وجود ہیں، خوشبو ہیں وہ
وہ ایک لمحہ جو ایک لمحے کو رک گیا، کائنات ہے وہ
وہ ایک لمحہ کہ جس نے دونوں کے جسم تک بھی اُتار پھینکے، لباس ہے وہ
وہ کیسے کہتے۔
وہ ایک لمحے میں کیسے کہتے۔!

نظم نے آخری ہچکی لی تو اُداسی نے بین کرنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں سے دکھ بہنے لگا۔ میں نے نظم کو چپ کرایا تو وہ اپنی آنکھوں کو دلاسہ دینے لگی۔

”یہ خوشی ہے ۔۔۔ اپنے مدار میں آنے کی ۔۔۔ خلاؤں کے سفر کی تیاری میں ہمسفر ملنے کی۔ میں اس لمحے کی مسرت کو لے کر جا رہی ہوں۔“

وہ اچانک اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ شاید میں اُسے پہلے بھی مل چکا تھا۔

☆☆☆☆

سعدیہ

دشتِ تنہائی

خوبصورتی کی دلدادہ اللہ رکھی گاؤں کی گوریوں کے برعکس زندگی کو اُس کی تمام تر مشکلات کے باوجود زندہ دلی سے بسر کرنے پر یقین رکھتی تھی۔ کسی جبر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھتے جانا اور اپنے ہدف کو پا لینا اُس کا ایمان تھا۔ اپنے قرب و جوار کی پروا کیے بغیر وہ اپنی ڈگر پہ چلتی جا رہی تھی۔ اماں کی طبیعت ناساز ہوتی تو ناصرف دوا دارو سے اس کی سیوا کرتی بل کہ گھر کے تمام کاج بھی سنبھال لیتی اور ابا کا کھانا لے کر کھیتوں میں پہنچ جاتی۔ اور جو کبھی ابا کو موسمی کس چڑھ جاتی تو اُس کے ساتھ کھیتوں میں کام کروانے لگتی، بیلوں کی جوڑی کو ہانکتے ہوئے ہل کی ہتھی پکڑتی اور پھل پہ سوار ہو جاتی، کیاریاں بنانے میں باپ کی مدد کرتی، سبزی کی کیاریوں میں اُگی فالتو بوٹی کو اُکھاڑ کر پھینکتی اور بوقتِ ضرورت کیڑے مار زہر چھڑکتی۔ اپنی دُھن میں مست اپنے حال میں خوش سب کی خدمت پہ مامور اللہ رکھی کی اگر کوئی کمزوری تھی تو وہ طلوعِ آفتاب کا نظارہ تھا۔ ہر روز ایک نیا سورج اُس کے ارادوں کو تقویت بخشتا۔ اندھیرے کی دیوار کو آہستہ آہستہ گراتا ہوا نومولود سورج اُسے اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے خودسر بچے کی طرح لگتا جس کے سامنے اندھیرے کی کوئی تاویل کامیاب نہ ہو پاتی اور وہ چاروں اور روشنی پھیلاتے ہوئے اُسے ملیامیٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اُسے اندھیرے میں سے اُجالا پھوٹتے دیکھنا مرغوب تھا جس لطف کو پانے کی خاطر وہ صبحِ کاذب سے پہلے چھت پر چڑھ جاتی اور مشرق کی جانب بادلوں کے دھندلکے میں اُسے ڈھونڈنے لگتی۔ اب تو اُسے یوں لگتا جیسے سورج بھی اُس کے شوق کو پا چکا تھا اور جوں ہی بادلوں کی اوٹ سے سر باہر نکالتا تو پہلی نظر اُس پر پڑتے ہی کھل اُٹھتا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے چڑھتے سورج کے سواگت کے لیے اُوپر چھت پہ جانا پڑتا۔ وہ سوچتی: بادلوں کا سینہ چیر کر سورج جب نمودار ہوگا تو اُسے سامنے نہ پا کر دکھی ہو جائے گا۔ شاید وہ اُس دن اپنی روشنی اور حرارت بھی بے لوث نہ لٹا سکے گا! کبھی کبھی وہ اپنے کمرے میں ایسی کھڑکی کی خواہش کرتی جو اس کے پُرلطف شوق کی تسکین کر سکے جہاں سورج کی کرنیں اُس کے کمرے میں گھس کر اُس پہ اپنا حق جتائیں اور اندھیرے کو چلتا کریں اور وہ بستر میں نیم دراز کسلمندی سے اندھیرے کی اُجالے کے خلاف شکست خوردہ مزاحمت سے حظ اُٹھاتے ہوئے ایک نئی فتح سے سرشار دن کا آغاز کرے۔ جب اُسے والدین کے گھر یہ خواہش پوری ہوتی

نظر نہ آئی تو ہر لڑکی کی طرح مستقبل سے اُمید وابستہ کرتے ہوئے اَن دیکھے محبوب کے سپنے دیکھنے لگی جس کے طفیل ہر صبح طلوعِ آفتاب ایک نئی داستان کا اختتامیہ ہوتا۔

گزرتے ہوئے وقت کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر جہاں دن صدیوں سے لمبے ہوئے وہاں اللہ رکھی نے کئی صدیاں بِتا دیں۔ وہ کڑے حالات کی زنجیروں میں ایسی اُلجھی کہ خود کو ہی بھلا بیٹھی۔ فکرِ معاش اور بچوں کی لمبی قطار نے اُسے دنیا جہاں سے بیگانہ کر دیا۔ گھر داری میں ایسی کھُبی کہ ہوش ہی نہ رہا، کب بے رحم وقت اُس کی زندگی کے بہترین سال نگل گیا۔ ہوش میں اُس وقت آئی جب بڑا بیٹا اور بہو اُسے نیا گھر دکھانے کے بعد کونے والے کمرے میں پہنچتے ہوئے بولے، "ماں جی یہ آپ کا کمرہ ہے، تھوڑا بڑا ہے ساتھ کچھ فالتو سامان بھی رکھا جا سکے گا۔" اس نے مشرق کی جانب کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھ کر آبدیدہ ہوتے ہوئے استفہامیہ نظر سے بیٹے کو دیکھا جسے فوراً اُچکتے ہوئے بہو بولی، "ابا جی گیراج کے ساتھ والے کمرے میں رہیں گے اس طرح گیٹ پر بھی نظر رہے گی اُن کی۔ ویسے بھی اُن کا زیادہ وقت تو گھر سے باہر ہی گزرتا ہے اکثر مغرب کے بعد ہی لوٹتے ہیں۔" کب وہ دونوں وہاں سے گئے گم سُم اللہ رکھی جان نہ سکی البتہ اُس کے کانوں میں دور ہوتی ہوئی ایک آواز ٹکرائی، "آپ کیوں ناراض ہو رہے ہیں ابا جی اور اماں جی کی ایک کمرے میں ساتھ رہنے والی عمر گزر چکی ہے وہ کسی اور وجہ سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔" یہ سب سننے کے باوجود وہ کم سِن اللہ رکھی کو انگڑائی لے کر بیدار ہونے سے نہ روک سکی جو کسی نوبیاہتا کی طرح رات اور مرغوب احمد کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ پہلی دفعہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے پھوٹتی صبح اُس کے ساتھ دیکھ سکے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اتنے سال نظر انداز کیے جانے کے باوجود اُس کے سپنے نے دم نہیں توڑا بلکہ پوری بےتابی کے ساتھ تعبیر پانے کا منتظر تھا۔ وقت کی چرخی اُسے اُلٹے چکر میں گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس کا کمزور ناتواں جسم تن گیا اور خون رگوں میں تیز دوڑنے لگا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر مرغوب احمد کا انتظار کر رہی تھی کہ اُس کے کمرے میں تو صرف ایک ہی پلنگ بچھایا گیا تھا یعنی بوڑھے ماں باپ کے لیے سانجھے کمرے کو معیوب سمجھا گیا یا پھر اُن دونوں کو الگ الگ کونوں میں کمرے دے کر اپنے تئیں اُنھیں انفرادی اور ذاتی زندگی فراہم کی گئی تھی۔ بہر حال جو بھی ہو اللہ رکھی کو اپنے اور مرغوب احمد کے درمیان پَر نہ ہونے والی خلیج نظر آنے لگی جس میں اسے کمرہ ایک کٹھن سفر کے بعد خشک پیڑ کے سائبان جیسا لگا۔ اُس نے سوچا: کیا اسی سائے کے لیے وہ عمر بھر دھوپ میں کھڑی رہی؟ کیا زندگی کا صرف وہی حصہ اپنا تھا جو بچوں کی پرورش کی نذر ہوا اور جن کی ضروریات کے پیشِ نظر اپنے تمام ارمانوں کا گلہ گھونٹا گیا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اولاد کا فیصلہ ٹھیک ہو، عورت کے خلاف ماں نے آواز اُٹھائی کیوں کہ عمر کے اس حصے میں مرد و عورت کی مصروفیات اکثر بدل جاتی ہیں۔ جیسا

کہ عورت گھر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی اپنا فرض سمجھتی ہے جو بسا اوقات گھریلو چپقلش کا باعث ہوتی جس سے مرد اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے گھر سے باہر وقت گزارنے کو ترجیح دیتا۔ تاہم اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں بھی کوئی ٹوک جھونک کی نوبت آئے بچوں نے پہلے ہی قدم اُٹھا لیا۔ ایک عورت اور ماں میں بحث ہوتی رہی۔ ماں بچوں کی وکالت کرتے ہوئے عورت کو مات دینے پہ تُلی ہوئی تھی جب کہ عورت گم گشتہ ماہ و سال کی دھول میں سے اپنا وجود ٹٹولتی رہی۔ جہاں اُس کا ہاتھ مرغوب احمد کے ہاتھ میں تھا اور اُن دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ اُن دونوں نے مل کر چاہتوں سے لبریز ایسی بھرپور زندگی گزاری کہ کبھی پیچھے رہ جانے والوں کی کمی محسوس نہ کی۔ چھتیس سال پہلے نوبیاہتا اللہ رکھی نے جب تقسیم میں اپنا خطۂ زمین چھوڑنے کی خواہش ظاہر کی تو اُس وقت صرف مرغوب احمد ہی تھا جس نے اُس کی خواہش کے احترام میں نہ صرف اپنے خان دان کے سامنے علمِ بغاوت بلند کیا بل کہ گھر اور خاندان کے ساتھ زمین جائداد کو بھی لات مار کر اللہ رکھی کے ساتھ ہو لیا۔

خاندان چھوڑنے سے جو خلا پیدا ہوا اُسے یکے بعد دیگرے بچوں نے پورا کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بچے ہم پر شک کر رہے ہوں؟ اُس کے منتشر ذہن میں ایک نیا وسوسہ اُبھرا جس نے اللہ رکھی کا اعتماد سلب کر دیا۔ اُسے ایک عجیب سی جھجک نے گھیر لیا۔ بچے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم دونوں کون ہیں؟ ملک کے نام پر ہجرت کرنے والے محبِ وطن یا بھگوڑے؟ ہمارا رشتہ کیا ہے؟ کیا ہم واقعی کسی مقدس بندھن میں بندھے ہوئے ہیں یا دنیا سے چھپ کر کوئی بھیس بدلے بیٹھے ہیں؟ اللہ رکھی کے ذہن میں نئے نئے شکوک و شبہات آنے لگے۔ اُسے اپنے اور مرغوب احمد کے رشتے پہ شک ہونے لگا۔ اُس نے سوچا: جب مرغوب احمد اُس کا ہاتھ تھامے اُسے سرحد پار کروا رہا تھا تو وہ کس قدر خوش و شادمان تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تاریک شب کے تاروں کی سی جھلملاہٹ لیے ڈھیروں خواب تھے جن کی تعبیر کی کھوج میں وہ آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اپنے خاندانوں سمیت ہجرت کرنے والے قافلوں نے اِس اکلوتے نوجوان جوڑے سے کوئی سوال نہیں کیا تھا صرف بغور اُن کا جائزہ لینے پر اکتفا کرتے رہے جس سے اللہ رکھی بالکل کسی چھوئی موئی کی طرح سمٹتے ہوئے مرغوب احمد کے اتنا قریب ہو جاتی کہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ آج اُسے اُن تمام نظروں میں چھپے سوال کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ کیا وہ سب لوگ بھی ہمارے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے تھے؟ کیا ایک معصوم خواب کی تعبیر پانے کی چاہ میں اُس نے اپنا کردار سوالیہ بنا لیا تھا؟ اُسے پیروں تلے بچھی زمین اور سر پہ تنا ہوا آسمان اجنبی لگنے لگے۔ اُسے ملک چھوڑنے جیسے بڑے فیصلے کے خلاف ماں کی پُر اُمید ملتجی نگاہیں اور تنبیہیں یاد آنے لگیں۔ جن کو روندتے ہوئے اُس نے اپنے فیصلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس

کی اُنھیں بڑی قیمت چکانی پڑی۔ مرغوب احمد نے جس کا شمار امرتسر کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا جب اللہ رکھی کے ساتھ سرحد پار کی تو خالی ہاتھ تھا۔ اُس کے باپ کو جو لگ بھگ سات سو ایکڑ کا مالک تھا، اپنی مٹی سے اُنسیت تھی یا ملکیت کا زعم کہ اُس نے اپنے مذہب کی خاطر باپ دادا کی زمین چھوڑ کر مہاجر ہونے پر اپنا مذہب چھوڑ کر اپنے پُرکھوں کا مذہب اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ مرغوب احمد کے بھائیوں نے بھی باپ کے فیصلے کی تقلید کی، جب کہ اللہ رکھی جس کی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، پاکستان جانا چاہتی تھی۔ وہ اُس تصوراتی دھرتی پہ قدم رکھنا اور وہاں عمر بِتانا چاہتی تھی جس میں مثالی طرزِ زندگی کے خواب دکھائے جا رہے تھے۔ مرغوب احمد نے اُس کی چاہ کو پانے کی خاطر باپ سمیت خاندان والوں کی مخالفت مول لیتے ہوئے سرحد پار کر لی جس کے عوض اُسے اپنے حصے کی جائیداد اور اللہ رکھی کو اپنی وراثت سے محروم ہونا پڑا۔ البتہ قسمت نے اُنھیں کسی مالی آزمائش میں ڈالے بغیر اُن کا نام اُن چند خوش نصیبوں میں لکھ دیا جنھیں ہر لحاظ سے موزوں قابلِ کاشت علاقے میں وسیع رقبہ الاٹ ہوا۔ وہ دونوں محنتی لوگ تھے، گو اُنھوں نے زندگی میں کبھی باقاعدہ مشقت تو نہیں کی تھی البتہ کاشت کاری کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کھیتی باڑی سے گھبرائے نہیں مل کر عام کسان کی طرح دن بھر کسی اور کھرپا چلانے لگے۔ خوب محنت کرتے، اچھا معاوضہ پاتے اور سکھی جیون بِتاتے۔ کبھی کبھی اُنھیں امرتسر کی یاد بھی ستاتی پر وہ اپنے فیصلے پر شرمندہ نہ ہوتے۔ اللہ رکھی گھر کے کام نمٹانے کے بعد کھیتوں کا رُخ کرتی اور مرغوب احمد کے کام میں برابر اُس کا ہاتھ بٹاتی اور شام کو زیتون کے تیل سے اُس کے پیروں کا مساج کرتے ہوئے دن بھر کی تمام تھکن رفو کر دیتی جس سے وہ ایک دم خود کو ہلکا پھلکا اور توانا محسوس کرنے لگتا۔ زندگی کے کٹھن شب و روز یوں ہی پُرسکون گزرتے رہے کہ اُن کا خاندان دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے مکمل ہو گیا مگر اللہ رکھی کے معمولات نہ بدلے۔ وہ اب بھی کھیتی باڑی میں مرغوب احمد کی مدد کرتی اور شام کو اُس کے پیروں پہ زیتون کے تیل سے مساج کرنا کبھی نہ بھولتی۔ وہ بھی مساج کا ایسا عادی تھا کہ بغیر مساج کے اُسے نیند ہی نہ آتی۔ اگر کبھی دونوں کے درمیان کوئی چھوٹی موٹی ناراضی ہو جاتی اور اللہ رکھی اُس شام بغیر مساج کیے اپنے بستر پہ چلی جاتی تو مرغوب احمد رات دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا کہ اللہ رکھی روٹھے ہوئے انداز سے تیل والی بوتل اُٹھاتی اور چند گلے شکووں کے بعد وہ پھر سے گھی شکر ہو جاتے۔ اللہ رکھی کو مرغوب احمد کی خوراک کا بھی خیال ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ کس چیز کو کھانے سے مرغوب احمد کا پیٹ خراب ہو جاتا اور کیا کھانے سے اُس کے معدے میں جلن ہونے لگتی، نہ صرف اتنا بل کہ وہ ان کے توڑ بھی جانتی اور جب کبھی بدپرہیزی ہو جاتی تو وہ فوراً مختلف پھکیوں سے مسئلہ حل کر دیتی۔

اب عمر کے اس حصے میں الگ رہنے سے نہ تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات آپس میں بانٹ سکتے

اور نہ بیتے دنوں کی یاد سے دل بہلا سکتے تھے، مل کر آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہونے لگے تھے۔ اللہ رکھی چُپ چاپ نظریں جھکائے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی دن گزار دیتی، کب سورج نکل کر ڈوب جاتا اُسے خبر ہی نہ ہوتی۔ اُس کے برعکس مرغوب احمد دن کا بیشتر حصہ گھر سے باہر گزارنے لگا، جب کہ شام کو اُس کے پیروں کو مساج کی اشد ضرورت محسوس ہوتی جس کے پورا نہ ہونے پر وہ راتوں کو اکثر جاگتا رہتا۔ چند ہی راتوں کی بے آرامی اور کم خوابی سے اس کی صحت گرنے لگی اور وہ کمزور اور بوڑھا نظر آنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے گرد حلقوں اور خم کھاتی کمر کو اللہ رکھی کے علاوہ کسی نے محسوس نہ کیا۔ جو ہمیشہ کی طرح اُس کی ناتوانی کی وجہ کو پا گئی اور ایک رات کو جب تمام گھر والے سو گئے تو وہ چپکے سے زیتون کے تیل کی بوتل اُٹھائے اُس کے کمرے کی طرف چل دی۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے کم عمری کی نادانی میں کوئی غلطی کرنے جا رہی ہو اور چوری پکڑے جانے کے بعد والی شرمندگی سے خوف زدہ ہو۔ وہ اپنے اور مرغوب احمد کے رشتے کے متعلق شکوک بھرے واہموں اور خدشوں میں گھری اُس کے کمرے تک پہنچی۔ آج اُسے مرغوب احمد کے پیروں کی نرم و ملائم اُنگلیاں کھردری اور سخت لگیں جن کی نرمی کو وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے واپس لاتے ہوئے امرتسر میں اپنے خاندان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو یاد کرنے لگی جب کہ مرغوب احمد کو اُس کی کھردری اُنگلیوں کے لمس نے ایسا پُرسکون کیا کہ اُسے اپنے اردگرد ایک مانوس سی خوش بو پھیلتی محسوس ہوئی جیسے امرتسر کی مٹی بانھوں کھولے اُسے اپنی گود میں بھرنے کو منتظر ہو۔ وہ ماں باپ، بھائی بہن، کھیت کھلیان اور بوڑھے شجر جن کے سایے میں وہ پروان چڑھا اور جن کی بابت مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہیں لہٰذا اُس کے نیچے کھیلنے سے منع کیا جاتا اور لڑکے آسیب کو دیکھنے کے شوق میں تمام دوپہریں اُس کے سایے میں چھپے رہتے، سب کو باری باری یاد کرنے لگا۔ وہ باپ کے فیصلے کے خلاف اپنی بغاوت پہ شرمندہ ہونے لگا تو بند آنکھوں کے پیچھے گلے میں مالائیں لٹکائے اپنے مخصوص بھینسے پہ سوار ڈنڈا لہراتا ہوا سامراج اُسے اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا اور وہ آہستہ آہستہ نیند کی گہری وادیوں میں اُترنے لگا بالکل اُسی پل اللہ رکھی نے مرغوب احمد کے پیروں کا کھردرا پن ختم ہوتا محسوس کیا۔

☆☆☆☆

سجاد بلوچ

آواز کا الاؤ۔۔۔

اللہ کے بندے، کہاں پھنسا دیا، ایسے موسم میں تو اس علاقے میں جانور بھی غاروں سے منہ باہر نہیں نکالتے، ارسلان تقریبا روہانسا ہو کر بول رہا تھا

یار ایڈونچر میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہے، شکر کر اس سے زیادہ خطرناک صورت حال کا سامنا بھی ہو سکتا ہے، عادل نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

تمھارے اس ایڈونچر کے آئیڈیے کی تو۔۔ ۔ ارسلان غصے، خوف اور سردی سے کانپتے ہوئے بہ مشکل بولا۔

حسینی اپنے شرارتی مزاج سے مجبور اور خوف پر قابو پاتے ہوئے ماحول کو کشیدہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، یار! تمھیں خواب میں کون سی جھیل دکھائی دیتی تھی، کہاں ہے وہ جھیل جس کی خوبصورتی کے قصے سنا سنا کر تم ہمارا دماغ چاٹ گئے تھے۔

کچھ دیر کے لیے ایک مہیب سکوت چھا گیا۔ چارسو پھیلی برف اور اندھیرے میں وہ تینوں سہمے ہوئے سایوں کی طرح اپنے اپنے خوف سے نبردآزما ایک گہری خاموشی میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کہیں دور سے کسی جانور کے بولنے کی آواز آئی، انھیں اس آواز نے اس سکوت آمیز خوف میں جیسے ایک سہارا فراہم کر دیا، وہ آواز زندگی کی امید کی طرح محسوس ہوئی، انھیں لگا جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہوں، حسینی نے گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا! دیکھو ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں یہ ٹوورز کتنا انجوائے کرتے تھے، کتنے خوبصورت علاقوں میں کتنے سکون کے دن گزارتے تھے، یاد ہے گئے برس سیف الملوک پر کیمپنگ میں کتنا لطف تھا، ساری رات گانا، ہلا گلا اور اف! وہ چاندنی رات پریوں کی رات۔

حسینی بولتے بولتے رکا اور کچھ سوچ کر دوبارہ گویا ہوا، ویسے پریوں کی تلاش اور ان کی موجودگی کے احساس کا لطف بھی انسانوں کے درمیان ہی ہے البتہ خواب دیکھتے ہوئے تنہائی ضروری ہے، ہاں شاید خواب میں اپنا آپ بھی منفی ہو جاتا ہے، ویسے ہیں تو ہم بھی تین، لیکن شاید ہم ایک ہی ہیں، ایک وجود کی طرح۔

یار ایویں ای فلسفہ نہ جھاڑو، ارسلان نے ٹوکا لیکن حسینی کسی لہر میں بولے جا رہا تھا، ایک ہی مسئلے سے

دوچار کئی ہزار بھی ایک ہو جاتے ہیں، عجیب بات ہے تیسری دنیا کے انسان ایک جیسے مسائل سے دوچار ہیں لیکن شاید انھیں اس کا احساس نہیں، سو ہر طرح کے تعصبات اور فضول جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں اور انھیں یہ تک معلوم نہیں کہ یہ سب انہی مقتدر قوتوں کے ہتھکنڈے ہیں جو ان کے برے حالات کی ذمہ دار ہیں۔

اس نے ارسلان کے چہرے کی طرف دیکھا جو اس کی گفتگو سے بے نیاز دکھائی دے رہا تھا، ایک خوف کے اثرات اس کے چہرے سے جھلک رہے تھے اور عادل ہمیشہ کی طرح کسی سوچ میں ڈوبا تھا سو حسینی نے بات بدلتے ہوئے کہا، سوچو! اس وقت یہاں کوئی اور آدمی مل جاتا تو کتنا سہارا ہوتا، یہاں آس پاس شاید کوئی رہتا ہی ہو، فرض کرو اس ویرانے میں کوئی پری آجائے تو خوف سے ہمارا کیا حال ہوگا، اس نے باقاعدہ ڈرنے کی کیفیت طاری کرتے ہوئے، کانپتے ہوئے کہا۔

عادل جو خاموشی سے حسینی کی بک بک سن رہا تھا، ہچکچاتے ہوئے ارسلان سے مخاطب ہوا، ارسلان! سوری یار، یہ آئیڈیا میرا تھا لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ ہم ایسے رستہ بھٹک جائیں گے ، ویسے لگتا ہے اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ رات پڑ چکی ہے، کسی سیاح کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ویسے اس جھیل کی تلاش میں نکلنے کی وجہ صرف میرا خواب نہیں تھا، اب تو صفر جھیل تک کئی لوگ آنے لگے ہیں، شعیب نے تو اپنے سفرنامے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، اس سفرنامے کا نام بہت عجیب ہے، خوف کے برف زار، سفرنامہ نہیں قبر کا عذاب ٹائپ کتاب لگتی ہے۔

ہم شاید اسی برف زار میں پھنس چکے ہیں۔ حسینی نے لقمہ دیا۔ اور پھر عادل کا ساتھ دیتے ہوئے کہا، ہاں یار تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ہم ہزاروں مرتبہ جن جگہوں کی سیر کر چکے، وہاں اب مجھے تو لطف نہیں آتا، اب وہ بھی انسانوں کا جنگل بن گیا ہے، دیکھا نہیں تم نے رستے میں کتنا ہجوم تھا، اب وہاں ایسے ہی منہ اٹھائے روز جانے کا کیا فائدہ۔

ارسلان عادل کی اس طرح طرف داری کرنے پر دوبارہ غصے میں آگیا، ہاں، تو اب بڑا فائدہ ہوا، اب یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم اس وقت کس جگہ موجود ہیں، اگر کوئی مس ہیپ ہو گیا تو تمھارے ایڈونچر کا شوق پورا ہو جائے گا اور میں مفت میں رگڑا جاؤں گا۔ رستے میں لوگوں نے منع بھی کیا کہ اب جھیل تک جانا فضول ہے، برف باری شروع ہو چکی ہے اور جھیل نے برف کی چادر اوڑھ لی ہوگی اگر اس کا کچھ حصہ ننگا بھی ہوا تو تم لوگوں کو مایوسی ہوگی۔

حسینی نے بات بدلتے ہوئے اور آسمان پر چھائے کالے بادلوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، چاروں طرف پہاڑوں پر کتنی برف ہے اور کتنے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں، اگر برف پڑنا شروع ہو گئی تو۔۔۔ وہ

بڑبڑاتے ہوئے بولا، لگتا ہے آج ہماری قلفی جم جائے گی، جلدی سے سلیپنگ بیگز نکالو اور ان میں گھس جاؤ،

تم بھی پاگل ہی ہو، یہ وہ سلیپنگ بیگز نہیں ہیں جو برف میں محفوظ رکھ سکیں، اور یہ کوئی جھیل کا کنارا نہیں ہے، یہ بہت برفانی علاقہ ہے، شکر ہے یہ کچھ جگہ خالی مل گئی، ڈھلوان سے برف پھسل گئی اور ہمیں ٹھکانہ مل گیا، یہ بات کرتے ہوئے ارسلان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا، اس کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے مقصد بات کر رہا ہو، محض بولنے کے لیے، اسے لگا جیسے اس سردی میں اس کی آواز بھی جمنے لگی ہے اور وہ کچھ دیر خاموش رہا تو کبھی نہ بول سکے گا، وہ بہت خوفزدہ تھا---

لکڑیوں سے جب پہلا شعلہ اٹھا تو ہرررررے کی آواز سے پہاڑ گونج اٹھے، دیکھو ایڈونچر کا آئیڈیا میرا تھا تو آگ بھی تو میں نے جلائی، عادل نے ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ داد طلب نظروں سے دونوں دوستوں کی طرف دیکھا تو حسینی نے پوچھا، ہاں یار ویسے تمھیں ایسی لکڑیاں ملیں کہاں سے، ارسلان تو مایوس ہو چکا تھا، شکر ہے میں نے تمھارا ساتھ دیا اور ہم نے بالآخر آگ جلالی، اب شکر ہے رات گزر جائے گی--

ارسلان جو آگ جلنے کے بعد کچھ اطمینان محسوس کر رہا تھا، عادل سے کہنے لگا، تم کافی دور تک گئے ہو گے، عادل نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو ارسلان نے آسمان کی طرف دیکھ کو دعائیہ انداز میں کہا، دعا کرو صبح تک یہ آگ جلتی رہے، اور بارش بھی نہ ہو، حسینی فورا بولا جیسے دعا میں شامل ہو رہا ہو۔

ان کا خوف کچھ کم ہو چکا تھا لیکن آگ کی روشنی میں ان تینوں کے چہرے ایسے دمک رہے تھے جیسے خزاں رسیدہ زرد پیڑ شام سے ڈوبتے سورج سے روشنی کا آخری خراج مانگتے ہیں، اور حسینی جو پہلے شرارتوں کے دوران تھوڑا خوفزدہ نظر آ رہا تھا اب مکمل اپنے آپ میں واپس آ چکا تھا، سو اسے ایک اور شرارت سوجھی، اور وہ عادل کو چھیڑنے لگا، عادل یارا تم اس روشنی میں کتنے سرخ سرخ نظر آ رہے ہو، بالکل کسی پپو بچے کی طرح لگ رہے ہو، تمھیں پتہ ہے چڑیلیں ایسے لڑکوں پر عاشق ہو جاتی ہیں، میں نے کہانیوں میں پڑھا ہے کہ وہ انھیں اٹھا کر غار میں لے جاتی ہیں اور ان کے تلوے چاٹ جاتی ہیں،

عادل کسی اور سوچ میں ڈوبا ہوا جیسے حسینی کی بات سن ہی نہیں رہا تھا، وہ جیسے اس گھپ اندھیرے میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا، اچانک اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا--

ارسلان نے حسینی کو ڈانٹتے ہوئے کہا، کیا ہو گیا تمھیں کیوں ایسے بکواس کیے جا رہے ہو۔ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو خاموش رہو۔ کچھ دیر ماحول پر پھر ایک گہری خاموشی چھا گئی جس میں لکڑیوں کے جلنے کی تڑک تڑک کی آواز آہستہ آہستہ اونچی اور واضح ہونا شروع ہو گئی۔

حسینی شرارتی انداز میں کن انکھیوں سے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ دیکھو! ایڈونچر تو

اچھا خاصا ہو گیا۔ اب وقت بھی تو گزارنا ہے، ہمیں کوئی بات تو کرنی ہے، چلو پھر اس تجویشن پر ہم تینوں ایک ایک کہانی بناتے ہیں۔۔

تو باتوں سے کس نے روکا، اس حالت میں کم از کم خوفزدہ کرنے والی باتیں تو نہ کرو۔ اور مجھے کہانیاں بنانی نہیں آتیں، ارسلان نے اب قدرے نرم لہجے میں کہا جیسے وہ اپنے غصے پر نادم ہو۔

لیکن وقت ہی گزارنا ہے یار، حسینی نے بات شروع کی کہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ارسلان نے غصے میں فوراً کہا، اچھا ٹھیک ہے پہلے میں سناتا ہوں۔۔

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا اور وقفہ طویل ہونے لگا تو حسینی نے ارسلان کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو ارشاد، اور ارسلان گویا ہوا، قصہ یوں ہے کہ میں ایک دفعہ بالکل ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوا تھا، اس وقت میں اکیلا تھا اور بہت پریشان کہ مجھے دور پہاڑی پر ایک روشنی نظر آئی، میں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا اور صبح ہو گئی، حسینی نے لقمہ دیا۔

شٹ اپ یار، اپنی باری کا انتظار کرو تم بھی شوق پورا کر لینا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، میں اس گھر کے قریب پہنچ کر اونچی اونچی آوازیں لگانے لگا، کوئی ہے کوئی ہے، اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ باہر تشریف لا رہے ہیں، ان کے چہرے پر اتنا نور تھا کہ مجھے اپنے اطراف روشن نظر آنے لگے، انھوں نے مجھ سے اور کچھ نہ پوچھا، بس سلام کے بعد مجھے اندر آنے کا کہا اور مجھے شب بسری کے لیے ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ دے دی، جہاں وہ خود بھی سو رہے تھے، مجھے انھوں نے جو بستر دیا وہ گرم تھا، میں خوف زدہ تھا لیکن گرم بستر ملنے اور تھکن کے باعث جلد سو گیا، صبح جاگا تو وہ بزرگ بستر پر موجود نہیں تھے میں نے دروازہ کھولا تو دور صحن کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دوشیزہ کو کھانا بناتے ہوئے دیکھا، اس نے ایک نظر مڑ کر میری طرف دیکھا اور فوراً ہی اپنا دوپٹہ سیدھا کر کے گھونگٹ سا نکال لیا، یار کیا بتاؤں بس اس ایک جھلک نے میری دنیا بدل دی، وہ ایسا حسن تھا کہ میں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔۔ یو نو۔۔ مجھے پہاڑوں میں رہنے والی سادہ اور خوبصورت دھودھیا رنگت والی اصلی نسلی لڑکیاں پسند ہیں۔

حسینی نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، تیری اصلی اور نسلی کے کیا کہنے یار۔ قہقہے کی آواز دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہی۔ اور اتنے میں لومڑی کی آواز دوبارہ گونجی، حسینی کو ایسا لگا یہ آواز اس کے قہقہے کے جواب میں آئی ہو۔

ویسے ارسلان تمھیں آج کل لڑکی اور شادی کے علاوہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ اس بیچاری کا کیا بنا جسے تمھارے ابا تمھاری شریک حیات بنانے کے خواہش مند ہیں، ویسے ہے تو وہ بھی خوبصورت۔ حسینی بولتا جا رہا

تھا، اچھا میری کہانی بھی سنو، میں بھی ایک دفعہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوا تھا، میں بھی تمھاری طرح دور ایک روشنی دیکھ کر اس کی طرف چل پڑا اور جب وہاں پہنچا تو آوازیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہ آیا، صحن اور چاردیواری تت تھی نہیں، بس سامنے دو کمرے نظر آرہے تھے تھوڑا آگے بڑھ کر ایک دروازے پر دستک دی تو وہ دروازہ کھلتا چلا گیا، میں سہم گیا، اندر ایک چراغ جل رہا تھا اور بستر پر رضائی ایسے بچھی تھی جیسے کوئی ابھی ابھی بستر سے باہر نکلا ہو، میں نے پوری رات اس کمرے میں بیٹھ کر گزار دی، مرے کان مسلسل کسی چاپ کا انتظار کرتے رہے، ایک چاپ کا انتظار بھی اور کسی چاپ کا خوف مسلسل طاری رہے، صبح تک کوئی بھی نہ آیا۔

تمھیں پتہ ہے وہ گھر خالی کیوں تھا۔ حسینی نے ارسلان سے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا جس کی ارسلان کو سمجھ نہ آئی۔ ارسلان جیسے ابھی تک اپنی ہی کہانی کے خوف کے حصار میں تھا، اس نے سر اٹھا کر حسینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تم ہی بتاؤ وہ گھر خالی کیوں تھا،

یار تم بھی نرے احمق ہو، اس کا آسان سا جواب ہے، بہت آسان، یہ وہی گھر تھا جہاں تم گئے تھے، وہ بابا مر گیا تھا اور وہ دوشیزہ تم سے ڈر کر چھپ گئی ہوگی، تمھاری شکل بھی تو ایسی ہے۔

حسینی نے پھر شرارتی نظروں سے ارسلان کو دیکھا۔ ارسلان نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا،

عادل جو اندھیرے میں ٹوٹتے بنتے کسی عکس کو بغور دیکھ رہا تھا، حسینی کے مخاطب کرنے پر چونک گیا اور جیسے کسی خواب سے باہر آ گیا، یار عادل تم نے کیا ہماری کہانیاں نہیں سنیں یا ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ کہاں کھوئے ہوئے ہو۔

یار یہ کہانی کار ہے کہانی بن رہا ہوگا۔ ویسے بھی یہ خوابوں میں رہنے والا آدمی ہے۔ ارسلان نے کہا۔

عادل ویسے تمھاری کہانیاں تو یونیورسٹی میگزین میں بھی چھپتی تھیں نا۔۔۔۔

عادل کہ جس نے تھوڑی دیر سے آگ میں نظریں گاڑھ رکھی تھیں، ہلکا سا سر ہلایا اور بہت دھیمی آواز میں کہا، میں تو سچی کہانیاں لکھتا ہوں۔۔۔۔

اچھا یار سچی یا جھوٹی، کوئی کہانی سناؤ تم یقیناً کچھ دلچسپ سناؤ گے۔۔۔۔

عادل کچھ دیر خاموش رہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی کہانی بیان کرنا شروع کی۔۔۔ میری کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں نے پہلی بار خواب میں جھیل دیکھی، میں یہ خواب مسلسل کئی ماہ تک دیکھتا رہا، میں نے اسی لیے تم لوگوں سے اتنا اصرار کیا تھا، وہ بہت حسین جھیل ہے اور وہ آواز اس سے بھی خوبصورت جو اس خواب میں سنی تھی، ویسے عجیب بات یہ ہے کہ ہم خواب میں مناظر کو تو یاد رکھ سکتے ہیں خواب میں سنی ہوئی آواز کو یاد رکھنا

بہت مشکل ہے، خاص کر کسی نئی آواز کو جس سے آپ پہلی بار آشنا ہو رہے ہوں، سچ بتاؤں تو وہ جھیل کہیں ہمارے آس پاس ہی ہے۔ ہاں تو جھیل کی تلاش میں نکلنے، یہاں پہنچنے اور پھر رستہ بھٹکنے تک کی ساری کہانی سے تم آگاہ ہو، سو اس سے آگے سنو۔

وہ کچھ دیر رکا اور کچھ سوچتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، ''کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔''

یار جب میں لکڑیاں ڈھونڈ رہا تھا، مجھے ایک آواز آئی ایک بہت خوبصورت آواز، اور جب اس سمت مڑ کر دیکھا تو مجھے یہ لکڑیاں نظر آئیں، واقعی ایسی جگہ اتنی خشک لکڑیاں ملنا عجیب بات ہے، اور یار یہ آواز وہی ہے جو میں خواب میں سنتا تھا، میں نے خواب میں اس جھیل کے پانی میں ایک جل پری دیکھی تھی اور اس کی آواز بھی سنی تھی، یہ آواز ہو بہو اس آواز جیسی معلوم ہوتی ہے، حقیقت کی دنیا میں میں نے ایسی آواز کبھی نہیں سنی، نہ کسی گانے والی کی نہ کسی اور کی، جیسے ایک جلترنگ سا بجتا ہو لیکن نہیں ایسا بھی نہیں یہ آواز کسی آواز سے نہیں ملتی اس آواز کو بیان نہیں کیا جا سکتا ویسے بھی آواز کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔۔۔ ارسلان کا تو خوف کے مارے برا حال ہو رہا تھا البتہ حسینی جواب تک کہانی میں گم ہو چکا تھا، عادل کے توقف کرنے پر تجسس سے بولا، تو پھر کیا ہوا، عادل نے آگ سے نظریں ہٹا کر بائیں کاندھے کی طرف چہرہ گھما کر خالی اندھیرے کو گھورتے ہوئے کہا، اس لمحے مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جو نہ خواب تھا نہ حقیقت، جیسے کوئی اور زمانہ ہو۔۔۔۔

یار پلیز تم بھی حسینی کی طرح شروع ہو گئے۔ ارسلان نے بمشکل یہ چند الفاظ منہ سے نکالے جو بہت خوفزدہ تھا۔

ارسلان! تمھیں یقین نہیں آ رہا، لیکن یہ حقیقت ہے اور وہ آواز بار بار آ رہی ہے اور اب تو میرے بہت قریب ہوتی جا رہی ہے، یار ہم اپنے جاننے والوں کی آوازیں جانتے ہیں، یہ بھلا کیسی آواز ہے کہ جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ حسینی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

ایسی آواز انسان کی ہو ہی نہیں سکتی۔۔ لیکن یہ کسی جانور کی بھی نہیں نہ پرندے کی۔ یہ آواز کسی کی نہیں، تمھیں کیسے سمجھاؤں، آواز کیسے سمجھائی جا سکتی ہے۔ اور تم سنو گے بھی کیسے، کچھ آوازیں صرف اپنے مخاطب کو سنائی دیتی ہیں۔ ویسے یہ آواز ہے بھی اور نہیں بھی، نئی آواز ہے پتہ نہیں اسے آواز کہنا بھی چاہیے یا نہیں، یار یہ بہت لطیف ہے، بہت باریک لیکن خوبصورت۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر گویا ہوا، پہلی بار انسان جب آواز سے آشنا ہوا اسے کیا علم ہو گا کہ یہ کیا چیز ہے، ارسلان اور حسینی کے چہرے آگ کی روشنی میں خوف سے مزید زرد نظر آ رہے تھے، ان کے رونگٹے کھڑے تھے۔

وہ عادل کو روکنا چاہتے تھے لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے، وہ کہانی کے ٹرانس میں بھی تھے اور خوف کے حصار میں بھی، ارسلان تو ڈر سے باقاعدہ کانپ رہا تھا، خوف کی لہریں اس کے جسم میں دوڑ رہی تھیں ----

عادل پھر بولا، سنو وہ اب میرے بہت قریب آ گئی ہے، مجھے کہتی ہے، میرے ساتھ چلو، میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ وہ اوپر پہاڑی پر میرا گھر ہے، تمھیں اپنا گھر بھی دکھاؤں گی اور اپنا آپ بھی، ایک سرخوشی، سنسنی، خوف اور تجسس کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے سے عیاں تھے، وہ اٹھ کھڑا ہوا، حسینی بول پڑا، بند کر دیہ بکواس، ارسلان ٹھیک کہتا تھا تم بہت پراسرار آدمی ہو، لیکن اب ڈراؤ تو نہیں۔ آرام سے بیٹھو اب اور صبح ہونے کا انتظار کرو، پھر دیکھیں گے تمھاری جھیل بھی اور وہ چل پری بھی۔

لیکن عادل اٹھ کر چل پڑا تھا، جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سے تھوڑی دور ہی پہاڑ سیدھا اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا اس کی ڈھلوان اتنی ہی تھی کہ برف اس پر رکی ہوئی تھی جو کسی بھی وقت پھسل سکتی تھی، اس کے دامن میں ساتھ ساتھ برف پر ایک رستے کا گماں ہو رہا تھا، عادل اسی پر چلا جا رہا تھا، ارسلان تو بالکل بےسدھ پڑا تھا جیسے خوف کے اس حال میں تھا کہ اسے اب غرض ہی نہ تھی کہ کون کیا کر رہا ہے، حسینی نے عادل کو پکارا یار بس کرو، واپس آ جاؤ اور حسینی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر کیا کرے، اسے احساس ہوا کہ عادل مذاق نہیں کر رہا وہ واقعی جا رہا ہے، اسے خود ایک خوف نے جکڑ رکھا تھا لیکن وہ عادل کے پیچھے بھاگا، وہ کوئی دس، پندرہ قدم آگے جا چکا تھا، وہ پیچھے بھاگا لیکن برف میں چلنا مشکل ہو رہا تھا، کچھ قدموں پر اس کا سانس پھول گیا اور وہ ہونٹ ہلانے کے قابل بھی نہ رہا--

عادل برف پر ایسے چل رہا تھا جیسے نیند میں ٹہل رہا ہو لیکن ان کے درمیان فاصلہ بہت تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ حسینی نے تھک ہار کر اپنی پوری قوت سے اسے آخری آواز دی، عادل عادل،،، یارررررر، اس نے دیکھا وہ مدھم ہوتی روشنی کے سرے تک جا چکا تھا، اس نے پیچھے مڑ کر الاؤ کی طرف دیکھا تو الاؤ بہت دور رہ گیا تھا، بلکہ ایک دیے جتنی روشنی نظر آ رہی تھی، اس نے دوبارہ اس رستے کی طرف دیکھا جدھر عادل جا رہا تھا، لیکن وہ غائب تھا، اسے صرف ایک ہیولا سا نظر آ رہا تھا، شاید وہ جا چکا تھا، حسینی واپس پلٹا اور الاؤ کی طرف دیکھا، اب الاؤ اسے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر نظر آیا۔ اس نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ایک بہت بڑا شعلہ بھڑکا، جیسے الاؤ میں رکھی ساری لکڑیاں پوری کی پوری ایک ہی بار جل اٹھی ہوں، اور اگلے ہی لمحے الاؤ مکمل طور پر بجھ گیا۔

☆☆☆☆

معظّمہ تنویر

امرلوک

اُس کا زادِ راہ چھن گیا تھا!

بنا زادِ راہ کے وہ بیکراں مسافت کہ جو ابد سے جا ملی تھی۔۔۔کیسے طے ہو گی؟

روح اُس کے وجود میں پھڑ پھڑائی۔

کاش! رہائی پا لے!

کاہے کو بندھی ہے ڈور؟

ازلی انتظار، جس نے اسے برسوں جُھلایا تھا، آج نہ رہا تھا۔

اب کون لِپ لِپ دِلاسا دے گا؟

کون آرزوئیں بینت رکھے گا؟

آنسو اُس کی آنکھوں سے یوں اُمل آئے جیسے پتھروں سے منہ زور چشمہ۔

کاہے کو بندھی ہے ڈور؟

آہ! گوتم نے تج دیا!

وہ تج سکتا تھا۔

اور یشودھرا؟

وہ تیاگن نہ ہو سکی۔

وہ ماں تھی!

اَمر لوک؟

امر لوک کہاں ہے؟ حالتِ اضطراب میں وہ اپنے لامتناہی ماضی کی طرف لوٹ گئی۔

اُس کا ماضی ایک سرد الاؤ تھا جس کے اندرونی چنگاریوں کو کسی زمانے کی ہوائیں بجھا نہ سکی تھیں۔ بلکہ یہ ہوائیں اکثر انھیں جگمگا دیا کرتیں۔ تب اندھیروں میں بسے دل سوز مناظر اتنے روشن ہو جاتے کہ ماضی و حال کی دُوئی مٹ جاتی۔

رقصِ درویش بپا ہوتا!

وہ شش جہت میں آرزو ڈھونڈنے لگتی۔ بصارت کھو جانے کی تمنا کرتی۔

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی!

لیکن اُسے ان مناظر سے عشق القا ہوا تھا۔ اندھی ماِمتا کا اندھا عشق!

آئینۂ خیال پر اُبھرنے والے لاتعداد عکس اُس کے بچوں کے تھے۔

کٹتے مرتے، آگ میں جھلستے، خون میں بھیگتے، خاک میں گلتے بچے!

چڑھتی کلا، جاگتی جوت کی دُعا پانے والے بچے!

اور یہ چہرے کتنے تھے؟

ستاروں کی مانند ایک کے پیچھے ایک -----

ٹوٹ کر اُس نے چاہا تھا کہ اپنی جاں نذر دے کر انھیں بچا لے۔

مگر اُس کا نذرانۂ جاں حقیر ٹھہرا تھا۔

وہ جو عالمِ اسباب کے رگ و ریشے میں لہو کی طرح سرایت کیے ہوئے تھی، اُس کا نذرانۂ جاں بے قیمت تھا!

اُس کی قسمت میں بین کرنا تھا۔

آتما مسوسنا تھا -------

ماں بننا تھا ------

ہر بار جنم دینے کے لرزہ خیز عمل سے گزرنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے سنسار میں آگ لگ گئی ہے۔ بے رحم شعلوں نے آکاش پھل کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

وہ نومولود کو سینے سے چمٹا لیتی۔

کاش! پاپ روپ ہتیارے اُس کٹھن ریاضت کو جان سکتے جو ماں بے بس لوتھڑے کے ایک تنومند جسم بننے تک کرتی ہے ----- لمحے بھر کو ایک سوال اُس کی پتھریلی آنکھوں پر نقش ہو جاتا۔

کائنات سینچنے والی خاموش کیوں ہے؟

جواب اُس کی ذات میں موجود تھا۔ جتنا عظیم غم اُسے سہارنا مقدر ہوا تھا اس کے بعد وہ قوتِ گویائی ہی کھو بیٹھی تھی۔

آنسو ہی اُس کی بقا تھے۔ پھر کچھ باعثِ تسلّی بھی تھا۔ انتظار -----

انتظار کے دشت میں آس کے سراب تھے۔

اُس کا ایقان تھا کہ ایک ایسا دور ضرور آئے گا، جب انسان اپنے ارتقاء کی انتہا کو جا پہنچے گا۔ تہذیب کا ارتفاع بربریت اور درندگی کو چت کر ڈالے گا۔ جامع اقدار سفاکی کا نام و نشاں مٹا کے رکھ دیں گی۔ انسانیت

کے احترام میں نگاہیں سجدہ ریز ہوں گی اور اُس کے بچے محفوظ ہوں گے۔

زمانے ایک دوسرے کی دھول میں گم ہوتے رہے۔

وہ منتظر رہی!

پھر اتنے زمانے گزرے جو شمار سے باہر تھے۔

وہ منتظر رہی!

پھر جیسے سپیدۂ سحری آہستہ آہستہ تاریک رات پر پھیلتا چلا جائے بعینہٖ اُس شہر ے دور کے آثار دکھائی دینے لگے۔

آخر انسانی تہذیب کے نقطۂ عروج کا عہد آن پہنچا۔

نئے زمانے کا نیا انسان، انسانیت کے گہرے شعور کا عملی ثبوت لیے سامنے آرہا تھا۔ جہاں میں ہر طرف زندگی کی حُرمت کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ شکمِ مادر میں ہی انسانی جان کی حفاظت کے انتظامات کیے جانے لگے تھے۔ پیدائش کے بعد نوزائیدہ کو ٹیکے اور دوائیاں دی جاتی تھیں۔ بچوں کے تمام مہلک اور جان لیوا امراض پر قابو پالیا گیا تھا۔ انھیں معذوری، بیماری اور بھوک سے بچانے کے لیے دنیا بھر میں تنظیمیں متحرک تھیں۔ یہاں تک کہ تحفظِ حیوانات کے ادارے وجود میں آگئے تھے اور شکار کو جُرم قرار دے دیا گیا تھا۔

یہ واقعاتِ نفس الامری دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔

ہاں! اسی زمانے کا تو اس نے خواب دیکھا تھا۔ مگر تعبیر اتنی خوبصورت ہوگی یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

یہی وہ دَور تھا جس میں ایک طمانیت بھری سانس لینے کے لیے وہ ان گنت صدیوں سے ترس رہی تھی۔

لیکن یہ طمانیت بھری سانس نالۂ سوزاں میں کیوں بدل گئی تھی؟

کیوں آنکھیں یقین کے نور سے محروم ہوگئی تھیں؟

منزل پر پہنچ کر جب اُس نے نشانِ منزل کو چُومنا چاہا تو وہ یکا یک دور ہٹ گیا تھا۔

اُس کا سفر رائیگاں گیا تھا!

شکستگی نے دُھنک کر اُسے نیم جاں بنا دیا۔ آرزوئے خام نے پھر سر اٹھایا۔

وہ کہیں دور چلی جائے۔ کسی ایسی دنیا میں جہاں مردم کُشی صنعت نہ ہو۔

دیوانگی اُس کی سوچوں کو ڈھانپنے لگی۔

یہیں کہیں امرلوک موجود ہے۔

پاگل پن اُسے بہلانے لگا۔ اُس نے دیکھا امرلوک اُس کے آزو باز و ہے۔

اتنی قریب کہ وہ صرف ایک زقند میں وہاں پہنچ سکتی ہے۔

دفعتاً وہ نئی دنیا دھوئیں کے مہیب اندھیروں میں کھو گئی۔

اُس کی آنکھیں تیورا گئیں۔

نرس کی مہربان آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

کیسی ہیں آپ؟

وہ بے خواب نگاہوں سے نرس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا عکس بے حد دھندلا تھا۔ صرف ہونٹوں کی جنبش واضح تھی۔

اف! کتنی خوفناک بمباری تھی۔ اُس نے معمول کا جملہ پھینکا۔

اپنی آخری توانائی جمع کر کے وہ بستر سے اتری۔

مجھے جانا ہے۔

ایسی کیفیت میں آپ کہاں جا سکتی ہیں؟ نرس نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اُسے اِدراک ہوا کہ وہ دردِ زہ میں مبتلا ہو چکی تھی۔

اُس کا قدم لڑکھڑایا۔

نرس نے اُسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

نجانے کب سے میں پیاسے صحراؤں میں بھٹک رہی ہوں ۔۔۔۔۔ امرلوک میٹھے چشمے کی مانند مجھے اپنے پاس بلاتی ہے۔ مجھے وہاں جانے دو۔

اُس نے دوبارہ اٹھنا چاہا۔ نرس نے اُسے تھام لیا۔

ذرا سی بے احتیاطی آپ کے بچے کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

میرا بچہ بچ جائے گا؟ وہ کراہی۔

ایکا ایکی اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے قتلِ عام کے مناظر کا سلسلہ یوں تیزی سے شروع ہو گیا جیسے طوفانِ باد میں خس و خاشاک کہیں پناہ نہ پا رہے ہوں۔

کیا میرا بچہ بچ جائے گا؟

وہ پوری جان سے چیخی۔

بتاؤ۔ کون بچائے گا اُسے؟

میرے بچے کو کون بچائے گا؟

اُس کی چیخیں اُس کے بدن سے اُٹھتی گہری ٹیسوں میں ڈوبتی چلی گئیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اقبال آفاقی

ہیگل کی جمالیات اور فلسفہء آرٹ

جارج ولہم فریڈرک ہیگل روشن خیالی کے آخری دور کا قد آور جرمن فلسفی ہے۔ وہ ستائیس آگست 1770 کو جرمن قصبے سٹٹ گرٹ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم مذہبی سکول سے حاصل کی۔ اس دوران شیلنگ (فلسفی) اور ہولڈرن (شاعر) اس کے ہم مکتب اور ہم جماعت رہے۔ تینوں قریبی دوست بن گئے اور ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوتے رہے۔ تینوں نے انقلاب فرانس کے حالات و واقعات کا پرجوش استقبال کیا۔ ہیگل نے جینا، فرینکفرٹ، ہائیڈل برگ اور برلن کی جامعات میں پڑھایا۔ برلن میں وہ مشہور فلسفی فشٹے کی وفات پر وفیسر تعینات ہوا۔ پھر 1830ء میں برلن یونیورسٹی میں ریکٹر کے عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اگلے سال یعنی 1831ء ہیضے کی وبا پھیلنے کے نتیجے میں موت نے آن لیا۔ اس کے افکار کو بجا طور پر جرمن فلسفہء تصوریت کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا بے حد مقبول فلسفی تھا۔ اس کے افکار نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ کارل بارتھ نے ہیگل کو پروٹسٹنٹ فلسفے کا تھامس ایکوائنس قرار دیا ہے۔ مارس مرلوپونٹی نے لکھا کہ پچھلی صدی کے تمام بڑے فلسفیانہ تصورات پر اس کے اثرات گہرے نظر آتے ہیں۔ مارکس، نطشے، مظہریات، جرمن وجودیت اور تسویہ نفس کے نظریات کی ابتدا ہیگل کے فلسفے ہوتی ہے۔ [1] بہرحال انیسویں صدی کے اواخر میں ہی ڈارون، نطشے، مارکس اور فرائیڈ کے نظریات اور سائنسیت کے فروغ کے نتیجے میں ہیگل کی مطلق تصوریت کی مقبولیت کم ہوتی چلی گئی۔ [2] یہ بھی نشان خاطر رہے کہ ہیگل کی مقبولیت کم ہوئی ہے قدر و قیمت نہیں۔ تمام جدید اور مابعد جدید فکری تحریکوں کے عقب میں اس کا حوالہ منفی یا مثبت انداز میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی تحریریں دیگر جرمن فلسفیوں کی طرح مبہم اور پیچیدہ ہیں۔ اس کا روح مطلق کا نظریہ اور جدلیاتی منطق دونوں دقیق ہیں مگر غیر متعلق نہیں۔ ان موضوعات پر بحث و تمحیص کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ زیر نظر مضمون اس کی جمالیات کے بارے میں تھیوری روحِ مطلق کے ظہور کی تاریخی جدلیت کا ہی حصہ ہے۔

جدلیت اس کے یہاں پیہم کشمکش کے مساوی ہے۔ ایک ایسی ترقی پذیر کشمکش جو حقیقت کے ایک خاص پہلو میں مضمر تضادات حل کر کے ایک نئی ترکیب یا نظام کو منظر عام پر لاتی ہے۔ ہیگل تاریخ کے واقعات کو روح کے جدلیاتی ارتقا کی روداد کے عین سمجھتا ہے۔ لگتا ہے کہ جو کچھ وقوع پزیر ہو رہا ہے، اس کو وہ جو کچھ ہونا چاہیے

کے معنوں میں لیتا ہے ۔ ہیگل کے نزدیک دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ روح مطلق کی خود تکمیلیت کا جدلیاتی تسلسل ہے ۔ آرٹ وہ میڈیم ہے جس میں روح مطلق کا کم تر درجے پر ظہور ہوتا ہے ۔ یورپی فلسفے کی مجبوری ہے کہ ہیگل کی فکری اساس کو سمجھے بغیر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تصورات و تعقلات کی مناسب تفہیم نا ممکن ہے ۔ مارکسی جمالیات کے علاوہ فرینکفرٹ سکول کی جمالیات پر ہیگل کے گہرے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں ۔

ہیگل کے تصور آرٹ کے پس منظر میں اس کی تصوریت کے علاوہ جرمن جمالیات کی متمول روایت کارفرما ہے ۔ جمالیات کی اس روایت نے ہیگل کے آرٹ کے بارے میں خیالات کی منظم تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ۔ اس کے خیالات کی تشکیل میں تین مفکرین ونکل مان، کانٹ اور شلر کا کردار سب سے اہم ہے ۔ خصوصاً کانٹ کی 'تنقید محاکمہ' کی چھاپ اس پر بہت گہرے ہے ۔ لیکن اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اس نے کانٹ کو شلر کی تحریروں کے توسط سے جانا اور سمجھا ۔ کانٹ سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے کانٹ کی داخلی غائیت (Internal Teleolgy) اور Ontology دونوں کو اس نے اپنے نظام فکر میں شامل کر لیا ۔ اس کے نزدیک آرٹ وجودیاتی وژن (Ontological Vision) کے ظہور کا ذریعہ ہے لیکن یہ نشان خاطر رہے کہ کانٹ کے لیے اس قسم کا دعویٰ قبول نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ کانٹ کے یہاں اشیا کا حسن کسی وجودیاتی تصور کا مرہون منت نہیں ۔ اس نے احساس جمال اور احساس جلال (Sublime) کو دو الگ الگ تجربات میں تقسیم کیا ہے ۔ لیکن ہیگل کی مطلق تصوریت اس تقسیم کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی ۔ ہیگل نے کانٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس کے تصورِ تخلیقیت کو بہت زیادہ انفرادیت اور موضوعیت پسند قرار دیا ہے ۔ ہیگل کے نزدیک آرٹ کے کام میں انفرادی فطانت اور نفسیاتی ضروریات تو ہوتی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی جینئس کا انسلاک وسیع پیمانے پر آزادی کے تعقل سے بھی ہونا چاہیے ۔ آزادی کا ایک ایسا تعقل جو زندہ شراکت کا طلب گار رہتا ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ تخلیق کار کی انفرادی صلاحیتوں اور اعمال پر زور دینے کی بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ دنیا کے معینہ تعقلات کا تسلسل کس طرح فطرت، انسان اور خدا کے معین کردہ مجمل شعور میں ڈھل کر آرٹ کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ [3] یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہیگل کے فلسفہء آرٹ کی تشکیل اس وقت عمل میں آئی جب جرمن ادب اور آرٹ میں شیلنگ، شلیگل اور شلر کے نظریات کا دور دورہ تھا اور سماج میں آرٹ اور آرٹسٹ کو الوہی مقام پر رکھ کر دیکھا جا رہا تھا ۔ یہ وہ دور تھا جب آرٹسٹ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی گئی تھیں ۔ [4] یہی وجہ ہے کہ ہیگل آرٹ کو روح کا ایک مظہر قرار دیتا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ آرٹ وہ مقام ہے جہاں روح عالم جلوہ نما ہو سکتی ہے ۔

ہر بڑے آدمی کی طرح ہیگل کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مصری، یونانی اور رینے ساں کے دور میں ابھرنے والے آرٹ کے شہ پاروں پر اس کی گہری نظر تھی۔ رافیل، کوریکیو، لیونارڈو ڈاونشی ایسے باکمال مصوروں کے کام کو دیکھنے کے لیے اس نے ویانا، پیرس اور یورپ کے مختلف شہروں کی سیاحت کی۔ شاعر گوئٹے سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ تھیئٹر اور اوپرا دیکھنے بھی جایا کرتا۔ موسیقی سے اس کا شغف کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس کا پسندیدہ موسیقار بیتھوون تھا۔ چنانچہ اڈورنو کا یہ بیان ہرگز قابل اعتنا نہیں کہ اس نے جمالیات بہت کچھ لکھا لیکن اس نے جو کچھ بھی لکھا آرٹ کے بارے میں کچھ جانے بغیر لکھا۔ جس شخص نے یونانی اور لاطینی زبانیں بچپن میں پڑھ رکھی ہوں۔ ہومر، اسکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پڈیز کو براہ راست مطالعہ کیا ہو۔ فارسی اور ہندی شاعری پر اس کی نظر ہو۔ مصری آرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو اس کے بارے میں اڈورنو کا بیان نامناسب ہی نہیں حیران کن بھی ہے۔

ہیگل کے نظریہء آرٹ کو سمجھنے کے لیے اس کے فلسفہ کے کم از کم بنیادی نقاط کا ادراک ضروری ہے۔ پروفیسر کیتھ وارڈ کی اس سلسلے میں رہنمائی خاصی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لکھتے ہیں ہیگل کے نزدیک حقیقت مطلق ایک ہے جسے وہ روح (Geist) کا نام دیتا ہے۔ کائنات کی پوری تاریخ اس روح یا حقیقت مطلق کے تدریجی انداز میں مکمل خود شعوریت کی منزل تک پہنچنے کی تاریخ ہے۔ اپنی ذات کے وقوف اور پہچان کی خاطر روح خود کو معروض میں ڈھالتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ سلسلہء معروضات علم میں خود کا نمود کرتی ہے۔ یہ معروضات الگ تھلگ، اپنی ذات کی بنا پر موجود اور حادثاتی طور پر ایک دوسرے سے مربوط عناصر ہیں جیسا کہ سائنس میں ہوتا ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی معروض الگ تھلگ یا اپنی ذات میں مکمل نہیں۔ ان میں ایک نامیاتی اتحاد موجود ہے۔ تمام معروضات سے ان کے تضادات کا استنباط ہوتا ہے۔ جیسے روشنی سے تاریکی اور گرمی سے سردی کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اشیا کو کلی طور جاننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو ان کے تضادات کے ساتھ جانتے ہیں۔ گویا تضاد ان کے وجود کی بنیاد ہے۔ مزید یہ کہ عمیق سطح پر ایک ایسی وحدت موجود ہے جس میں تضادات باہم متحد ہو جاتے ہیں۔ 5

ہیگل کا نظریہء آرٹ اس کی روح مطلق (Geist) کی تھیوری اور جدلیاتی منطق کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے نزدیک روح مطلق اپنی تکمیل کی خاطر دنیا کے مظاہر، اشیا اور بنی آدم میں میں مسلسل ظہور کر رہی ہے۔ نہ صرف روح کا ظہور مختلف صورتوں میں متشکل ہوتا ہے بل کہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں شعور اور اعلیٰ اقدار بھی ارتقا پذیر ہیں۔ ہیگل کی فلسفیانہ منطق کے مطابق ہستی (Being) کو ایک ایسے تصور (Idea) کے طور پر لینا چاہیے جو اپنا تعین خود کرتی ہے۔ ہیگل نے فلسفہء فطرت میں ہستی کے تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے لکھا ہے

کہ منطق ہمیں آدھی کہانی سناتا ہے پوری نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تفکر محض جسے لوگوس (Logos) کا نام دیا جاتا ہے مجرد حقیقت ہرگز نہیں بل کہ یہ تو منظم مادے کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ گویا ہیگل کے خیال میں جو کچھ بھی ہے وہ محض عقل خالص تک محدود نہیں۔ اس کی حدود میں طبیعاتی، کیمیائی اور زندہ مادے کی وہ تمام اشکال شامل ہیں جو عقلی اصولوں پر کاربند ہیں۔ بہرحال زندگی طبیعاتی مادے کے مقابلے میں غیر مبہم طور پر عقلی ہے کیوں کہ یہ زیادہ خود معین ہے۔ جب زندگی خود شعوریت کی منزل پر آتی ہے تو زیادہ عقلی اور خود معین ہو جاتی ہے۔ اس منزل پر جہاں زندگی تصور کرنے، زبان کو استعمال میں لانے اور آزادی سے فیصلے کرنے لگتی ہے۔ اس شاعر بالذات ہستی کو ہیگل روح (Spirit) کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جب زندگی شاعر بالذات حقیقت میں ڈھل جاتی ہے تو تصور یا عقل (Idea) کلی طور پر خود معین و خودکار ہو جاتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک یہ واقعہ انسان کے ظہور کے ساتھ وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس کے نزدیک انسان محض فطری حادثہ نہیں۔ انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنا جواز آپ ہے۔ یہ جواز فطرت کے اندر پہلے سے موجود ہے۔ انسان یا اس جیسی دوسری مخلوقات جو کسی دوسرے سیارے میں موجود ہو سکتی ہیں کے علاوہ بقول ہیگل کائنات میں شاعر بالذات عقل کا کہیں وجود نہیں۔ یہ کہنے کے بعد ہیگل ان اداریاتی ساختیوں کا تجزیہ کرتا ہے جو انسان کو مناسب انداز میں آزاد اور خود مکتفی ہونے کے لیے درکار ہیں۔ ان اداریاتی سانچوں کی پہچان انسانی حقوق، خاندان، سول سوسائٹی اور مملکت کی صورت میں کی جا سکتی ہے۔ پھر وہ ان ذرائع کا تجزیہ کرتا جو روح کی شناخت اور تفہیم کو ممکن بناتے ہیں۔ ہیگل کے نزدیک فلسفہ ان ذرائع میں سرفہرست ہے۔ فلسفہ خالص تعقلاتی انداز میں روح کا ادراک کرتا ہے۔ تعقل یا آئیڈیا فطرت کے بارے میں بھی واضح ترین فہم مہیا کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ عقل کیونکر زمان و مکاں، زیست اور شاعر بالذات روح میں ڈھل جاتی ہے۔ اگرچہ مذہب بھی اسی صداقت کو منکشف کرتا ہے لیکن چوں کہ یہ صداقت کی نمائندگی کے طریق کار پر عمل پیرا ہے اس لیے تصویری، تخیلی اور معتقداتی انداز پر کا حامل ہے۔ کوئی بھی قوم مذہب کے بغیر حقیقت کا تعین اور تعبیر کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہے۔

ہیگل کے یہاں آرٹ بھی روح کو خود فہمی اور خود شناسی میں مدد دیتا ہے تاہم اس کا طریق کار فلسفے اور مذہب سے مختلف ہے۔ یہ طرق کار روح کو فلسفے اور مذہب سے مختلف انداز میں خود شعوریت فراہم کرتا ہے۔ انسان خود شعوریت کو ظروف سازی کے ذریعے، شاعری لکھ کر یا مصوری کر کے ظہور میں لاتا ہے۔ اس طرح آرٹ روح کی آزادی کو دیدار یا سماعت کے قابل بنا لیتا ہے۔ ہیگل کے یہاں آرٹ کی غرض و غایت خوبصورت اشیا کی تخلیق ہے۔ آرٹ خوبصورت اشیا کی تخلیق کے ذریعے آزادی کے مصدقہ کردار کو حسیاتی

اظہار فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ آرٹ کا کام فطرت کی نقل یا گرد و پیش کو سجانا بنانا نہیں، اس کا کام ہمیں تفکر کی راہ پر لگانا ہے اور فنکار کو آزادی مہیا کرنا ہے کہ وہ اپنے ہی تخلیق کردہ فن پاروں کے محاکات (Images) سے لطف اندوز ہو سکے۔ محاکات اس لیے خوبصورت ہوتے ہیں کہ وہ ہماری آزادی یا خود اختیاریت کا مظہر ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ کا مقصد ذات کی سچائی کو ہماری ذات پر منکشف کرنا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہم کون ہیں اور کیا مقام رکھتے ہیں۔ آرٹ کا مقصد آرٹ برائے آرٹ نہیں۔ آرٹ کا مقصد خوبصورتی کی تخلیق ہے اور انسانی ذات کی خود شناسی اور خود اظہاریت کو حسی ہیئت میں پیش کرنا ہے۔

ہیگل اس دعوے سے اختلاف کرتا ہے کہ آرٹ محض فطرت کی نقالی (Mimesis) ہے۔ 6 ہیگل کا نقل کی تھیوری کے خلاف استدلال یہ ہے کہ اس میں تکرار اور لایعنیت کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ نقل میں فضول قسم کی محنت کرنا پڑتی ہے۔ آرٹسٹ جن چیزوں کی نقل کرتا ہے وہ ہماری اور ہمارے اقارب کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتی ہیں مثلاً قدرتی مناظر، چرند و پرند اور وحشی جانور وغیرہ۔ ان کی نقلیں بنانا۔ ان کو دیکھ کر مصوری کرنا مضحکہ خیز پیروڈی نہیں تو اور کیا ہے؟ فطری زندگی میں بار بار دیکھی ہوئی اشیا کو مصور کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ واقعات و حوادث جو انسانی زندگی میں بار بار وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کو دہرانے کا مطلب یک طرفہ فریب میں مبتلا ہونا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسی تصویر کامیابی سے بنا بھی لیں جس میں نقل بالکل اصل لگے تو پھر بھی نقل تو نقل ہوتی ہے جیسے زمانہ قدیم میں زیوکسز نے انگوروں کے گچھے کی تصویر بنا کر فطرت کی نقل کے اصول کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ زیوکسز کی کہانی بیان کرنے والا لکھتا ہے کہ جب اس کی بنائی ہوئی تصویر کو کھلے میں رکھا گیا تو فاختائیں انگور کو اصل جان کر تصویر پر چونچیں مارنے لگیں۔ یہ نقل کے طریق کار کو بروئے کار لانے کی اعلیٰ مثال ہے۔ لیکن کیا آرٹ محض فطرت کی نقالی ہے؟ ہیگل کا جواب نفی میں ہے۔ وہ کہتا ہے ہم دنیائے فطرت میں پہلے سے موجود چیزوں کی نقل کر کے حظ تو اٹھا سکتے ہیں مگر یہ حظ اور انبساط وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ جلد ہی اس قسم کا آرٹ اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ ہیگل نے یہاں نقل سے حظ اٹھانے کی کانٹ سے ایک مثال مستعار لی ہے۔

کانٹ نے لکھا ہے کہ ہم جلد ہی اس آدمی سے اکتا جاتے ہیں، بوریت محسوس کرنے لگتے جسے بلبل کی آواز کی نقل کرنے میں کمال حاصل ہو کیوں کہ جلد ہی ہم پر کھل جاتا ہے کہ یہ تو محض ایک سحر انگیز داؤ پیچ ہے جو نہ تو فطرت کی آزادانہ پیداوار ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تخلیقی عمل۔ تخلیقی عمل انسانوں کی وہ پید تخلیقی صلاحیت ہے جو نقل کے دائرہ کار سے یکسر مختلف ہے۔ ہیگل کے خیال میں انسان کو اتنی مسرت نقل کرنے سے حاصل نہیں ہوتی

جتنی کہ اپنی ذات کی شعوری صلاحیتوں کو مہمیز دے کر حاصل ہوتی ہے۔ تخلیق کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ بقول ہیگل انسان ہتھوڑا، کیل اور آری بنا کر جتنا فخر اور حظ محسوس کرتا ہے اتنا حظ اور فخر نقالی میں کارہائے نمایاں دکھا کر بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

ہیگل کے نزدیک جب نقل کے اصول کو خالص فارمل انداز میں استعمال کیا جاتا ہے تو معروضی خوبصورتی پس پا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصنف یا مصور کی ساری توجہ فطرت سے ہٹ کر اس سوال پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ کیا نقل بہ مطابق اصل کی جا رہی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ چوں کہ نقل فطرت کے مظاہر کو بعینہ اور یکساں انداز میں پیش کرتی ہے اس لیے لوگ جلد ہی اس سے بیزاریت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ ہیگل آرٹ کے بارے میں نیچرل ازم کے دعووں کو قبول نہیں کرتا۔ فطرت یقیناً حسین اور با معنی نظر آتی ہے لیکن چوں کہ اس میں تصور (Idea) یا خیال اپنی خالص حالت میں نہیں ہوتا، بل کہ یوں کہہ لیجیے کہ خارجی حسیات کے تلے دفن ہوتا ہے اس لیے فطرت کو آرٹ کا معیار قرار دینا درست نہیں۔ دوسری بات یہ کہ فطرت کا حسن جوہری طور پر ناقص ہے۔ سبب یہ کہ عالم فطرت میں موجود تمام اشیا(Objects) حادث اور محدود ہیں۔ اگر انسانی ذہن نے حسی ہیئتوں کے اندر تصور مطلق کا ادراک کرنا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ فطرت کی حدود سے بلند ہو جائے۔ ہیگل کا دعویٰ ہے کہ فطرت کا حسن آرٹ کے حسن سے کم تر ہے۔ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آرٹ کی خالق بذات خود روح یا حقیقت مطلق ہے۔ 7

ہیگل کے نزدیک آرٹ کا تخلیقی اصول یہ ہے کہ حسیاتی تجسیم کا عمل دخل صرف ایک مخصوص حد تک رہے اس سے آگے نہیں۔ ورنہ حسیاتی تجسیم کا عمل دخل خیال و تصور کے آزادانہ اظہار کی راہ میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ خالص حسن کے بارے میں ہیگل کا دعویٰ ہے کہ اسے مکمل طور پر خود معین، لامحدود اور خود مختار ہونا چاہیے۔ 8

آرٹ کا ہر نمونہ دو ممتاز پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ دونوں پہلو ایک وحدت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق موضوعیت سے ہے۔ مراد یہ کہ آرٹ کا کام جوہری طور پر موضوعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ آرٹ کا تعلق روحانی معنویت، بطون اور روح سے ہے۔ اسے آپ آرٹ کا روحانی مواد قرار دے سکتے۔ دوسرے پہلو کو اختلافات کی کثرتیت کہا گیا ہے۔ یہ آرٹ کے کام کا معروضی، حسی اور مادی پہلو ہے۔ اسے بالعموم مادی صورت یا ہیئت کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے مصوری میں رنگ یا روشنی، موسیقی میں آواز و صوت اور شاعری میں ذہنی محاکات وغیرہ۔ بہر حال یہ دونوں پہلو آرٹ میں ایک مکمل وحدت کی صورت میں وقوع پذیر ہوں تو بات بنتی ہے۔ چنانچہ جب ہم تصور کو مادی صورت میں تجسیم دے لیتے ہیں تو ہم مثالیت کے اکمال کو پا لیتے ہیں۔

چوں کہ آرٹ کے کام کو خود مختار، خود معین اور لامتناہی ہونا چاہیے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مادی پہلو میں موجود خالص خارجیت اور حادثیت کو منہا کر دیا جائے کیونکہ ان عوامل کا داخلی وحدت یا روحانی مواد سے تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ آرٹ غلامانہ انداز میں فطرت کی نقل نہیں کرتا۔ جب آرٹسٹ فطری اشیا کو موضوع اور مواد کے طور پر لیتا ہے تو اس کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ Subject Matter کو خارجی دنیا کی ان حادثات، بے روح اور فضول متعلقات سے پاک کر دے جو اس کے معنی کو مبہم بنا دیتے ہیں۔ دوسرا فریضہ آرٹ کا یہ ہے کہ ان خصائص کو روشنی کے دائرے میں لے آئے جو روح کی داخلیت یا وحدت کو منکشف کرتے ہیں۔ 9

اب اگر یہ درست ہے کہ آرٹ کا کام فطرت کی نقالی نہیں تو یہ بھی بقول ہیگل درست ہے کہ اخلاقیات کی تعلیم و تدریس آرٹ کا مسئلہ نہیں۔ آرٹ کو اصلاح احوال کی خاطر بروئے کار لانے کا مطلب اس کو حادث دنیوی معاملات کا حصہ شمار کرنا ہے۔ اس طرح ہم نہ صرف آرٹ کے مقصد فی نفسہٖ کی نفی کرتے ہیں بل کہ اس کی لامتناہیت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ اس صورت میں آرٹ کو ایک ایسی چیز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو کسی اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے کام میں لائی جا رہی ہو۔ اس طرح ہم آرٹ کو ماتحت اور زیر دست حیثیت میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ہمارا یہ اقدام آرٹ کی روح کو کچلنے کے مترادف ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آرٹ کا اصل مواد (Content|) کیا ہے اور یہ کہ مواد کس مقصد کا آئینہ دار ہے؟ ہیگل نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آرٹ کے موضوع کے حوالے سے ہمارا ذہن ایک عمومی رائے کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ یہ کہ آرٹ کی غرض و غایت ہمارے احساسات، محسوسات کو اُس تمام کچھ سے مربوط کرنا ہے جو ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ آرٹ کا کام لاطینی زبان کی اس کہاوت کا ادراک ہے۔ Homo sum humani nihil a me alienum puto ۔ مراد یہ کہ آرٹ کا مقصد ہمارے خفتہ جذبات، رجحانات اور آرزوؤں کو بیدار کرنا ہے، ان کو شکل و صورت دینا اور قلب کو بھر دینا ہے۔ مقصد اُن تمام تجربات کو حساس کی سطح پر لانا ہے جن کا تجربہ کرنے کے لیے روح بطون کی گہرائیوں اور بھیتر کے خفیہ گوشوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہے یعنی وہ سب کچھ جو انسان کے سینے کے اندر حرکت پیدا کرتا ہے اور اپنے کثیر العباد امکانات اور جہات میں تخلیقی عمل کا باعث بنتا ہے۔ اس کا ہدف ادراک اور جذبات کو ذہن میں موجود حقیقی اور ارفع افکار و تصورات کی پیش کش کے ذریعے خوشی اور مسرت فراہم کرنا ہے۔ وہ جو بلند مرتبت کی طرح روشن، لابدی اور مصدقہ ہے اس کا کام ناکامیوں، ابتلاؤں اور فسق و فجور کو منظر عام پر لانا بھی ہے۔ لوگوں کو ان تمام رزائل کی اصلی حقیقت سے روشناس کرانا ہے

جو دہلا دینے والے اور عبرت ناک بھی ہیں۔ مزید تقاضا یہ بھی ہے کہ متخیلہ کو خیال آفرینی کے مزے دار کھیل کی طرف راغب کیا جائے تا کہ حس کی متحرک کرنے والی بصارت کے سحر انگیز مکاشفوں سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔"10

ہیگل کے خیال میں مواد کا نا مختتم تنوع آرٹ کے لیے لازمی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ فطری تجربے کے وجودی تناظر کا احاطہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کے بغیر مطلوبہ فطری آرزوؤں کی تناندہی کا عمل محدود تر ہو جاتا ہے۔ مواد کی وسعت کو جانے بغیر ہم زندگی کے تجربات کو سمجھنے اور ان کے دائرہ کار کی تفہیم سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ ہمیں دراصل اخذ و قبول کی ایک ایسی صلاحیت درکار ہوتی ہے جس ذریعے زندگی کے تمام عناصر کو خوش آمدید کہا جا سکے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ آرٹ کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے جو ہر قسم کے موضوع اور مواد کو فن کے روپ میں پیش کر سکتی ہے، ادراک اور احساس کا حصہ بنا سکتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ آرٹ کا ہیئتی پہلو جب بہت سے اور متنوع مواد کو اپنے دائرہ کار میں شامل کرتا ہے تو یہ اعتراض بلا جواز نہیں کہ کثیر العباد احساسات اور تصورات کی بیک وقت عمل داری بہت سے تضادات کو جنم دے سکتی ہے۔ یہ احساسات اور تصورات ایک دوسرے کی نفی کر سکتے ہیں۔ اس طرح آرٹ انسانوں کو باہم متضاد جذبات کے گھن چکر میں مبتلا کر سکتا ہے۔ باہم متضاد جذبات احساسات کا یہ کھیل سوفسطائیت اور تشکیکیت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ آرٹ کو سوفسطائیت اور تشکیک سے محفوظ رکھنے کے لیے فکر و استدلال کی دخل اندازی لازمی نظر آتی ہے جو یہ طے کرتی ہے کہ آرٹ کی برتر اور آفاقی مقصدیت کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک جب فکر و استدلال کے ذریعے سمت کا تعین کر لیا جاتا ہے تو جذبات و احساسات کے باہمی تضادات پسپا ہو جاتے ہیں۔ ایک وحدت (Unity) کی شکل و صورت سامنے آنے لگتی ہے۔

آرٹ کی روح یا دوسرے الفاظ میں اس کا روحانی مواد ہر جگہ مطلقیت کا حامل ہے جسے ہیگل فکر کی آفاقیت کا نام دیتا ہے۔ ہر اس چیز کی جو حادث، جزئی اور متلون ہو اس میں کوئی جگہ نہیں بنتی۔ جہاں انسانی زندگی کو مصور کیا جائے وہاں اسے جوہری، آفاقی اور عقلی ہونا چاہیے۔ انسانیت کی اجتماعی دلچسپیاں اس کا جوہر (Substance) ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی کا مرکز اور زندگی کو رواں دواں رکھنے والی قوتیں ہیں۔ یہ آفاقی اور عقلی دلچسپیوں سے مراد دراصل وہ دلچسپیاں ہیں جن کو جدلیاتی عمل میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً خاندان (فیملی)، مملکت، معاشرہ، محبت اور اخلاق وغیرہ۔ لیکن یہ چیزیں ادب میں مجرد صورت میں سامنے

نہیں آنی چاہئیں۔ کیوں کہ آرٹ کا مجردات سے کوئی تعلق نہیں۔ آرٹ کا تعلق ہمیشہ ٹھوس حقائق اور افراد سے ہوتا ہے۔ اس طرح آرٹ کی دلچسپیوں میں لاوسطیت کا عمل دخل ہوتا ہے جیسے وہ دلچسپیاں جو بنیادی طور پر عقل پر مبنی ہوتی ہیں۔ مثلاً والدین اور بچوں سے محبت، وفاداری اور عزت وتوقیر کی حفاظت کا دستور وغیرہ۔ ذاتی طور پر ہم انوکھے اطوار اور اوہام سے آرٹ کو تحرک دینے کے قائل نہیں ہوتے۔ اس لیے صرف آفاقی جذبات۔۔۔ جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔۔۔ آرٹ کا مستقل موضوع ہو سکتے ہیں۔ چوں کہ موضوعات آفاقیت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے وہ حقیقتِ مطلق کا مظہر ہوتے ہیں۔ مطلق سے یہاں مراد عقلیت، تفکر اور آفاقیت ہے۔ اسی حوالے سے یہ طے ہے کہ شر اور فسق وفجور کو ادب کا موادنہیں بنایا جا سکتا۔ کیوں کہ شر نہ صرف غیر عقلی ہے بل کہ حادث بھی۔ لہٰذا آفاقیت سے محروم ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ میں اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

آرٹ کا کام خیال یا تصور کو شعور کی سطح پر براہِ راست حسی صورت میں پیش کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ آرٹ کو تعقلات کے حوالے سے پرکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی خالص روحانیت کو معیار بنا کر اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ آرٹ کے کام میں ہم تصور کو لچک دار محاکات (Images) کے ذریعے حسی شکل وصورت فراہم کرتے ہیں۔ گویا آرٹ میں حس اور تصور کو ایک مکمل وحدت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ آرٹ کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ مواد کو استحضار کے قابل ہونا چاہیے تا کہ آرٹ کو حسی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ ہم تصور کی نقل یا استحضار کے دعوے کو قبول کر رہے ہیں۔ ہیگل Mimesis اور استحضاریت کی شدت سے نفی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک روحِ کائنات آرٹ کے شہ کار میں بذاتِ خود جلوہ فگن ہوتی ہے، اس کی نقل نہیں۔ دوسرا تقاضا یہ کہ آرٹ کے مواد کو تجرید سے بچنا چاہیے۔ جب تجرید سے بچنے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آرٹ کو ٹھوس مادی صورت میں سامنے آنا چاہیے جیسا کہ تفکر اور روحانیت کے بالمقابل خالص حسیات کی عمل داری میں ہوتا ہے۔ آرٹ کی عمل داری میں روحِ مطلق کا ظہور شعور کی سطح پر ہوتا ہے جو تجربے کی حسی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لیے آرٹ کے کام میں تمام تر جزئیت اور موضوعیت کے باوجود آفاقیت کی صفت غالب نظر آتی ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صداقت کو (جس کا صدور روحِ کائنات یا حقیقتِ مطلق سے ہوتا ہے) حسیات کا روپ میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہیگل کے دعوے کے مطابق یہ ہے کہ ہم آرٹ کے ایوان میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں اگر آرٹ کی تعریف سادہ الفاظ میں کرنا مطلوب ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں روحِ کائنات کے عکس کو حسیات کے لبادے میں پیش کرنا آرٹ کہلاتا ہے۔ یاد رہے کہ ہیگل آرٹ اور

خوبصورتی کو یک ہی معنوں میں لیتا ہے ۔ آرٹ کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ متنوع موضوعات کی دنیا ہے لیکن یہ طے ہے کہ حسن و جمال کی صفت جو ہمیں نہ صرف اپنی طرف متوجہ کرتی ہے بل کہ فرحت وانبساط سے ہم کنار بھی کرتی ہے، تصور کی حسی شکل میں ظہور پاتی ہے ۔ پروفیسر چارلس ٹیلر نے خوبصورتی یا حسن کی ہیگلیائی تعریف کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ تصور (Idea) کے حسیاتی اظہار کا نام حسن ہے (das sinnliche Scheinen der Idee, ۔

ہیگل آرٹ کی ہر طرح کی تعریف کی مزاحمت کرتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے خیال میں آرٹ کی تشکیل استحضاریت (Represtnaton) کی بجائے پیش کش پر انحصار کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہمیشہ تفکر کی سی ارفع شفافیت ناموجود ہوتی ہے ۔ تفکر میں ہم توضیحی اور تصریحی جملوں کو استعمال میں لاتے ہیں ۔ مستعمل تصریحی حدود پر غور کرتے ۔ ان کے معیار کی کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کے بنیاد و جواز پر بات کرتے ہیں ۔ لیکن فنکار اس طرح کی شفافیت کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ اس کی توضیح کر سکتا ہے کہ اس نے ایک مخصوص پیٹرن، صوتی لہجے یا الفاظ کو کیوں کر استعمال کیا ۔ اگر وہ ان کے استعمال کا جواز پیش کرتا ہے تو محض ان کی یا ان کے متبادلات کی جمالیاتی قوت کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے ۔ وہ ان کے مجسم وژن کے اندر صداقت کی عقلی توجیہ کا دعوے دار نہیں ہوتا ۔ آرٹ میں ہم اشیا کی بصیرت (Vision) تک رسائی کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن یہ کوشش بہت حد تک تفکر سے محروم ہوتی ہے ۔ جو کچھ آرٹ کے کام میں پیش کیا جاتا ہے ہم اس کے ارتباط یا دوسرے الفاظ میں اس کی منطقی معقولیت سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں ۔ فنکار تخلیقی عمل میں ایک ایسی لزومیت کا پابند ہوتا ہے جسے وہ جان نہیں سکتا ۔ اس لزومیت کو وہ انسپیریشن کا نام دیتا ہے ۔ انسپیریشن ایک ایسی قوت کا نام ہے جو آرٹسٹ کے لیے بالکل اجنبی ہوتی ہے (eine ehnm fremde Gewalt, EG p,560) آرٹسٹ گہری سچائیوں کا کاشف سمجھا جاتا ہے ۔ وہ اس طرح چلتا جیسے نیند میں چل رہا ہو ۔ یعنی اس کی حیثیت خواب میں چلنے والے کی سی ہے ۔ آرٹسٹ کی فکری غیر شفافیت اس کے پیغام کی رمزیت اور متنازع فی فطرت سے ہم آہنگ ہوتی ہے ۔ 11

جیسا کی پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہیگل کے نزدیک آرٹ کی یہ لازمی خصوصیت ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ۔ مراد یہ کہ آرٹ بنیادی طور پر تعریف کی منطقی حدود سے باہر ہے ۔ جو آرٹ بھی بقول ہیگل فکر انگیز پیغام کا حامل ہو یا فکر کے فروغ کا وسیلہ قرار پائے اسے آرٹ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ تفکر کی بنیاد پر استوار آرٹ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا ۔ اس قسم کے آرٹ میں ہم تعقلاتی سطح پر واضح ہوتے ہیں تو آرٹ لایعنیت اور فضولیت کا شکار ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ آرٹ کی اندرونی منطق کا تقاضا ہے کہ اسے ناقابل تعریف ہونا

چاہیے۔ گویا اس کا ابہام اور اخفا کی چادر میں ملفوف ہونا ضروری ہے۔ اصولی طور پر آرٹ شعور کی ایک ایسی واردات کے بطن سے جنم لیتا ہے جو کسی بھی طرح کے فکری، منطقی اور تعقلات کی پابند نہیں ہوتی۔ چوں کہ آرٹ فکری منطق کی نفی کرتا ہے اس لیے ہیگل اس کی مثال اسپغول سے دیتا ہے جس میں کچھ نہیں ہوتا اور بہت کچھ ہوتا بھی ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ آرٹ کا تعلق شعور کی وجدانی سطح سے ہے عقلی سطح سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روح مطلق آرٹ کی سطح سے بلندتر ہوتی ہے۔ اب چوں کہ آرٹ خارجی حسی حقیقت سے ماورا نہیں ہوسکتا اس لیے اس کا روح مطلق سے براہ راست تعلق نہیں بنتا۔ ہیگل نے فکر کو آرٹ اور مذہب سے بلندتر حیثیت دی ہے۔ اس کے نزدیک انسان ایک روحانی ہستی کی حیثیت سے اس وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ سوچتا ہے۔ انسان کو روح کو آزادی کی خاطر آرٹ سے آگے جانا پڑتا ہے جہاں فکر میں فطرت کے ساتھ اعلیٰ قسم کی روحانی وحدت موجود ہوتی ہے۔

تعقلاتی شفافیت کی اولیت کا یہ تصور ہیگل کی وجودیات (Ontology) سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن یہ تصور اس کے نظریہ آرٹ کو ایک ایسا موڑ دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دانش وروں کے تصور آرٹ سے قریب تر ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ کسی بھی حوالے سے وولف اور بام گارٹن ایسے لوگوں کا حامی نہیں جو آرٹ کے عقلیت پسند نظریے کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ تو ان کے برعکس کانٹ کے تصور فن کا حامی ہے۔ ہیگل کے تصور فن میں آرٹ کنفیوز ڈ قسم کی استحضاریت کی پیداوار نہیں۔ یہ تو ایک مخصوص طرح کے وقوف و احساس کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اس وقوف و احساس کو اس نے فنکارانہ تخیل (Imagination) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک وقوف و شعور یا تخیل کی یہ واردات فن کی پیدائش کا اصلی اور خالص ذریعہ ہے۔

بلا شبہ تخیل کی اس تخلیقی جہت کا انحصار قدرت کی عطا کردہ نعمتوں پر ہے۔ ان قدرتی نعمتوں کو بالعموم روح کے اندر موجود ایک مخصوص قسم کی اعلیٰ صلاحیت کا نام دیا گیا ہے۔ ہم اس صلاحیت کو آرٹسٹ کے اندر موجود فطری جھکاؤ یا جبلی تحریک بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تخیل ایک جبلی انداز کی تخلیق کاری کا سبب ہے۔ آرٹ کے کام میں صورت پذیری اور حسیاتی فعلیت کی خصوصیات اس پر دال ہیں کہ آرٹ موضوعیت اور مخصوص قسم کی روحانی داخلیت کا پابند ہے۔ آرٹ کا کام کوئی بھی کرسکتا ہے۔ ہنر سیکھنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن جہاں تک خالص آرٹ کا تعلق تو اس میں اعلیٰ قسم کی فنکارانہ صلاحیت (Talent) اور نبوغ (Genius) کے بغیر معجزہ فن کی نمود ممکن نہیں ہوتی۔ 12

تخیل کے تصور کی تشریح کی جائے تو اسے عقلی عنصر بھی کہا جا سکتا ہے لیکن ہیگل کے نزدیک اس کا تعلق خاص طور پر اشراق روح کے دائرے سے ہے۔ چنانچہ تخیل کو وقوف و شعور کے ایک ایسے دائرے کے اندر رہ کر

کام کرنا ہوتا ہے جس کا منطقی اور حسابیاتی دانش سے کوئی واسطہ ہے نہ تعلق ۔ تخیل کا واسطہ حسی اظہار کی دنیا سے ہے ۔ لہٰذا حسیات کی عمل کاری کے بغیر تخیل کی صورت پذیری ناممکن ہے ۔ جب تخیل اور حسیات کا باہم وصال ہوتا ہے تو آرٹ جنم لیتا ہے ۔ اسی تناظر میں ہیگل نے آرٹ کو حسیاتی سطح پر اندھیرے اجالے کا کھیل قرار دیا ہے جس میں شکلیں، آوازیں اور قابل تصور خیالات حسیاتی وجود میں ڈھل کر منظرنامے کا حصہ بنتے ہیں ۔ مزید یہ کہ آرٹ میں حسی اشکال و اصوات خود اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتیں ۔ یہ تو ایک مخصوص مقصد یا اعلیٰ روحانی دلچسپیوں کی تسکین کا ذریعہ ہوتی ہیں ۔ حسی اشکال اس قدر رطافت ور ہوتی ہیں کہ شعور کی گہرائیوں سے رد عمل یا بازگشت کی صورتوں کو ہٹا کر ذہن کی سطح پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ جب روحانی کیفیات حسی ابعاد میں ملفوف ہو کر سامنے آتی ہیں تو اندھیرے اجالے کا کھیل کا یا دوسرے لفظوں میں آرٹ کا کھیل وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ ہیگل نے فن کار کی مخیلہ میں وقوع پذیر روحانی حقائق (جن کا تعلق روح زماں سے ہے) کی حسیاتی تشکیل کاری کے اس کھیل کو آرٹ کا نام دیا ہے ۔ 13

اب جہاں تک آرٹ کے ابلاغ کا سوال ہے تو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فکر و استدلال کی زبان آرٹ اور فن کی زبان سے مختلف ہے اور ہونی بھی چاہیے ۔ عقل و استدلال کی زبان نہ صرف بیانیہ بل کہ شفافیت کی طلب گار ہوتی ہے ۔ اس میں جو بھی موضوع یا جو کچھ پیش نظر ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا اخفا یا ابہام نہیں ہوتا ۔ چنانچہ اسے مکمل تفصیل اور منطقی درستگی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے جیسے پورٹریٹ بنانے میں تمام تفاصیل کی نقل بمطابق اصل کرنا ضروری ہے ۔ آرٹ تعقلات کی شفاف عمل کاری سے بالکل مبرا ہے ۔ یہی سبب کہ فلسفہ کے وقوف اور آرٹ کے وقوف میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ اگر فلسفہ میں روح مطلق سے رابطہ شفافیت پر مبنی ہے تو آرٹ میں رابطے Obscure Inspiration کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ یہی فرق دونوں کے اظہاری بیانیوں میں بھی موجود ہے ۔

ہیگل کی آرٹ تھیوری اگرچہ مصوری، سنگ تراشی اور آرکیالوجی ایسے تمام مظاہر کا احاطہ کرتی ہے لیکن وہ کانٹ کی طرح شاعری کو سب سے اعلیٰ درجے پر فائز کرتا ہے ۔ شاعری اس کے نزدیک مصوری اور موسیقی کی مانند داخلیت پسند ہے ۔ موسیقی کا تعلق صوت و آواز سے ہے جو بذات خود زیادہ تر ایتھر سے منسلک ہے ۔ مصوری کی دنیا قابل دید مجرد کی دنیا ہے ۔ جب کہ شاعری لفظوں کی دنیا ہے جس میں آواز نشان کی روحانی حقیقت کو مس کرتی ہے ۔ یوں بقول کانٹ شاعری آرٹ کی کامیاب ترین مثال ہے ۔ ہیگل نے اسی لیے شاعری کی زبان پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ شاعری کی زبان کو وہ بیانیہ کی بجائے تشریحی زبان کے طور پر لیتا ہے جس میں مبہم وقوفی کیفیات (Intuitive Intimation) کی نہایت فرض شناسی سے تشریح کی جاتی

ہے۔ ہائیڈیگر نے شعری زبان کے اس طریق کار کو لفظی انکشاف (Disclosur) کے تصور سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ 14

ہیگل کی آرٹ تھیوری میں تاریخ کے تقاضوں کی اہمیت ناگزیر ہے۔ کیوں کہ اس کے خیال میں ثقافتی نظام وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے تخلیقی عمل کی آبیاری کرتے ہیں۔ انفرادی آرٹسٹ کی تخلیقی عمل میں اہمیت کسی حد تک بجا لیکن ہیگل کی دوزمانی (Diachronic) اپروچ تاریخی صورت حال اور ثقافتی نظام کی ترقی کے پیمانے کو ہی تخلیقی عمل کی درجہ بندی کا معیار قرار دیتی ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ تخلیقی عمل کی کامیابی کا تعلق ثقافتی صورت حال سے ہے۔ ثقافتی نظام جتنا متمول ہوگا اتنا ہی تخلیقی عمل ارفعیت کا حامل ہوگا۔ اسی لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہیگل کا فلسفۂ آرٹ اس کے فلسفۂ تاریخ کی عمل داری کا پھیلاؤ ہے۔ 15 مارکس بھی آرٹ کی عصری اور ثقافتی قدر و قیمت کے حوالے سے ہیگل کا مقلد ہے۔ دونوں کے یہاں ہر تخلیقی جست کو انفرادیت کی بجائے ثقافتی ارتقاء کے اگلے قدم کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ہیگل اور مارکس دونوں اُس پیغام میں زیادہ دلچسپی لیتے جس کی ترسیل فن پارے کے ذریعے کی جاتی ہے بہ نسبت اس متن کی ترسیل میں جس پر آرٹ کے کام میں قصداً توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ 16

جیسا کہ پہلے کہیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہیگل کے یہاں آرٹ روح مطلق کی ایک ہیئت کے طور پر تاریخ میں ارتقا پذیر ہے۔ اس کے خیال میں آرٹ کی ترقی کا شاندار دور یونانی تہذیب کے دوران وقوع پذیر ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب آرٹ کو پہلے پہل تصور یا آئیڈیا کو نہایت مناسب انداز میں پیش کرنے پر قدرت حاصل ہوئی۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یونانی تہذیب میں اس دوران ارفع قسم کی استحضاریت کا حصول ممکن نہیں ہوا تھا۔ یونانی نقطۂ نظر یہ تھا کہ آئیڈیا کی حسیاتی ہیئت میں پیش کارہ کا واحد ذریعہ بالآخر انسان ہی ہے کیونکہ اہل یونان کے نزدیک انسان ایک آتما ہے، روح ہے۔ اس لیے آرٹ ان کے نزدیک روح کی آزادی کا آرٹ تھا۔ روح جو انسان کی تجسیمی فکر سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ یہ وہ عظیم عہد تھا جب خداؤں کو انسانی صورت میں دیکھا اور سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں سے پہلے کی اقوام کے ہاں خدا کا تصوا چوں کہ ماورا اور Sublime کے معنوں میں لیا جاتا۔ اور خیال کیا جاتا کہ خدا کو حسی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا، اس لیے مصریوں نے اسے جانوروں کی علامتی صورت میں پیش کیا۔ چوں کہ خداؤں اور جانوروں کی علامتیں ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتی تھیں اس لیے ہیگل کے مطابق قبل یونانی آرٹسٹوں کے یہاں ایک خاص قسم کا ذہنی بوجھ منعکس ہوتا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عجیب و غریب ہستیوں کے مجسمے اور باش ریلیف بنائے تاکہ حقیقت مطلق کی لامحدودیت اور ماورائیت کے باری میں آگاہ کیا جا سکے۔

بہر حال ہیگل کے نزدیک یہ طے ہے کہ یونانی آرٹ حقیقت مطلق کا وژن بحیثیت آزاد موضوعیت حاصل کرنے میں کامیاب رہا جس کے نتیجے میں انسان اور خدا کو ایک دوسرے سے جوڑ کر آرٹ نے خدا کو انسانی روپ میں متشکل کیا۔ یونانیوں کے یہاں خدا کوئی بے صفت ہستی نہیں نہ ہی اس کی آفاقیت خلا کی آئینہ دار ہے۔ خدا ان کے نزدیک روحانی انفرادیت کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی کی یہاں دیوتا ذات اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ انھوں مخصوص قسم کی صفات وخصائص سے متصف کیا گیا ہے۔ یونانیوں نے اس طرح آرٹ کو روح مطلق کی مادی پہچان اور اظہار کا ذریعہ بنادیا۔ چنانچہ اس کے نزدیک تجسیمیت (Anthromorphism) کلاسیکل آرٹ کی ممتاز شناخت ہے۔ کلاسیکل آرٹ (جسے ہیگل نے آرٹ کی معراج کا زمانہ قرار دیا ہے) میں مواد اور ہیئت کمال توازن اور ہم آہنگی کی حالت میں نمودار ہوئے۔ یہاں آرٹ روحانی طور پر کلیت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ یعنی اس میں آفاقیت کی بجائے جزیات اور علاقائیت کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے۔ کلاسیکل آرٹ کی بہترین مثال یونانی فن تعمیر ہے۔

رمزی آرٹ کا آغاز مصر سے ہوا۔ مصریوں کا تصور کائنات فونکس، اہراموں، میمنن مجسموں، مندروں اور obelisks کی علامتوں میں موجود ہے۔ مصری آرٹ میں انسانی ذہن روحانی تصورات کی علامتی صورت میں نشاندہی کی گئی ہے۔ اس صورت گری میں علامت و رمزیت اظہاری وسیلہ کے طور پر بروئے کار تو آتی ہے لیکن مکمل شعوری کیفیت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ رمز یا علامت کا جوہر یہ ہے کہ یہ معنی تجویز کرتی ہے لیکن اس کو بیان کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ رمزیت ایک مادی شکل کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی۔ تاہم جس شے کی علامت یہ بنتی ہے وہ فکر کا کوئی پہلو ہوتا ہے یا روحانی معنویت (Significance) کی کوئی جہت۔ اس طرح رمزی آرٹ میں علامت سے مراد مادی تجسیم ہے جب کہ معنویت اس کا مواد ہوتا ہے۔ رمز اور اس کی معنویت کے درمیان ربط کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے تکون کے تین زاویوں اور تثلیث (خدا، یسوع اور روح القدس) کے درمیان ایک مخصوص ربط نظر آتا ہے۔ لیکن اس ربط کے باوجود رمز کو معنی سے مختلف بھی ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں رمز کا بطور علامت کردار مفقود ہو جاتا ہے جس سے علامت خالص پیایے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ رمزیت اور ابہام کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ابہام اس اسراریت کی وضاحت کرتا ہے جو رمزی آرٹ کا غالب عنصر ہے۔ ہیگل نے اس کی مثال قدیم مصری فن تعمیر سے دی ہے جس میں حسی اور روحانی دنیاؤں کے درمیان علاحدگی بالکل واضح ہے۔ مصری آرٹ خالص رمزی انداز کا حامل ہے۔ ہیگل نے لکھا ہے کہ حسی اور روحانی دنیاؤں کے درمیان شعوری ربط و اختلاف کو ہندی اور ایرانی وحدت الوجودی شاعری میں خوب دانش مندی سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ ہیگل اسے رمزیت کی بہترین

مثال قرار دیتا ہے۔

عبرانی ادب وفن کا مسئلہ قدرے مختلف ہے۔ عبرانی شعرا اور انبیاء نے Sublime آرٹ کا افہام ماورا ءاور مادے کے درمیان علاحدگی کی بنیاد پر کیا۔ ان کے یہاں حقیقت مطلق ایک طرف ہے عالم مظاہر (Phenomenal Word) دوسری طرف۔ حقیقت مطلق کو کائنات کا جوہر قرار دیا گیا۔ ذات مطلق ہی Substance ہے باقی جو شے بھی ہے حادث ہے۔ حق تعالیٰ کو کائنات کی جوہری حقیقت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض ظلی موجودگی ہے۔ یہ ظاہر اور مشہود کا کھیل ہے۔ ہیگل اس تھیوری کو مسترد کرتا ہے کیوں کہ یہ تھیوری ربط وافتراق کی بیک وقت موجودگی کے انکار پر منحصر ہے۔ وہ عجمی ہندی وحدت الوجودی تھیوری پر صاد کرتا ہے جو آرٹ میں ماورائیت اور حضوریت کی بیک وقت موجودگی کی دعوے دار ہے۔ وحدت الوجودی آرٹ میں حقیقت مطلق کو حسیات وظواہر کے دائرہ کار میں منکشف کیا جاتا ہے جس سے حسن کی پر اسراریت اور معنویت کا باہم وصال ایک ایسی واردات میں تبدیل ہو جاتا ہے جو شاعری کی حسین ترین صورتوں کو جنم دیتی ہے۔

ہیگل نے یہاں جلال (Sublime) اور حسن کے درمیان فرق کی وضاحت بھی کی ہے۔ جلال اس کے نزدیک ایک ایسا تجربہ ہے جو لامتناہیت کے جلو میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ کسی حسی میڈیم کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ ایسا حسی میڈیم جو اس لامتناہی تجربے کو مناسب انداز میں بیان کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اظہار وبیان کے تمام قرینے لامتناہی تجربے کو بیان نہیں کر پاتے۔ گویا جلال کے تجربے کا احاطہ کرنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حسن وجمال کے تجربے میں حقیقت مطلق کو ایک مناسب حسیاتی جسم میں اظہار ممکن العمل ہوتا ہے۔ حسن کے تجربے میں حسیات اور ماورائیت کے درمیان مکمل ہم آہنگی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ 17 ایک ایسا ہم آہنگ ربط جو ہیگل کے خیال میں آرٹ کی بنیاد ہے۔

آرٹ کی تفضیلی درجہ بندی میں ہیگل نے رومانوی آرٹ کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ رومانی ادب میں یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ کوئی بھی حسیاتی شکل روح کا مناسب احاطہ نہیں کر سکتی۔ روح اس طرح جسمی حدود سے باہر اپنی موضوعیت میں سمٹ جاتی ہے۔ اس سے نئی قسم کا آرٹ جنم لیتا ہے۔ اس قسم کے آرٹ میں روح اپنی ہی دنیا میں سرگرداں ہوتی ہے تا کہ حس کے کھونٹوں سے نجات پا سکے اور مادی جسمیت سے فراغت پا کر خود میں مرکوز ہو سکے۔ یوں مادی پہلو اس سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ تب روح مادے پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اس قسم کے آرٹ کو رومانی آرٹ کا نام دیا گیا ہے۔ رومانوی آرٹ کے ذیل میں ہیگل نے مصوری، موسیقی اور شاعری کو شمار کیا ہے۔

ہیگل کے خیال میں کوئی بھی آرٹ شہ کار در اصل اس جسمیت کا عکاس ہوتا ہے جو حقیقت مطلق سے

متعلق ومنسلک ہے۔ آرٹ کے شہ کار میں روح کائنات بذات خود جلوہ فگن ہوتی اس تصور جمال میں حس اور مثالیت کا ادغام لازم ہے۔ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو اس کے یہاں روح، تمثال اور جوہر کو حس اور مادی احوال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس دعوے کی توجیہ یہ ہے کہ اس نے آرٹ کے ارتقائی درجات کا ذکر کرتے ہوئے یونانی آرٹ کے کلاسیکی عہد کو آرٹ کی معراج کا زمانہ قرار دیا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں اس دور میں فن کار پہلے پہل تصور یا خیال کو نہ صرف نہایت مناسب انداز میں پیش کرنے پر قادر ہوا بلکہ حقیقت مطلق کے وژن کو بحیثیت آزاد موضوعیت مصور کرنے میں کامیاب رہا۔ بقول ہیگل اس دور کے یونانی آرٹ نے انسان اور خدا کو ایک دوسرے سے جوڑ کر آرٹ میں خدا کو انسانی روپ میں پیش کیا۔ آرٹ کا یہ تصور جو ہماری آنکھوں کے سامنے ابھر رہا ہے آرٹ کو ایک روحانی واردات میں تبدیل کر دیتا ہے لیکن اس روحانی معرکہ آرائی میں حس اور جسم کی حیثیت بالآخر محض آلہ کار کی رہ جاتی ہے۔ ایک ایسے بے حیثیت ماتحت (Subaltern) کی جس کا مقصد وجود ایک برتر حقیقت کے مقاصد کی تکمیل ہے۔ اس سلسلے میں پہلی نکتے کی بات یہ ہے کہ ہیگل کی اس تشریح کے مطابق آرٹ ایک طرح سے مذہب اور مابعدالطبعیات کی ہی توسیع ہی ہے۔ دوسری نکتہ یہ کہ اس تشریح سے آرٹسٹ کی ذات بھی حقیقت مطلق کے اظہار کا ذریعہ یا آلہ کار بن جاتی ہے۔ یہ دونوں نکات کانٹ کے نظریہء آرٹ کی نفی کرتے ہیں۔ اس نے آرٹ کی تفکری تشریح کو مسترد کر دیا تھا اور لکھا تھا کہ کسی بھی آرٹ کے شہ کار میں موجود حسیت کی تفکری تشکیل ناممکن ہے۔ اسے کسی خارجی غایت کی بنیاد بنایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس پر خارجی غایت کی تعقلاتی تعریف کو تھوپا جا سکتا ہے۔ 18 لیکن ہیگل کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کانٹ کے بالاصرار انکار اور اپنے دعوے کے باوجود Internal Teleology کے نام پر مقصدیت کو آرٹ میں بغلی دروازہ فراہم کر دیا۔ یہ ہیگل کی جمالیات سے متعلق تھیوری کا بنیادی تضاد ہے۔

ہیگل کے آفاقیت اور کلیت کے تناظر میں اس کا نظریہء فن انفرادیت اور ذاتی ذوق کی تسکین کی بجائے اجتماعی روحانی اور ثقافتی معیارات کی تکمیل کا پابند ہے۔ روح (Geistes) کے اعلیٰ ترین تقاضوں کی تسکین کے لیے یہ از حد ضروری ہے۔ آرٹ کی اہمیت ہیگل کے یہاں ایک تو یہ ہے کہ یہ روح کائنات کے عکس کو حسیات کے لبادے میں پیش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آرٹ مختلف شعبہ جات کی صداقتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے کائناتی نظام کی ہائرارکی میں آرٹ کی تمام تر اہمیت کے باوجود فلسفہ اور مذہب کے بعد آرٹ کا مقام آتا ہے۔ آرٹ کی حیثیت اس طرح فکر کے ماتحت ہے۔ 19 اگرچہ اس نے آرٹ کو روح کی آزادی کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ اسے روح کی عمل داری میں شمار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہیگل کا خیال ہے کہ آرٹ کو روح مطلق کی ایک صورت کے طور پر تاریخی تبدیلیوں میں سے گزرنا پڑتا

ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مذہبی حقیقت سے وابستگی کے دعوؤں اور فلسفے کے بھاری بوجھ کے نیچے دبا ہوا آرٹ اپنی خودمختاری کو کیونکر قائم رکھ سکتا ہے۔ آزادی سے کس طرح کام کرسکتا ہے؟ حالاں کہ آزادہ روی اس کی بنیادی شرط ہے۔

نطشے نے سب سے پہلے ہیگل کے نظامیاتی فلسفے کے جوئے کو اتار پھینکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہیگل کے حقیقت مطلق، جوہریت کلیت، روح عصر اور عقل وخرد کی اجارہ داری ایسے پرشکوہ نظریات نطشے کے یہاں ایک ایک کر کے زمیں بوس ہوتے نظر آتے ہیں۔ نطشے نے نہ صرف ہیگل کے فلسفۂ تاریخ کو مسترد کر دیا بل کہ مسیحیت کی بنیاد ہستی مطلق کی موت کا اعلان کر کے روح کے ظہور کی کہانی ہی ختم کر دی۔ مارکس نے اگرچہ ہیگل کی جدلیت اور مثالیت پسندی کو سیاسی اور تاریخی نظریات کی نظامیاتی تشکیل میں برتا لیکن اس نے مجموعی طور پر ہیگل کی مابعدالطبیعیات کو مسترد کر دیا۔ اس نے ہیگل کے برعکس حقیقت کو بالآخر حقیقی سماجی اور اقتصادی وجوہات کی پیداوار قرار دیا۔ ہیگل کی روحانی جدلیت کا تصور بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں ہی مسترد ہو چکا تھا۔ اگرچہ فرینکفرٹ سکول نے سماجی نظام کو ایک وحدت کے طور پر تفہیم میں ہیگل اثرات قبول کیے لیکن مابعدجدیدیت کے بنیادگزاروں نے اس کے ہر تصور کی افادیت واہمیت کی نفی کی۔ بل کہ ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے ان تصورات کو سماجی جبر اور جمالیات دشمنی کا شاخسانہ بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب Being کی بجائے Becoming کو، روح اور جوہر کی بجائے وجود کو، کلیت کی بجائے جزئیت کو، مطلقیت کی بجائے عارضیت کو اور کائنات کی بجائے مقامیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس نئے تناظر میں انسان، خودی (Self)، تھیوری، تاریخ اور فلسفہ کی موت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

فرینک فرٹ اسکول کا سرخیل اڈورنو بیک وقت ہیگل کا حامی ہے اور اس کا نقاد بھی۔ اس نے ہیگل کی جدلیات کے الٹ منفی جدلیات کا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق ہیگل کا فکر اس لیے جدلیاتی ہے کہ یہ کل کو جز سے ملاتا ہے۔ اتحاد اور اختلاف کو جوڑ لیتا ہے۔ فرد اور سماج کو مربوط کرتا ہے۔ اڈورنو نے تسلیم کیا ہے کہ ہیگل کی ان حدود کے اندر رہ کر سوچنا ہماری ضرورت ہے کیوں کہ سرمایہ داریت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک منضبط اور مکمل وحدت کی صورت میں سامنے آئے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اڈورنو کا دعویٰ ہے کہ ہمیں مثبت کی بجائے منفی جدلیت کا طریقہ کار استعمال کرنا چاہیے تا کہ ہم سرمایہ داریت کے ان تمام استدلالی ہتھکنڈوں سے واقف ہو سکیں جو سماج کو منظم سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔

اڈورنو کے خیال میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے منفی جدلیات کی ضرورت ہے تا کہ تفکر یہ جان سکے کہ وہ کونسا رشتہ ہے جو اجتماعیت کی تشکیل کرتا ہے اور اجتماعیت اور کلیت کے دعوؤں کے سامنے جھکنے پر مجبور

کرتا ہے۔ بہتر تفہیم کی اس کوشش میں اڈورنو نے ہیگل کے بہت سے مقولوں کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اگر ایک طرف ہیگل کل کو سچ سمجھتا ہے تو اوڈورنو اعلان کرتا ہے کہ کل سچ (True) نہیں۔ وہ ہیگل کے اس منطقی دعوے کو مسترد کرتا ہے جو عینیت اور لا عینیت کی عینیت کا دعوے دار ہے۔ ہر منفی جدلیت لا عین non-identical سے وفاداری کرتی ہے اور اس زیر دست سے بھی جسے ہیگل کے کلی فکر کے نام پر سسٹم نے محکوم بنا دیا۔ اوڈورنو کو یقین ہے کہ وہ منفی جدلیت کے ذریعے استحصال برداشت کرنے والے محکوموں اور ماتحت لوگوں کا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔ جب بھی جدلیت پر بات کی جائے اڈورنو کا یہ نقطۂ نظر تناظر میں موجود رہے گا۔ اس نے اپنی جمالیات کی تشکیل بھی اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر رکھی ہے۔

پھر اوانت گارد آرٹ کی مثال ہمارے سامنے ہے جس نے تاریخ اور روح کی عمل داری کا بوجھ سر سے اُتار پھینکا ہے۔ آرٹ کو اب اسطور، ارادے اور ذاتی اظہار کے تنقیدی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان مصوروں کے مطابق جدیدیت کی آفاقیت کی جگہ اوانت گاردے کا استعمال آرٹ کی طلسماتی جڑوں کو لغو اور علامت کے ملاپ سے منکشف کرنے کے کام آئے گا۔ اس طرح آرٹسٹوں کی ایک ایسی نسل تیار ہوگی جو شامن ہوں گے اور بوہیمین بھی اور ثقافتی طور پر ان کی حیثیت خانہ بدوشوں کی سی ہوگی۔ اس نظریاتی اور سیاسی خانہ بدوشیت کو مابعد جدید زندگی میں بڑھ چڑھ کر خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ لیکن۔۔۔ سوال یہ ہے کہ کیا آرٹ کا کام بے گھر ہونے یا خانہ بدوشیت کی تھیوری کو فروغ دینے تک محدود ہو چکا ہے؟

دریدا ہیگل کی مابعدالطبعی حضوریت کا منکر ہے۔ حضوریت جس کا مطلب ہے کہ کائنات کی ہر شے اور لفظ میں روح اور معنی پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ چوں کہ وہ معنی اور روح پہلے سے موجودگی کا قائل نہیں، اس لیے کسی متعین معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چوں کہ معانی آب رواں کی طرح ہیں اس لیے ان کا التوا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے بس متن (Text) کے اندر ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ متن سے باہر کوئی چیز نہیں۔ چوں کہ کائنات بھی ایک متن (روحانی متن نہیں) ہے۔ کائنات کے باہر کچھ نہیں۔ کائنات کو معنی فراہم کرنے کی خاطر خدا اور روح مطلق کو بیچ میں لانا دراصل آرٹ کو مابعدالطبیعات میں تبدیل کرنا ہے۔ اس عمل کو Logocentric قرار دیا ہے۔ یہ عمل آرٹ کو عہد نامہ جدید کے تصور تخلیقیت سے جوڑتا ہے۔ یہ وہ ماورائی عمل ہے جسے وٹگن اسٹائن نے اپنی مخصوص زبان میں ذہنی خناس کا نام دیا ہے۔

یورپ میں ہیرو اور برتر انسان (بطور مثال ہٹلر، چرچل، سٹالن، مسولینی) کے تصور کو ہیگل، نطشے اور ہائیڈیگر نے فروغ دیا۔ ان تینوں فلسفیوں نے ایک ہمہ صفت ہیرو کی تجلیل کیا اور اسے عالم انسانیت کا الوہی نجات دہندہ بنا کر پیش کیا۔ ہیگل نے اس ہمہ صفت ہیرو کو روح کائنات کا مظہر قرار دیا۔ ہیرو پوجا کی ایک

مثال نپولین کو دیکھ کر ہیگل کا تحیر زا ردعمل تھا۔ ہیگل نے لکھا ہے۔

> I saw the Emperor – this world-soul – riding out of the city on reconnaissance. It is indeed a wonderful sensation to see such an individual, who, concentrated here at a single point, astride a horse, reaches out over the world and masters it ... this extraordinary man, whom it is impossible not to admire. 20

ہیگل کے پسندیدہ ہیرو (نپولین) کی اس تصویر کو عمومیت کا رنگ دے کر اس کی تعبیر کی جائے تو اس مراد یورپ کے وہ سب نوآبادیاتی فاتحین ہیں جنھوں نے روح کائنات کا روپ دھار کر بہت سی خونیں مہمات وفتوحات کے ذریعے امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا کے براعظموں پر یورپ کی حاکمیت کے پرچم گاڑھ دیے۔ اس سلسلے کا آخری خوفناک معرکہ دوسری جنگ عظیم کی صورت میں یورپ کے میدانوں میں برپا ہوا۔

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہیگل نے آرٹسٹ (مصور، موسیقار، ادیب اور شاعر) کو روح مطلق کا پیش کار بنا کر اسے تقدیس اور طاقت کی علامت بنا دیا۔ لیکن یہ صرف اسی کی تخصیص نہیں۔ شلنگ، شلر اور شلیگل سب تخیل اور تخلیق کی الوہیت کے رومانس میں گرفتار تھے۔ یاد رہے کہ جرمن تصوریت اور جرمن رومانیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ نطشے بھی تمام تر باغیانہ تصورات کے باوجود تمام عمر اسی سحر انگیز کیفیت کے زیر اثر رہا۔ اس نے سپر مین کی تجلیل کی اور خالص آرٹ کی مثالوں کو جینئس کی تخلیق قرار دیا۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ انسانی تخلیقی عمل الوہی تخلیقی عمل کی ہی دوسری صورت (Incarnation) ہے۔ یہاں نطشے پر ہیگل کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ گویا نطشے ہیگل کے انکار کے باوجود اس کا اقرار کر رہا ہے۔ آرٹسٹ ہیگل اور نطشے دونوں کے خیال میں وہ جینئس ہے جو روحانی ارتقا اور تخلیق عمل کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہے۔

لیکن الوہی تخلیقیت اور نبوغ کے یہ سب نظریات اب رفت وگزشت ہو چکے ہیں۔ ان کی فکشن اور الیوژن سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی۔ آرٹ نے ہیئت کے جبر، موضوع کی آمریت اور معنی کی حتمیت اور لفظ کی الوہیت کے ہر دعوے کو مسترد کر دیا ہے۔ آرٹ اب عمیق روحانی حقائق اور مطلق بصیرتوں کا امین نہیں رہا اور نہ ہی آرٹسٹ فنی اقدار کے کسی غائی محرک کا پشت بان ہے۔ معنی اور تخلیق جس لوگوس کی گود میں پروان چڑھتے تھے وہ خود بے حضوریت کا شکار ہو چکا ہے۔ اب آرٹ کی دنیا مارسل ڈچ ایمپ اور اینڈی وارہول ایسے لوگوں کے کنٹرول میں ہے جو کسی قسم کی تکمیلیت، کلی حقیقت، معنی، لوگوس اور برتر غایت (Telos) کو

نہیں مانتے اور نہ ہی لفظ کی الوہیت کے دعوے کو درخور اعتنا سمجھتے ہیں۔

حواشی

1) Maurice Merleau-Ponty trans. Herbert L and Patricia Allen Dreyfus, Sense and Nonsense, Northwestern University Press, p. 63, 1964,

2) Keith Ward, God and Philosophers, p. 92, 2009.

3) Hegel, Aesthetics Vol. I P.72

4) Hegel, ed. Michael Inwood, Oxford Universty Press. 1985 p. 19

5) Keith Ward, Ibid.,p. 90

6) G,W.E.Hegel On Art, Religion, Philosophy, ed. J Glenn Gray, p. 71, 1970

7) Hegel, p. 446

8) W.T.Stace, The Philosophy of Hegel, A Systematc Exposition, Dover Publication Inc, p.445, 1924.

9) Stace. P. 447

10) Hegel, On Art , Religion and and Philosophy, p. 76

11) Stace, p. 473

12) Hegal, p. 70

13) Hegel, p. 67.

14) Charles Taylor, p,475.

15) The Philosophy of Art, Theodor Gracyk, 2012, p.52.

16) Novtz, "Message 'In' and Message 'Through' Art " Australian Journal of Philosophy 73 : 199-203.

17)Stace, The Philosophy of Hegel, A Systematc Exposition, Dover Publication Inc, p. 457, No. 663.

18) Charles Taylor, Hegel, Cambridge University Press, New York, 1975, p. 469

19) Charles Taylor, Hegel. P. 478.

20) Pinkard, Terry. Hegel: A Biography. Cambridge University Press 2000.

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسد اریب

اردو کے جلوس میں فارسی کی چہل پہل

ابھی کل کی سی بات ہے۔ ہمارے گھر کی دیواروں پر فارسی قطعات کے طغرے لٹکائے جاتے، ہمارے دالانوں، ایوانوں کے پردوں پر پڑے نقش ونگار اور چلمنوں کے گوٹے کناروں پر، سعدی و حافظ کے اشعار کندہ کیے جاتے، اشرافیہ میں بھی جو ذرا رنگین مزاج اور نشاط پسند تھے، وہ کچھ اس سے سوا خیام کے بادہ و جام کو عرفان و آگہی کا استعارہ جان کر، بستر کی چادروں، تکیوں کے غلافوں، کٹوروں کے سرپوشوں اور دسترخوانوں پر اس کے چھپے ہوئے شعروں کو پسند فرماتے اور ان کی نمائش کرتے۔ گویا فارسی ہماری تہذیب کا عروسی پیرہن تھی جس کے برتاوے اور دکھاوے پر تسکین خاطر کا سامان میسر آتا۔ انہی اشعار و اقوال سے ہم نے زندگی کا چلن سیکھا۔ میں ابھی چھ برس کا بھی نہ تھا کہ اپنے گھر کے شمالی دالان کی پیشانی پر لٹکے طغرے سے صلّو علیہ وآلہ والے چاروں مصرع یاد کر چکا تھا۔ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق، والا شعر بھی وہیں کہیں سے اپنے بچپن میں میں نے پڑھ لیا تھا۔ اب تک پالکی کا بانس بنا، میرے دل و دماغ میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ مسجدوں میں جا نکلتے وہاں بھی فارسی ہی نقش ملتی، اکثر مسجدوں کی اندرونی محرابوں پر، مذہب حنفیہ دارم ملتِ حضرت خلیل والے چاروں مصرعے کندہ نظر آتے۔ جب میں گھر آ کر لہک لہک کر پڑھتا، گھر کے بزرگوں کو کچھ زیادہ اچھا نہ لگتا، ایک دن گلستان سعدی والد گرامی (حضرت احسن بدایونی) سے پڑھ رہا تھا۔ سبق آموختہ مجھے یاد تھا۔ فرفر سنا ڈالا، خوشی ہوئی۔ یہ ان کی ایک خاص ترنگ تھی۔ میں نے حد ادب سے نکل کر، مذہب حنفیہ دارم والے اشعار پر ان کی بے توجہی کا سبب پوچھ لیا۔ فرمانے لگے بطور شاعر، اس مصرع سے ملذذ رہوں کہ "حنفیہ" کا تلفظ یہاں درست نہیں پاتا۔ نون مفتوحہ کو، مسکون باندھ کر شاعر محترم نے طبیعت کو اچاٹ کر دیا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے گھر پر "حبل المتین" کا مطالعہ باقاعدگی سے کیا جاتا، فارسی زبان کا یہ اخبار، برصغیر کے مسلمانوں کو دنیا، نادرشاہی افغانستان، پہلوی ایران، ہٹلر کے جرمنی اور وکٹوریہ کے لندن، شریف مکہ، اور خلافت عثمانیہ، سارے عالم کی خبریں پہنچاتا۔ ۱۳۱۲ سال ہجری بمطابق ۱۹۳۰ء تک یہ جریدہ سانسیں لیتا رہا۔ کلکتے، بالی گنج سے تقریباً ۳۸ برس متواتر چھپتا رہا۔ ۱۹۲۸ء کی اشاعت سے اخبار کی پیشانی کا عکس منسلک ہے۔ ایک ایرانی تاجر جو ادب دوست بھی تھے، نام ان کا جلال الدین حسینی تھا، اس اخبار کے مدیر کل تھے۔

انگریز حکومت، ہند میں آئی، اس وقت تک کہ مضبوطی سے قدم نہ جما لیے، سارے ہندوستان پر نہ سہی، انیسویں صدی کے آغاز تک، ایک بڑا علاقہ ان کے تصرف میں آ گیا مغلوں کی پروردہ فارسی کا سکہ چلتا تھا۔ ہماری اس (اکیسویں) صدی تک آتے آتے ان دوسو برسوں میں فارسی زبان کے یہ گہرے نقوش اس قدر جلد مٹ جائیں ممکن نہیں بہت سے مدرسوں میں اب بھی گلستان و بوستان، فارسی آمد نامہ، وصدر نامہ پڑھایا جاتا ہے۔ بعض خاندانوں خصوصاً قزلباش اور ہزارہ گھرانوں میں فارسی بول چال عام ہے۔ کشمیر کے بعض خاندانوں اور قدیم فارسی زبانوں کے عزا خانوں میں مجلس خوانی بھی، ابھی تک فارسی ہی میں کی جاتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں بطور مضمون اختیاری کے رائج ہے۔ سروس کمیشن، فارسی کے جریدہ، اساتذہ کا اشتہار بھی باقاعدگی سے جاری کرتا ہے۔ بلاشبہ اردو ہماری قومی زبان ہے مگر کسی طور بھی اردو سے فارسی کا رشتہ جدا نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کھال میں کھُلی اور اس کے ریختے میں رُلی ملی ہوئی ہے۔

تاریخ کی سچائیوں میں سے ایک بڑی سچائی یہ ہے کہ فارسی نے اردو کو گود پالا اور پال پوس کے جوان کر دیا۔ جیسے کوئی ماں بچے کو گھٹی چٹائے اور جب وہ پَیّوں پَیّوں چلنے پہ آئے تو اپنے منہ چبایا اُس کے منہ دے اور خوش ہو۔ ہمارے دوست اہلِ ایران یہ نہ سمجھیں کہ برصغیر کے ساکن ہم نشینانِ اردو خدا نہ کردہ فارسی بھلا بیٹھے ہیں۔ زبان اردو کے رگ و ریشے میں فارسی یوں پیوست ہے جیسے ناخون سے گوشت جُڑا ہوا۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر تک فارسی ہمارے عُلما کی زبان، ہماری کتابوں کی روح رواں تھی۔ تفسیر، حدیث، مکتوب، مُراسلت، تصنیف و تالیف، تدریب و تدریس کا سارا نظامِ معاشرت اسی زبان کے بل بوتے پر قائم تھا۔ حتیٰ کہ اردو زبان کی قواعد، اردو زبان کے شعرا کے تذکرے، برصغیر کے مدرسوں میں گلستان و بوستان کا نصاب پڑھایا جانا، نصاب میں اخلاقِ ناصری و اخلاقِ جلالی کا تکملہ کرنا، یہ سب وہ باتیں تھیں جن سے اردو بولنے والوں کا گہرا رشتہ قائم ہوا۔

اٹھارویں صدی کا عرصہ آخر، اردو کے زور شور کا اچھا خاصا زمانہ ہے۔ میر (تقی) نے اسی صدی کے اردو نام آور شاعروں کا حال اپنے فارسی تذکرے 'نکات الشعرا' میں بہ زبان فارسی لکھا۔ مصحفی نے اپنے تذکرے ''ہندی گویاں'' اور میر حسن نے تذکرہ ''شعرائے اردو'' کو فارسی سے آراستہ کیا۔ یہ زبان اہلِ قلم ہی کے لیے جوشن و دستار نہیں تھی کہ اہلِ سیف کے لیے بھی حرزِ جاں تھی۔

سعادت علی خان (برہان الملک) اٹھارویں صدی کے آخر پُر آشوب زمانے میں لکھنؤ آ کر فتح مند ہوئے حالاں کہ اردو، لکھنؤ کے شیخ زادوں، کائستوں اور پنڈتوں کے دلوں پر راج کر رہی تھی مگر فارسی کا ذائقہ، زبانوں پہ ابھی باقی تھا۔ نواب سعادت علی خان نے جب ذرا سنبھالا اور دربار عام بلایا تو جن جن باکمالوں کو

دعوت بھیجی اُن میں سے ایک خوش نام خطاط حافظ نوراللہ بھی تھے۔ نواب نے اُن سے فرمایا: ”مجھے گلستان کا ایک نسخہ لکھ دیجیے۔“ کیا خوب زمانہ تھا! اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ تھے۔ تاریخ نویسوں نے لکھا ہے: نواب موصوف گلستان سعدی کے ایسے شائق تھے کہ سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ حافظ نوراللہ بڑے تنک چڑھے، چیں بہ جبیں، نخریلو شخص تھے۔ بقول عبدالحلیم شرر اور کوئی شخص اُن سے ایسی فرمائش کرتا تو اُس کا منہ ہی نوچ لیتے۔ حافظ صاحب کا فارسی خطِ نستعلیق لکھنے کا وہ دبدبہ تھا کہ اُن کے طغروں اور مرغِ بسم اللہ سے امراء کے در و دیوار سارے ہندوستان میں آراستہ تھے۔ شرؔر نے لکھا ہے، گلستانِ سعدی کے اس نسخے کو لکھنے کے لیے حافظ صاحب نے نواب صاحب سے عرض کیا تو مجھے اَسّی گڈّی کاغذ (یعنی اَسّی رِم) ایک سو قلم تراش (یعنی قلم تراش چاقو) اور خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے تیڑے (یعنی نرکل: وہ سینٹھے جس سے قلم بنتے ہیں) منگوا دیجیے۔ نواب نے فرمائش پوری کر دی۔ حافظ صاحب کی عمر نے وفا نہ کی، گلستان کے سات باب ہی لکھ پائے تھے کہ خطِ اجل آ پہنچا۔ نواب کے دربار میں حافظ صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم پیش ہوئے تو نواب نے ابراہیم سے پوچھا وہ ہماری گلستان کا کیا ہوا۔ ابراہیم نے کہا: ”حضور سرمُوفق نہ پائیں گے، آٹھواں باب مکمل کر کے نذر کروں گا۔

ہمارے مدرسوں کا نصاب ہماری مسجدوں کے محراب اور محلاتِ شاہی کے طاق دیکھیے۔ فارسی کی نایاب کتابیں طغرے، قطعاتِ مجلّی، مُحققات و مُطلیٰ اقوال کلماتِ مقدسہ، اَشعار فارسی مقابرِ سلاطین کے اَلواح، منابر کے نقش، شاعروں کے دیوان، خزائن لغت ہمارے خاندانی شجرے، ہدایات و وَصایہ کا ایک بے بہا ذخیرہ زبانِ فارسی کا ہمارے ہاں اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔ بات بات پر فارسی شعر، مصرعے زبان پر آنے لگتے ہیں۔ یہ ہمارے روزمرہ کا وہ صرفہ ہے جو ہر پڑھے لکھے شخص کے تصرُّف میں صبح و شام آتا ہے۔ ان مصرعوں، شعروں اور کہاوتوں، ضرب و امثال کے بغیر نہ تصویر مکمل ہوتی ہے نہ کوئی مکالمہ، نہ تحریر:

فارسی زبان، ایک زمانہ تھا جب ہم برصغیر کے لوگوں کا اوڑھنا بچھونا تھی، باہم بول چال کی زبان نہ سہی کہ ہندوستانی (آپ اسے جو چاہیں کہیں ہندوی ریختہ، اردو) گلیوں، کوچوں، محلات، محلوں میں، اس وقت دندناتی پھرتی تھی مگر رقعوں، دعوت ناموں، درخواست گزاریوں، وصیتوں، نصیحتوں، یادداشتوں، رقوم، اعداد، صَرف صرفے کے اندراج، ہر جگہ فارسی ہی کا زور زورہ چلتا تھا۔ محمد شاہی عہد سے لے کر غدر انیسویں صدی کے آخر زمانے تک یہی حال رہا۔ برٹش میوزیم لندن میں موجود تحریریں نوادرات و عجائب کے ذخیروں، لکھنؤ، دلی، لاہور، پٹنہ کے اکثر ایسے دفاتر میری نظروں سے گزرے ہیں جو قریب تر زمانوں میں رواجاً لکھے گئے۔ حتیٰ کہ لکھنؤ بھی انیسویں صدی کے پورے سو سال جو اردو زبان کے جشنِ مسرت کا بے پایاں زمانہ ہے، فارسی

کے اس تہذیبی رویے سے منحرف نہ ہو سکا۔ میر انیس نے غالب کے ممدوح اپنے دوست، مفتی میر عباس کے نام جو بہت سے مکتوب لکھے، وہ بھی بہ زبان فارسی ملتے ہیں اور انہی پر کیا موقوف، ایک زمانہ ایسے معمولات سے بھرا پڑا ملے گا۔ میر انیس اردو کے نام ور، جلیل القدر شخص کہلاتے ہیں مگر خط و کتابت اپنے عہد کے اہلِ قلم کی طرح فارسی میں کرتے تھے۔ مفتی صاحب کو خط لکھتے ہیں:

قبلہ وکعبہ، خلوصِ کیشاں دام ظلکم عالی

ایں زبان کج مج بیاں را چہ یارا کہ بمدح اشعار آبدار نماید، الحق درایں بیاں کہ اعجاز طرازی وسحر پردازی بہ ذات فیض آیات ختم گردید -----

چوں تامل کرد با فکر سلیس۔ از پئے تاریخ آں طبع انیس
داد ہاتف ایں صدائے دل پذیر۔ ہست تاریخش کلامِ بے نظیر

تاریخ طبع کتاب، ''تاریخ وفات'' تاسیس عمارت، لوح مزار، سنگ جبین منزل کہاں کہاں اور کیا کیا معاملات نہ ہوں گے۔ جہاں فارسی کا پیوند ہمارے تہذیبی پیرہن میں نہ لگا ہو۔ فارسی کا روزمرہ آج تک ہماری زبان کے رگوں ریشوں میں تیرتا دکھائی دیتا ہے اور بلا تکلف ہم اُس کا تصرف اپنی ہی زبان جان کر کیے جاتے ہیں۔ جب یہ زبان (فارسی) اپنے بہت اونچے مقام سے نیچے آتی محسوس ہوئی تو ذہنوں میں ایک ہلچل سی آنے لگی۔ لوگ تحیر واستعجاب، تر ڈود تأسف سے پکار اُٹھے:

پڑھو فارسی بیچو تیل
دیکھو یہ قدرت کے کھیل

ہماری تہذیب فارسی کے جس شاندار رشتے سے پیوست تھی، وہ رشتہ مغلوں نے جوڑا تھا، دراصل وہی اس کے مُربّی، مُروّج اور نگراں تھے۔ تعریفاً کہا جاتا تھا:

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے
آگے مغلوں کے فارسی کیا ہے

میرے گہنے میں ہاتھ چڑھے کنگن کے شیشے سے بھلا آرسی (آئینہ) کا شیشہ کیا مقابلہ کر پائے گا۔ مغلوں کے سامنے کوئی فارسی میں آگے بڑھ پائے، ناممکن ہے۔ اسی خیال کو سرائیکی لوگ یوں کہتے ہیں: مُغلاں ڈِٹھا اے فارسی بھلدا۔ یعنی میری فارسی مغلوں کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

فارسی زبان کے اس گہرے اثر کا نتیجہ یہ نکلا، یہ ہماری اپنی زبان میں گھل مل کے ہمیں اپنے جذبوں کے اظہار والی زبان جیسی ہی لگنے لگی۔ نازک سے نازک خیالات اس کے ذریعے ہم ظاہر کرنے لگے۔ ایسی ہی

مثالیں دیکھیے:

با خدا دیوانہ باشد، با محمدؐ ہوشیار: یہ مصرع ہم وہاں پڑھتے ہیں جہاں ہم یہ کہنا چاہیں۔ خبردار پیغمبر اسلامؐ کے ادب و آداب کے بارے میں محتاط رہ کر بات کرنا، مسلمان آپؐ کے باب میں بے حد حساس ہیں۔ پرودگار کے ساتھ ایسے معاملے میں شاید دیوانہ کہہ کر درگزر کر جائیں مگر یہاں ایسی رعایت ممکن نہیں۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ایسی بیسیوں مثالیں عوام و خواص کے منہ چڑھی دکھائی دیں گی جنھیں اب اردو نے اپنا سمجھ کر ہی اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

جب عطا و اکرام کا معاملہ درپیش ہو تو کہا جاتا ہے، 'آپ کا خیر' پہلے اپنوں کی طرف جائے، پھر دوسرے لوگ مستحق ہوں گے۔ یہاں کہتے ہیں: اول خویش بعد درویش۔

جب کہنا یہ مقصود ہو کہ انسان کی قدرت یہ نہ تھی کہ وہ یہ کام تنہا کر سکتا، یہ تو اُس کے پروردگار کی مہربانی سے سرانجام پایا۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرع ضرب عام کے طور پر مشہور ہے: ایں سعادت بہ زور بازو نیست۔

اگر بچوں کو ادب آداب سکھانا مقصود ہو تو کہتے ہیں: با ادب با نصیب۔ بے ادب بے نصیب۔

جب کسی گھرانے، قبیلے قوم کے تمام (یا زیادہ) لوگ نمایاں نظر آئیں اُن میں سے کسی ایک شخص کا جوہر اُبھر کا سامنے آئے تو اُس کی تحسین و آفریں کے لیے کہا جاتا ہے۔ ایں ہمہ خانہ آفتاب است۔

کوئی حقیقت کھُل کر جب سامنے آ جائے، تب اُس کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایسے موقعوں پر کہتے ہیں: آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

اگر کہنا یہ ہو کہ بڑائی دراصل عقل مندی اور فراست کا نام ہے تو کہا کرتے ہیں: بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔

اول نقصان مایہ دوم شماتت ہمسایہ: ایسے موقعوں پر بولتے ہیں جب یہ کہنا مقصود ہو کہ اپنی مصیبت دوسروں سے نہ کہو۔ کہو گے تو اُلٹا وہ تمھی کو مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ گویا یہ دوہری مصیبت ہو جائے گی۔ تمھاری مصیبت اور اُس پر دوسروں کی مصیبت۔

آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را: کتوں کے بھونکنے سے فقیر کا رزق کم نہیں ہو جاتا۔ ایسی صورت حال میں بولتے ہیں جب ہم یہ کہنا چاہیں کہ کسی مخالف کی مخالفت اور دشمن کی مزاحمت سے مقدر کا لکھا کم نہیں ہو سکتا۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند: کوئی کام باپ نہ کر سکا تو کیا ہے، بیٹا تمام (مکمل) کر لے گا۔ اس طرح کے معاملات میں ہمارے ہاں ایسے مصرعوں کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے۔

جب سب بھائیوں کے درمیاں چھوٹے بھائی سے بھاگ دوڑ کا زیادہ کام لیا جائے تو مزاحاً اُس سے کہتے ہیں: سگ باش برادرِ خُرد مباش۔

جب کسی ذمہ داری کا التزام کسی کے سر آ جائے تو (کبھی اظہارِ جبر کے لیے اور کبھی تفاخر میں) کہا جاتا ہے: قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔

اس طرح کا ایک اور فارسی مصرع بطور روزمرہ عام ہے "گندم اگر بہم نہ رسد بُو غنیمت است۔" جب مراد اور مطلوب سے کچھ کمتر شے مجبوراً ہاتھ آ سکے تب بولا جاتا ہے۔

اگر کہنا ہو کہ سُنی سنائی بات جو دیکھی نہ ہو اس کا کیا اعتبار؟ تو کہا جاتا ہے: شنیدہ کے بُود مانندِ دیدہ؟

یہاں چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را: اپنی کسی چاہت کے لیے جہاں ہم بڑی سے بڑی قیمت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند: خوشامد بے جا، جھوٹی، بے اصل باتوں کے لیے آتا ہے۔

لفظی مفہوم ہے کہ پیر میں وہ کرامات نہ بھی ہوں، مرید اُن میں پیدا کر دیتے ہیں۔

پنبہ کجا کجا نہم: زخم اتنے بہت ہیں مرہم (پھایا) کہاں کہاں رکھوں۔

محل استعمال وہاں ہے جب مشکلیں زیادہ ہوں، درماں نہ ملے۔

تو نگری بہ دل است نہ بہ مال: اس جگہ کہتے ہیں جہاں کہنا ہو کہ دولت مند وہ ہے جو عطا اور بخشش والا دل رکھتا ہو۔

تا ثریا می رَوَد دیوار کج: وہاں کہتے ہیں جہاں کسی کام کی ابتدا ہی غلط ہو۔ انجام بُرا نکلے۔

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم: کسی خاموش، حیرت میں ڈوبے ہوئے آدمی کو دیکھ کر کہا جاتا ہے

جائے اُستاد خالیست: وہاں بولتے ہیں جہاں کسی عظمت وفضیلت کا اقرار کرنا ہو۔

جگر جگر، دِگر دِگر: مطلب ہے، اپنے آخر کار اپنے ہوتے ہیں۔ غیر، غیر ہی ہوتے ہیں۔

جوابِ جاہلاں باشد خموشی: عموماً وہاں کہا جاتا ہے جہاں کسی کو جاہل سمجھ کر اُس کا جواب دینا مناسب نہ ہو

چاہ کُن راہ چاہ در پیش: کَن مفتوح کاف، بمعنی کھودنا۔ معنی اگر دوسروں کے لیے گڑھا کھودو گے، خود بھی اس میں گر سکتے ہو۔

چندے آفتاب، چندے ماہتاب: کسی کے حُسن کی تعریف میں کہا جاتا ہے۔ بمعنی بے حد حسین۔

حساب دوستاں در دل: دوستوں سے حساب کتاب نہیں کیا کرتے۔

حق بہ حق دار رسید: کسی حق دار کو اُس کا حق ملنے پر کہا جاتا ہے۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است: بزرگوں کی غلطی پکڑنا، بجائے خود ایک خطا ہے۔

خوئے بد را، بہانہ بسیار: بُرائی کو جائز کرنے کے بہت سے بہانے ہوتے ہیں۔

خدا پنج انگشت، یکساں نہ کرد: سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔

دخل در معقولات: ایسی بحث میں کود پڑنا، جس کا ہم سے تعلق نہ ہو۔ کسی اہم گفت گو کے بیچ بول پڑنا۔

دل را دل دارد: دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

درد دل درد آشنا دارد: مصیبت کو وہی سمجھ سکتا ہے، جس پر پہلے مصیبت پڑ چکی ہو۔

در کارِ خیر حاجت استخارہ نیست: نیک کاموں کے سرانجام دینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

دیر آید درست آید: جب کسی کام کا نتیجہ دیر سے ملے اور اچھا بھی ہو، وہاں کہا جاتا ہے۔

دست تہِ سنگ آمد: جب کوئی شخص بڑی مشکل میں آ پڑے تو کہتے ہیں پتھر کے نیچے ہاتھ آیا ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست: دوست وہ ہے جو مشکل کے وقت کام آئے۔

دیوار ہم گوش دارد: چھپانے والی بات دیکھ بھال کے کرنی چاہیے، کہتے ہیں دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں

دیوانہ بہ کارِ خویش ہشیار: اپنے کام کے لیے دیوانہ بھی ہشیاری دکھاتا ہے طنزاً کہا جاتا ہے۔

راہ راست برو اگر چہ دور است: منزلِ مقصود تک جانے کے لیے سیدھا اور صاف راستہ لینا چاہیے۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت: وہاں بولتے ہیں جب مصیبت ٹل جاتی ہے۔ نقصان نہیں پاتے۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم: دوسرے کی بات جب سمجھنا مشکل ہو، تب کہتے ہیں۔

زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد: اُس شخص کے لیے کہتے ہیں جو کسی طرح کی دلیل نہیں مانتا۔ یا کاہلی دکھاتا ہے

کے آمدی و کے پیر شدی: وہاں بولتے ہیں جب کوئی شخص ابتدا ہی میں انتہا کا فائدہ چاہے۔

کبوتر با کبوتر باز بہ باز: ایسے معاملات پر کہا جاتا ہے جہاں ہم خیالی بہت دکھائی دے

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی: ایسا وقت ہو کہ کوئی نہ پوچھے میاں تم کون ہو۔ خوار ہو جانے پر کہا جاتا ہے۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز: ہم خیالی ہونے، باہم اتفاق کرنے، ایک ہی قبیلہ ذات کے لیے کہا جاتا ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت: وہاں بولتے ہیں جہاں غلط طور پر کمایا ہوا مال غلط جگہ خرچ ہو۔

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو: ایک دوسرے کو خوش آمد کرنا چاہیں تو بطور طنز کہا جاتا ہے۔

ملتان ما بہ جنتِ اعلی برابر است: اولیاء کے مدفن اور عرفا کی نسبت کے سبب ملتان شہر کی فضیلت کے طور

پر لکھا گیا اور پڑھا گیا ہے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود: ہمت دلانے اور دلاسہ دینے کے لیے کہتے ہیں۔ یقین دلانے کی خاطر کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جو حل نہ پائے۔

مالِ مفت دلِ بے رحم: ایسے معاملات میں بولتے ہیں جہاں کوئی مال بے دردی سے خرچ کیا جا رہا ہو۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز: جب کسی چیز کو سستا بکتا دیکھیں تو طنزاً کہتے ہیں۔ قیمت اور بڑھا دو۔ بھاؤ تیز کرو۔

عذرِ گناہ بدتر از گناہ: خطا اور لغزش کے لیے کہیں جواز لایا جائے۔ تب کہتے ہیں۔

عقل مند را اشارہ کافیست: لوگوں کو سمجھانے کی خاطر مختصر بات، ایک چھوٹا سا اشارہ بھی بہت ہے۔

غتر بود و غتر بود: کسی مال کا ضائع جانا، کسی بات کا بے اثر ہو جانا، اصل بات کو فی الحقیقت نہ جاننا۔

غم نہ داری بُز بخر: (بز بمعنی بکری) بکری کا پالنا آسان نہیں، بہت توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اُس کے پالنے پر طنزاً کہا جاتا ہے۔

قدرِ زر، زرگر بداند، قدرِ جوہر، جوہری: اہلیت کے ثابت کرنے پر کہا جاتا ہے۔

قطرہ قطرہ دریا می شود: رواں دواں زبان میں بولا جاتا ہے، جب یہ کہنا مراد ہو، ہر بڑا کام آہستہ آہستہ مکمل ہوتا ہے، ہر کُل کے حاصل کرنے کو جُز کی ضرورت پڑتی ہے۔

قدرِ نعمت بعد زوال: جب نعمت ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ جب آرام کے اسباب ضائع ہو جاتے ہیں، تب اُن کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔

قومے فروختند، چہ ارزاں فروختند: اس مقام پر کہتے ہیں جب وسیع تر قومی مفاد کو اپنے معمولی فائدے کے لیے قربان کر دیا جائے۔

ولی را ولی می شناسد: اچھا آدمی اچھے کو اور بُرا آدمی بُرے کو بآسانی پہچان لیتا ہے۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا: جو ہمت کرنے والا ہے، خدا اُس کی مدد کرتا ہے۔

ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے: مزہ آسانی سے نہیں ملتا۔ کامیابی کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ راحت حاصل کرنے میں دن لگتے ہیں۔

ہنوز دِلی دُور است: ایسے مواقع پر کہتے ہیں جب یہ بتلانا مقصود ہو کہ منزلِ کامیابی ابھی کچھ دُور ہے۔

ہر کمال را زوالے: ہر کمال کی ایک حدِ زوال ضرور ہوتی ہے۔

ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت: رنج و راحت، دونوں حالتوں میں دوستی نبھانے کے طور پر یقین

کے لیے آتا ہے۔

ہم پیالہ و ہم نوالہ: ہم مشربی کے طور پر بولتے ہیں۔

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت: ہر نیا آنے والا اپنی الگ رائے رکھتا ہے۔

یک در گیر، محکم گیر: کہا جاتا ہے کہ تعلق خاطر مضبوطی سے قائم رکھو۔ کسی ایک کے ہو رہو۔

یک نہ شُد دو شُد: کسی ایسی مشکل کے اظہار میں کہتے ہیں جہاں ایک مشکل پہلے سے سر ہو، دوسری اُس پر مزید آپڑے۔

فارسی کی اردو میں جلوہ نمائیاں کوئی ایک دو ہوں تو کہوں، قدم قدم، یہ روشنی راہ دکھاتی ہے۔ حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہوں، مسودہ لکھتا ہوں، پھر چلتے پھرتے، بولتے بالتے کوئی نہ کوئی مثال، کہاوت، مصرع، شعر یاد آہی جاتا ہے، جیسا کہ یہ مثالیں:

مُشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بہ کلہ خود باید: مُراد ہے موقع ضائع ہو گیا تو بات پر پچھتانا بے سُود ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جنگ ہارنے کے بعد مقابلے کا کوئی داؤ یاد آئے۔

من چہ می سرایم تنبورہ من چہ می سراید: سیدھا سادہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ میں کچھ ہانک رہا ہوں وہ کچھ اور

مُشتے از خروارے: (خروار، ڈھیری) ڈھیر سے مُٹھی بھری ہے پتا چل گیا کہ ڈھیری میں کیا ہے۔

مُشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید: جہاں کوئی بات، کوئی شے، اچھے ہونے کا خود اظہار کرے۔ دوسرے کی محتاج نہ ہو، اپنا تعارف خود کروائے، وہاں بولا جاتا ہے۔

مشتری ہشیار باش: مُشتری لغت میں بیچنے اور خریدنے والے، دونوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہاں مفہوم ہے۔ خریدار ہوشیار رہے۔ گویا اس شے کی خرید متنازع ہے۔

گزشتہ را صلوٰت آیندہ را احتیاط: اردو عام بول میں وہاں بولتے ہیں جہاں کہنا ہو، جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ آئندہ کے لیے یہ غلطی نہ دوہرانا۔ یہاں صلوٰت کے معانی ہیں لاتعلقی، دُوری کا اظہار کرنا۔

نقل را عقل باید: نقل کرنے والے سے کہا جاتا ہے۔ نقل کرنے کے لیے بھی عقل چاہیے ہے۔

نقل کفر، کفر نہ باشد: کوئی خلافِ ادب، مخالفتِ شرع بات، بیان (نقل) کرنا ضروری ہو جائے تب یہ لفظ کہے جاتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست، تا بہ کجا: وہاں کہا جاتا ہے جہاں دو مختلف آرا پر توجہ دلائی جائے کہ اس فرق پر نگاہ رکھ کے آگے بڑھو۔

دروغ مصلحت آمیز، بہ از راستی فتنہ انگیز: ایسا سچ جو فتنہ پیدا کرے اُس سے وہ جھوٹ اچھا ہے جو امن و

صلح کی طرف لائے اور فساد سے بچاتا ہو۔

رمُوزِ مملکتِ خویش، خسرواں دانند: جہاں یہ کہنا ہو کہ امورِ ریاست کو ریاست چلانے والے ہی جانتے ہیں، یہ مصرع استعمال میں لاتے ہیں۔ تمثیلاً امورِ عامہ، گھرداری اور عام انتظام کے لیے بھی انھی معنوں میں آتا ہے۔ تفنُّنِ طبع کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ مملکت پر وقف کیجیے۔ خویش کو مکسور پڑھیے۔ ہمارے موجودہ خاندانی اقتدار کے تناظر میں ایک اور بڑا مفہوم اُبھر کر سامنے آئے گا۔

اردو ایک ایسے جلوس کی شکل میں رواں دواں ہے، جو لشکر کی طرح ہر ہر بازار سے گزرتا ہے۔ بہ قدرِ ضرورت سیراب بھی ہوتا ہے۔ اس میں دیگر زبانوں کے علَم بھی جا بہ جا لہراتے نظر آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ جلوہ نُما اپنے شمسوں کو چمکاتی، فارسی کی بلند عماریاں ہیں جو اس جلوس کی رونق کو دوبالا کیے جاتی ہیں۔

آخرِ کلام، ازرہِ لُطف بیان کرتا ہوں۔ ایران کے اہلِ دانش غور فرمائیں اردو اور فارسی کی اب تک اس پھلتی پھولتی محبت کا اقرار ایک تو اُنھوں نے یوں کیا، ایک سڑک کو انھوں نے اقبال لاہوری سے منسوب کر دیا۔ ایک راہ دوستی کی وہ اور بھی نکالیں۔ ادھر کی طرف کوئی آتا جاتا ایک راستہ، اردو کے فارسی خواہوں کے نام بھی کر دیں تو کیا ہی اچھا ہو!

☆☆☆☆

ڈاکٹر جمال نقوی

یکے از معمارانِ سندھی ادب

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ سندھ کے آثار قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطے کے لوگ موئن جودڑو تہذیب کے عروج سے بیشتر بہت ترقی یافتہ تھے۔ یہاں کے لوگ ترقی کے فن سے بخوبی واقف تھے جس کے ثبوت میں یہاں مٹی کی مہروں پر کھدے ہوئے تصویری الفاظ دستیاب ہوئے ہیں۔

اس قدیم تہذیب سے منسلک سندھی زبان اپنی قدامت کے اعتبار سے دیگر پاکستانی زبانوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے اور ادب کے بے بہا خزانوں سے پُر ہے۔ اس میں صوفیائے کرام کی خانقاہوں سے بلند ہونے والے نغموں، وائیوں اور بیتوں کی وجد آفریں باتیں بھی سنائی دیتی ہیں اور جدید ادبی رجحانات بھی نظر آتے ہیں۔ پس منظر میں اگر قاضی قادن، شاہ لطیف اور سچل سرمست وغیرہ کا عارفانہ کلام ہے تو جدید فکر کے ترجمان شیخ ایاز، سراج الحق میمن، غلام ربانی آگرو اور رسول بخش پلیجو وغیرہ کی فکری تخلیقات بھی نمایاں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس لحاظ سے سندھی زبان بڑی خوش قسمت ہے کہ اسے مرزا قلیچ بیگ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی، ایاز قادری، آغا سلیم، شمشیر الحیدری، حمید سندھی اور ابراہیم جویو جیسے بہت سے ایسے معمارانِ سندھی ادب دستیاب ہو گئے جنھوں نے خود سندھی ادب تخلیق بھی کیا۔ دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کیا اور دوسروں سے اسی قسم کے اہم کام بھی لیے ساتھ ہی نوجوان قلمکاروں کی تربیت بھی کی اور انہیں حوصلہ بھی دیا۔

کامریڈ ابراہیم جویو ایک بزرگ ترقی پسند، روشن خیال ادیب، عالم اور دانشور ہیں جنہیں ان کی علمی و ادبی کاوشوں وتدریسی خوبیوں کی وجہ سے ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگی جہد مسلسل، خدمت خلق، اپنی قوم اور اپنے وطن کی ترقی، نیک نامی اور خوشحالی کے لیے وقف رہی ہے۔ انکساری اور عجز ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ کام، محنت اور زحمت اٹھا کر ہی انھوں نے اپنا آپ بھی بنایا اور اپنی زبان اپنی قوم کو بھی فروغ دیا ہے۔

زندگی کی شاہراہ پر اپنے یتیم پوتے کی انگلی پکڑ کر چلانے والے اس کے دادا محبوب تھے جو ام کی مناسبت سے اپنے دوستوں میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے ابراہیم کے لیے تعلیم و ترقی کے

دروازے کھلتے چلے گئے۔

مگر اس نے خود بھی اپنی محنت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس اہل ثابت کیا اور دکھا دیا کہ دریائے سندھ کے کنارے بسے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں ”آباد‘ کا باسی بھی اگر محنت و ہمت رکھتا ہے تو عظمتیں اس کے قدم چومتی ہیں۔ قدرت اس کی مدد کرتی ہے اور رہنمائی کا ذریعہ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ ابراہیم جویو کے لیے بھی ’جوش آ گیا تھا رحمتِ پروردگار کو‘ اور انہیں سائیں جی ایم سید جیسا رہنما پہلی ہی منزل پر دستیاب ہو گیا۔ جس نے حصول تعلیم میں ان کی بڑی مدد کی اور انھوں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ ہر چیلنج کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور بہتر نتائج دیے۔ سندھی زبان کے ساتھ ہی انگریزی کی تعلیم انھوں نے ابتدا ہی سے حاصل کی تھی۔ فارسی بھی انھوں نے پڑھی تھی۔ اس لیے بی ٹی میں انگریزی کے ساتھ فارسی کی تدریس ان کے اختصاصی مضامین میں شامل تھی۔ سندھ مدرسہ، ڈی جے سائنس کالج اور پھر بمبئی کے کالج سے بی اے اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ سندھ مدرسہ میں ہی ’مدرس‘ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

ان کے تعلیمی سفر نے ان کے مشاہدے، مجاہدے اور تجربے میں بھی اضافہ کیا اور ان کو اپنے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ عملی زندگی میں انہی عناصر سے حاصل ہونے والی شعور و فکر کی دولت نے ان کی شخصیت کو ایک منفرد شکل عطا کی۔ جس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ دادا کے بعد ان کی زندگی پر سب سے پہلا اثر ان کے ابتدائی استاد ’سائیں ٹیکن مل جی‘ کا رہا۔ جن کا شخصی خاکہ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا ہے اور جو بچوں کے ماہوار رسالہ ’گل پھل‘ میں دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ان کے رہنما سائیں جی ایم سید کے اثرات کا سلسلہ ہے جو کم عمری سے لے کر خود سائیں کی حیات تک جاری رہا۔ جس کے بارے میں جویو صاحب کی کتاب ’سات دھنی سروان‘ (جی ایم سید)، اگتی قدم پبلیکیشنز، حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے اور پھر انھوں نے سائیں کی کتاب ’قومی یکجہتی کا مسئلہ‘ کا انگریزی ترجمہ "National Unity" کے نام سے کیا۔ ان کے علاوہ جن دیگر شخصیات سے وہ Inspire ہوئے ان کے بارے میں بھی انھوں نے مقالات تحریر کر کے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کا مختصر تذکرہ دیکھیے۔ انسان دوست ادیب (مرزا قلیچ بیگ)، جوت ائیں جوتیوں (علامہ داؤدپوتہ)، مثالی بزرگ (غلام علی نانا)، محنت کش ادیب (پیر حسام الدین راشدی)، سندھ جو سچو خادم (محمد عثمان ڈیپلائی)، علامہ آئی آئی قاضی، مثالی استاد (پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ)، غلام محمد گرامی، مُجھو دوست (نور محمد پلیجو) اور ہم مشرب ہمزاد (تاج محمد آبڑو)۔

ان کو ابتدا ہی سے مطالعہ کا بڑا ذوق تھا۔ تعلیمی مراکز کی لائبریریاں جویو صاحب کے اس ذوق کا مرکز رہی ہیں۔ ممبئی میں بھی کورس کی کتابوں کے ساتھ ہی وہ لائبیریری میں انگریزی اور اردو ادب کی کتابیں بھی پڑھا کرتے اور وہاں آنے والے انگریزی اخبار ’ٹائمز آف انڈیا‘ کا مطالعہ کرتے۔ اسی اخبار میں انہیں ہندوستانی کیمونسٹ تحریک کے بانی کامریڈ ایم این رائے کے مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ کامریڈ رائے نے اکتوبر ۱۹۲۰ء

میں تاشقند میں 'کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا' کی بنیاد رکھی تھی۔ بعد میں کامریڈ رائے نے انڈین کمیونسٹ پارٹی سے نکل کر انڈین ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی' کی بنیاد رکھی۔ جس کا بنیادی مقصد انڈین کمیونسٹ تحریک کو صحیح نہج پر چلنے کی ترغیب اور وسیع تر مقاصد کا حصول تھا۔ کامریڈ ایم این رائے سے ان کی مختصر ملاقات میں سندھ میں ریڈیکل پارٹی کی تنظیم سازی کی بات بھی ہوئی تھی۔ بمبئی میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب جویو واپس کراچی آئے تو یہاں انھوں نے ریڈیکل پارٹی اور اس کے ویکلی اخبار "Independant India" کے فروغ میں خود بھی حصہ لیا اور اپنے دوستوں شیخ ایاز اور جمال صدیق وغیرہ کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ انھوں نے رائے کی کتاب "Historical Role of Islam" کا سندھی میں ترجمہ 'اسلام کا تاریخی کارنامہ' کے نام سے ۴۵۔۱۹۴۴ء میں کیا۔ ترجمے کے کام سے جویو صاحب نے سندھی زبان و ادب کو ایک بیش بہا دولت عطا کی ہے۔ ان کی تقریباً تین درجن انگریزی سے سندھی زبان میں ترجمہ کردہ کتب نے سندھی دنیا کو بہت ہی اہم عالمی ادیبوں اور مضامین سے متعارف کرایا ہے۔ ان میں روسو، ایمیلی، جان وائن ڈون، سی ایم جوڈ، ٹی ایس ایلیٹ، فونیکا پائنڈل، البئیر کامیو، کارل مارکس وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے خود بھی بہت سی کتابیں اور مضامین خصوصاً پاکستان اور سندھ کے حوالے سے انگریزی میں تحریر کیے ہیں نیز سندھی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیے ہیں۔ ترجمہ تو انھوں نے منظومات کا بھی کیا ہے جن میں رابندر ناتھ ٹیگور، پی بی شیلے، سینٹ فرانس، اوشانسی، کاسٹیلو وغیرہ اور کچھ طبع زاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ جس سے ان کی شعری تخلیقیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

عالمی تحریک نسواں، نظام مساوات، امن کی جی جنگ، قدیم وجدید کا مسئلہ اور تعلیم جیسے عالمی مضامین، سندھ اور سندھی زبان سے متعلق مضامین کے علاوہ سندھ کے عظیم شاعر اور دانشور ایاز کے بارے میں ان کی تین درجن سے زائد کتابیں اور تحریریں ان کی فکر و دانش و روشن خیال شخصیت کی مختلف جہات سے روشناس کراتی ہیں۔ اس کے علاوہ دو درجن سے زائد شعری مجموعے، نثری اور تنقیدی کتابوں پر ان کے تحریر کردہ مہاگ (پیش لفظ) ان کی نقادانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین میں شیخ ایاز، شمشیر الحیدری، نور الہدیٰ شاہ، بدر ابڑو، قاضی فیض محمد اور دیگر سندھی ادب کے اہم لکھنے والے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پیر حسام الدین راشدی، رئیس کریم بخش نظامانی، حمید سندھی، رسول بخش پلیجو اور مہتاب محبوب کی تصانیف پر انھوں نے تفصیلی مطالعے اور تبصرے بھی تحریر کیے ہیں۔ جس سے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ مندرجہ بالا ادبی و سماجی تحریروں کے علاوہ ابراہیم جویو صاحب نے تقریباً ایک درجن نصابی کتب بھی تحریر کی ہیں۔ جن میں اول جماعت سے لے کر دسویں جماعت کا سندھی نصاب پیش کیا گیا ہے۔ اور نصابی کتاب کا جائزہ بھی تحریر کیا ہے۔

سندھی زبان میں تحریر و ترجمہ کردہ متذکرہ کتابوں کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابیں انگریزی میں

لکھیں اور ترجمہ کی ہیں، بہت سے اہم قلم کاروں مثلاً جی ایم سید، جی ایم مہکری اور حیدر بخش جتوئی وغیرہ کی کتابوں کے پیش لفظ (Perface) تحریر کیے ہیں۔ جس سے سندھی، اردو اور فارسی کے علاوہ دیگر انگریزی زبان پر ان کے عبور کا پتہ چلتا ہے۔

ابھی تک ہم نے جویو صاحب کے قلمی جہاد کی بات کی ہے۔ اب ہم ان کی عملی فعالیت اور تنظیمی جہاد کا ذکر کر کے ان کی مکمل شخصیت کی قلمی تصویر کھینچنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں سندھ کے وزیر تعلیم جی ایم سید کے قائم کردہ سینٹرل ایڈوائزری بورڈ کے لیے ۱۹۵۱ء میں محمد ابراہیم جویو کو منتخب کیا گیا تو انہیں محسوس ہوا کہ اس نوعیت کے ادارے کو فعال بنا کر وہ سندھی زبان و ادب اور کلچر کی بطریق احسن خدمت کر سکیں گے۔ تین سال بعد یعنی ۱۹۵۴ء میں ادارے کا نام تبدیل کر کے سندھی ادبی بورڈ رکھ دیا گیا اور اسے وزارت تعلیم کا ایک خود مختار ادارہ بنا دیا گیا۔ سندھی ادبی بورڈ کے سیکرٹری کی حیثیت سے انھوں نے خود اور سراج الحق میمن و دیگر صاحبانِ علم کی مدد سے مغربی زبانوں کی شاعری اور فکشن کا سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ لغت سازی، نایاب کتب اور مسودات کی بازیافت، تحقیقی، تاریخی و سماجی کتب کی ترتیب و اشاعت، سندھی کتابوں کے انگریزی میں تراجم وغیرہ کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کتابوں کی اشاعت کا کام بھی سندھی ادبی بورڈ نے بڑی تندہی سے کروایا۔ بورڈ نے جو سب سے اہم کام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی رہنمائی میں انجام دیا وہ سندھی فوک لور اور لوک ورثے کو محفوظ کرنے کا تھا۔ عوامی داستانوں، لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کا یہ ذخیرہ تقریباً بیالیس ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔ یہ ایک اتنا بڑا اور اہم کام ہے جو شاید برصغیر کی کسی دوسری زبان کے سلسلے میں نہیں کیا گیا۔ جویو صاحب کی مستقل جد وجہد اور انہماک کی وجہ سے بورڈ کا اپنا پرنٹنگ پریس بھی قائم ہو سکا ہے۔

۱۹۴۶ سے رک رک کر شائع ہونے والے سندھی سہ ماہی 'مہران' کو بھی جب سے سندھی ادبی بورڈ کی نگرانی میں دیا گیا ہے تو اس کا معیار بھی بڑھا ہے اور اس میں پابندی بھی آئی ہے۔ لکھنے والوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان سے خصوصی طور پر مختلف موضوعات پر تحریریں طلب کی گئیں۔ انگریزی، روسی، جرمن، فرانسیسی، بنگالی، ہندی اور اردو زبانوں سے بے شمار ادبی شاہکار سندھی زبان میں تراجم کرا کے شائع کیے گئے۔ اس طرح سندھی ادب کو مزید فروغ ملا، اس کے ساتھ ہی بچوں کے لیے ایک ماہنامہ 'گل پھل' بھی سندھی ادبی بورڈ کے تحت شائع ہوتا ہے۔ ان دونوں رسالوں کو خوب سے خوب تر بنانے میں جویو صاحب کی خدمات بے مثال اور قابل ستائش ہیں، ان رسائل کو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوبصورت بنایا جاتا تھا۔ کام، کام اور کام جن لوگوں نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنایا ہوتا ہے ایسے ہی لوگوں کے لیے میں نے کہا تھا:

آخری عمر تلک ساتھ نہ چھوڑوں گا ترا
زندگی تجھ سے یہ وعدہ مرا مرنے تک ہے

ہمارے ممدوح محمد ابراہیم جویو زندگی کے اسی اصول پر گامزن تھے۔ اس لیے سندھی ادبی بورڈ سے فارغ ہونے کے بعد بھی اور ہنوز اپنی طویل عمر وخرابی صحت کے باوجود وہ انجمن ترقی پسند مصنفین (جس کی تنظیم نو کے بعد ۲۰۱۱ء میں وہ صوبائی صدر رہے)، سندھی ادبی سنگت، سندھ فرینڈز سرکل، سرونٹس آف سندھ، سندھی ادبی بورڈ کے چیئرمین رصلاح کار، سندھی لینگویج اتھارٹی کے ممبر اور تاعمر صلاح کار، شیخ ایاز فاؤنڈیشن کے چیئرمین، شیخ ایاز چیئر، شاہ لطیف یونیورسٹی خیرپور کے صلاح کار، تھیوسوفیکل سوسائٹی حیدرآباد کے وائس پریذیڈنٹ اور سندھ ڈیموکریٹک پارٹی کے وائس پریذیڈنٹ بھی ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک وفد حیدرآباد میں ان کی قیام گاہ پر جب ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تھا تو میں بھی اس میں شامل تھا۔ مجھے وہاں دو باتوں کی خاص طور پر خوشی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ سب کو پہچان رہے تھے اور سب کے نام وکام سے واقف تھے اور دوسرے ان کے چاروں طرف کمرے میں رکھی الماریوں میں سجی ان کی منتخب کتابوں میں جہاں اردو، انگریزی اور سندھی کے بڑے بڑے قلم کاروں کی کتابیں موجود تھیں وہیں مجھ جیسے ایک بہت چھوٹے قلم کار کی کتاب 'ادب، سائنس اور جمہوریت' بھی موجود تھی جس کا ایک باب سندھی ادب کے لیے مخصوص ہے۔

آخر میں اپنے مضمون کا اختتام انہی الفاظ پر کروں گا کہ آج قومی اور عالمی سطح پر سندھی زبان وادب کا جو مقام ہے اس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی جویو صاحب کا ایک بڑا Contribution ہے۔ اس طرح وہ بھی 'یکے از معمارانِ سندھی ادب' میں شمار کیے جائیں گے۔ مری دعا ہے کہ وہ اسی طرح اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی زبان اور ادب کی خدمت کرتے رہیں اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا ہو۔

☆☆☆☆

پروفیسر حسین سحر

پنجابی اور سرائیکی ادب میں مرثیہ

سیدالشہدا حضرت امام حسینؑ کا ذکرِ جمیل یوں تو تقریباً ہر ایشیائی زبان میں ملتا ہے لیکن بطورِ خاص عربی فارسی اردو اور تمام پاکستانی زبانوں میں اس کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے اور پھر ان پاکستانی زبانوں یعنی پشتو، کشمیری، ہندکو، بلوچی، براہوی، سندھی، پوٹھوہاری، پنجابی اور سرائیکی میں سے سرائیکی کو اس سلسلے میں اولیت کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے مرثیہ اسی زبان ہی میں لکھا گیا۔

واقعہ کربلا کے بعد اس سانحے کے عینی شاہد حضرت امام زین العابدینؑ نے رثائی اشعار فرمائے۔ ان کے بعد بہت سے عرب شعرا نے اس سلسلے میں طبع آزمائی کی۔ مثلاً ابوالاسود ابودہبل۔ دعبل اور فرزدق وغیرہ۔ اسی طرح ایران میں سب سے پہلے محتشم کاشانی نے فارسی میں مرثیہ لکھا اور پھر اس کے بعد تقریباً ہر شاعر نے یہ ذکر کسی نہ کسی انداز میں کیا۔

حضرت امام زین العابدینؑ کی ازواج میں ایک سندھی خاتون بھی تھیں۔ جن کے بطن سے حضرت زید شہید پیدا ہوئے۔ اس خاتون نے اپنی زبان میں مرثیہ لکھ کر جب امام کی خدمت میں پیش کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اس زبان میں ذکرِ حسینؑ قیامت تک ہوتا رہے گا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ زبان سرائیکی تھی۔ جو اس وقت سندھ کے شمالی علاقے یعنی ملتان اور نواحِ ملتان میں بولی جاتی تھی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سب سے پہلا مرثیہ سرائیکی یعنی ملتانی زبان میں لکھا گیا۔ جو پنجاب کے جنوبی علاقے کی زبان ہے۔ اسی کے زیرِ اثر بعد میں پنجاب کے شمالی علاقوں میں بولی جانے والی زبان پنجابی اور پوٹھوہاری میں بھی مرثیہ کہا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ کے زمانے یعنی دوسری صدی ہجری میں ملتان میں شیعہ کثرت سے آباد تھے۔ چنانچہ اس وقت سے یہاں عزاداری اور مرثیہ گوئی کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ یوں برصغیر میں لکھنؤ سے بھی بہت پہلے ملتان شیعت کا مرکز بن چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ میں سوزخوانی کی ابتدا بھی ملتانی ذاکرین نے کی۔ ان کے ذکر کرنے کا اپنا انداز ہے۔ نہایت پرسوز اور دلدوز، پتھر سے پتھر دل بھی اسے سُن کر بے اختیار گریہ کناں ہو جاتا ہے۔

پنجابی اور سرائیکی کے سب سے پہلے شاعر حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ ملتان ہی کے نواح میں پیدا ہوئے۔ گویا ساتویں صدی ہجری میں اس زبان میں شاعری کا رواج پڑ چکا تھا اور مرثیہ گو شاعروں نے باقاعدہ

مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ چناں چہ گیارہویں صدی ہجری تک سرائیکی مرثیے پر بھی فارسی زبان کا غلبہ رہا اور یہ قصیدہ، مثنوی، مسدس، مخمس اور مثلث کی شکل میں کہا جاتا رہا۔ عام صورت یہ تھی کہ شہدائے کربلا میں سے کسی ایک کی شہادت کو منظوم کر کے اس کا نام بند یا دفعہ رکھ دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جناب حُرؓ جب یزیدی فوج کو چھوڑ کر حضرت امام حسینؓ کے پاس جانے لگے تو کسی نے انھوں روکنے کی کوشش کی۔ اس پر حُرؓ کا جواب اُس دور کے سرائیکی مرثیے میں دیکھیے:

میں دھوتے ہتھ شریکاں توں
سب ڈُور اتے نزدیکاں توں
رب کڈھیم کالی لیکاں توں
میڈا اصلوں کجھ نئیں مزاج تھیا
اتے ستا مِل بہشت گیا

ترجمہ: یعنی میں برادری اور قریب و دُور کے سب رشتے داروں سے ہاتھ دھو چکا ہوں۔ خدا نے مجھے بدنامی کی کالک سے بچا لیا ہے۔ شکر ہے بہشت مجھے بہت سستی مل گئی۔

یہ بند فارسی شاعری کی خیال آرائیوں اور صنائع بدائع کے برعکس سیدھی سادی زبان میں ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ لوک گیتوں اور سی حرفیوں کی شکل میں بھی مرثیے کہے گئے اور سلام بھی کہے گئے۔ ایک بہت قدیم سلام کے مطلع کا مصرعِ اولیٰ ہے:

ع مجری شہ کربلا صدمے اٹھیندا رہ گیا

ترجمہ: یعنی اے مجری! شاہ کربلا صدمے اٹھاتے رہ گئے۔

ایک نوحے کا نمونہ بھی دیکھیے جو حضرت قاسمؓ کی شہادت کے بارے میں ہے۔

لا مہندی گھوٹ رنگیلا وے
واہ وا بنا بن آیا
جج آسی تو گھوٹ تریایا
تیڈے سہرے سکدے لوتے

ترجمہ: اے پیارے اور سجیلے نوشہ! مہندی لگا لے۔ واہ بن میں دولہا کیسے آیا۔ وہ خود بھی پیاسا ہے اور براُت بھی تشنہ لب۔ تیرے سہرے کے پھول گرم لُو میں سوکھ رہے ہیں۔

چودھری نعمت رام نعمتی جامپوری فارسی کے علاوہ سرائیکی کے بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا ایک دوہڑہ یعنی چومصرعہ دیکھیے جس میں امام حسینؓ کے عالمِ شیر خوارگی میں ماں کی مامتا کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

جاں تے ہاشب ڈھلے ہا منہ چُمے ہا زہرائے
متاں رو پووے ڈکھ ہو پووے شالا سو پووے واہ وائے
ایہہ جانی اے تے نشانی اے تے نمانی ما دا سائے
شالا نام رہس تے نشان رہس فیض عام رہس ہر جائے

ترجمہ: یعنی حسین کو سوتے ہوئے جب رات ڈھل جاتی تھی تو جناب زہراؑ اٹھ کر آپؑ کا منہ چومتیں اور کہتی تھیں ایسا نہ ہو کہیں مرا لال رو پڑے۔ یہ روئے گا تو دل کو بڑا دکھ ہوگا۔ خدا کرے یہ یوں ہی سکھ کی نیند سوتا رہے۔ یہ تو جانی اور محبت کی نشانی ہے۔ یہ ماں کی روح ہے۔ اس کا نام و نشان ہمیشہ رہے اور اس کا فیضِ عام قیامت تک جاری رہے۔

قدیم دور کے ایک اور مشہور دوہڑے کا ایک مصرع دیکھیے:

ع اوہ خاصا ہا بہوں پیاسا ہا توڑے پاسا ہا دریا دا

ترجمہ: یعنی وہ خاصہ خاصان تھا۔ افسوس کہ وہ دریا کے کنارے پر بھی پیاسا رہا۔

پانچویں چھٹی ہجری سے ملتان میں تبلیغ اسلام کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چناں چہ شاہ یوسف گردیز، سید جلال الدین بخاری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت راجو قتال نے یہاں حسینیت کو فروغ دیا۔

ساتویں ہجری میں سلطان بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کے ساتھ امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی ملتان آئے اور انھوں نے یہاں عزاداری کی سرپرستی کی۔ ۱۳۷۰ء میں امیر تیمور نے جب اس علاقے پر حملہ کیا تو خضر خان کو ملتان کا حاکم بنا دیا۔ تیمور محبِ اہلِ بیت تھا اور تعزیہ داری کا بانی بھی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں جب سرائیکی شاعری پھل پھول رہی تھی، یہاں کے مرثیے کی خوشبو دور دور تک پھیل چکی تھی۔ بابا فرید اس دور کے بڑے شاعر ہیں۔ ہمایوں کا دور عزاداری کا روشن زمانہ تھا۔ اس میں بیرم خان کا بڑا ہاتھ ہے جو خود بھی شاعر تھا اور ملتانی زبان سے واقف تھا۔ یقیناً اس نے بھی مرثیے کہے ہوں گے لیکن افسوس کہ سرائیکی مرثیے کا قدیم سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔

سولھویں صدی عیسوی میں ابراہیم فرید ثانی ایک اہم شاعر گزرے ہیں۔ ان کے مرثیے کا ایک شعر ہے:

رووے بی بی فاطمہؓ بیٹے دونویں نہیں
میں کیہ چھڑیا رب دا میری جوڑی خاک رلی

ترجمہ: یعنی حضرت بی بی فاطمہؓ روتی تھیں کہ ان کے دونوں بیٹے نہیں رہے۔ میں نے کیا قصور کیا تھا کہ میرے دونوں بیٹے خاک میں مل گئے۔

سترھویں صدی عیسوی میں پنجابی مرثیے کا رنگ نکھر چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسویں میں جنگ نامے لکھے گئے۔ پنجابی میں پہلا جنگ نامہ پیر محمد کاسی نے لکھا۔ معروف صوفی شاعر حضرت سلطان باہو نے اپنے

ابیات میں امام عالی مقام کے حضور اپنی عقیدت کا نذرانہ یوں پیش کیا ہے:

جیکر دین علم وچ ہوندا تاں سر نیزے کیوں چڑھدے ہُو
اٹھاراں ہزار جو عالم آہا اوہ اگے حسینؓ دے مردے ہُو
جے کجھ ملاحظہ سرور دا کر دے، تاں خیمے تمبو کیوں سڑدے ہُو
جے کر من دے بیعت رسولی تاں پانڑیں کیوں بند کردے ہُو
پر صادق دین تنہاں دا باہُو جو سر قربانی کردے ہُو

ترجمہ: یعنی اگر دین صرف علم کا نام ہوتا تو کربلا میں سر نیزے پر کیوں چڑھتے؟ کربلا میں جو اٹھارہ ہزار عالم موجود تھے وہ حسینؓ سے پہلے اپنی جان دے دیتے۔ اگر وہ سرورِ دیں کا خیال کرتے تو سرِ شامِ غریباں سادات کے خیمے کیوں جلائے جاتے۔ اگر وہ رسولِ اکرمؐ کی بیعت پر قائم رہتے تو اہلِ بیت پر پانی کیوں بند کرتے؟ لیکن جو دین پر سچے دل سے قائم ہوں وہ حسینؓ کی طرح حق کی خاطر اپنے سر کی قربانی دیتے ہیں۔

اسی زمانے میں علی حیدر ملتانی، مولوی لطف علی، مولوی عبدالحکیم، سکندر اور میر مسکین نے دوہڑوں، سی حرفیوں اور منظوم داستانوں میں سانحہ کربلا کا ذکر کیا۔ یہ اردو شاعری کے معروف شاعر مرزا سودا کے ہم عصر تھے۔ خود مرزا سودا کے کلیات میں ان کے پنجابی مرثیے بھی شامل ہیں۔ ایک پنجابی مرثیے سے ایک شعر دیکھیے:

ویکھو اوہ دُکھیا رو رو کیکر جند نہ کھوئے
جس دا بابا دشت بلا وچ ذبح پیاسا ہوئے

ترجمہ: دیکھو! وہ دکھیا رو رو کر کیسے جان نہ گنوائے جس کے بابا دشتِ بلا میں پیاسا ذبح ہو جائے۔

مرزا سودا نے مرثیے کے سلسلے میں اپنے ہم عصر میر مسکین کا ذکر بھی کیا ہے جو سرائیکی کے شاعر تھے۔ اسی طرح اس زمانے میں سکندر پنجابی بھی جو محمد شاکر ناجی کے شاگرد تھے سرائیکی مرثیے کے شاعر تھے اور دہلی میں رہتے تھے۔ اس عہد میں پنجابی مرثیے نے کافی فروغ پایا۔ اس سلسلے میں دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ رکن الدین، رانجھا برخوردار اور شاہجہان مقبل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سکندر پنجابی کے مرثیے کا ایک شعر دیکھیے:

بی بی صغراؑ پیو دے غم وچ رو رو حال ونجایا
کھڑی رہی چوکھٹ دے اُتے اندر پیر نہ پایا

ترجمہ: بی بی صغراؑ نے باپ کے غم میں رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ وہ چوکھٹ پر کھڑی رہی اور اندر قدم نہ رکھا۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ پنجاب کا یہ ناز اپنی جگہ بجا ہے کہ اردو مرثیے کو منزلِ عروج کی طرف لے جانے والے اولین رہرو پنجاب سے تعلق رکھنے والے شعرا سکندر پنجابی اور میاں مسکین تھے۔ رکن الدین کے

مرثیے سے ایک اقتباس دیکھیے جس میں شہادت کا بیان کس قدر پُراثر انداز میں ہے:

اُٹھ بیٹھا جاں شمر چھاتی توں شاہ نماز گزارے
سجدے اندر اونویں موذی سر نوں کپ اتارے
ساعت اک اوس صبر نہ کیتا جدا کرے سر تن تھیں
شور پیا سب عالم اندر کرب و بلا دے بن تھیں
سب دھریا یا شاہِ شہیداں کرب و بلا وچ پیا
وچ بہشتاں رودن حُوراں ہوش اونہاندا گیا

ترجمہ: جب شمر لعین امام حسینؓ کی چھاتی پر سے اٹھا تو امام نے نماز ادا کی۔ جوں ہی آپ سجدے میں گئے۔ اس موذی نے سر کو تن سے جدا کر دیا۔ کربلا میں اس ظلم پر تمام کائنات میں شور برپا ہو گیا۔ کربلا کی خاک پر تشنہ لب شاہِ شہیداں ابدی نیند سو رہے تھے اور یہ منظر دیکھ کر جنت میں حوروں کے بھی ہوش اُڑ گئے تھے اور وہ بے اختیار رو رہی تھیں۔

شاہجہاں مقبل نے واقعہ کربلا کو مثنوی کی صورت میں لکھا۔ ان کے جنگ نامے میں بَین کا انداز دیکھیے:

زینبؓ آہیں ماریاں نالے اُم کلثومؓ
ویرا ساڈوں کر گیوں نمانیاں تے مظلوم
بی بی چوڑا بھنیا پٹ پٹ سٹے وال
سائیاں کر کر پھدی چیکاں مارے حال
نکوں نتھ اتار کے کہندی کر کر وین
رنڈا ڈیرا کر گیوں دولو شاہ حسینؓ

ترجمہ: حضرت بی بی زینبؓ اور حضرت بی بی اُم کلثومؓ آہیں بھر کر کہتی تھیں کہ اے بھائی! تمھارے بعد ہم بے کس اور مظلوم ہو گئیں ہیں۔ بی بی نے اپنی چوڑیاں توڑ دیں اور اپنے سر کے بال کھول دیے۔ وہ ماتم کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے سہاگ کی نتھ اتاری اور بین کر کے کہتی تھیں، اے ہمارے آقا! آپؓ کے بعد ہم بے یار و مددگار ہو گئی ہیں۔

رانجھا برخوردار اپنے جنگ نامے میں حضرت علی اکبرؓ کی میدانِ جنگ کو روانگی کا منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

حضرت رووے زار زار بیٹا توں نہ جا
میں جاں کراں مقابلہ جو کجھ کرے خدا

علی اکبر پھر رو رو کردا عرض کھڑو
بابا مینوں بھیج دے اللہ کرے سو ہو
شہزادے نوں شاہ نے آپ لائے ہتھیار
اسپ عراقی پڑ کے آپ کیتا اسوار

ترجمہ: حضرت امام حسینؑ نے رو رو کر اپنے بیٹے حضرت امام علی اکبرؓ کو کہا کہ تم میدانِ جنگ میں مت جاؤ۔ میں خود دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔ امام علی اکبرؓ نے رو رو کر عرض کی کہ بابا آپ مجھے بھیج دیں۔ خدا کو جو منظور رہوا ہوگا۔ اس پر امام نے شہزادے کے بدن پر خود ہتھیار سجائے اور ایک عراقی گھوڑے پر اُسے سوار کرایا۔

اسی دور میں حامد شاہ عباسی بھی مشہور مرثیہ گو شاعر گزرا ہے۔ اس کے جنگ نامے میں حضرت بی بی زینبؓ کے بین ملاحظہ کیجیے:

ہے ہے میرے والیا میرے شاہ حسینؑ
تیرے باجھ نہ آوندا اج اسانوں چین
ہے ہے مائی فاطمہؓ ہے ہے باپ علیؑ
ویکھو میرے آن کے روندے کیکر نین
ہے ہے بھائی حسنؑ جی ہے ہے قاسم شیر
اج یزیدی اسانوں سکھ نہ ویندے لین
کوئی وی آ کے اساں تے رحم نہ کردا مول
کھوہندی سر دے وال میں روندی کر کر وین

ترجمہ: افسوس میرے شاہ حسینؑ! آپ کے بغیر آج ہمیں چین نہیں۔ اے میری ماں فاطمہؓ! بابا علیؑ! آ کر دیکھیے میرے نین کیسے رو رہے ہیں۔ اے بھائی حسنؑ! اے قاسمؑ شیر! آج یزیدی ہمیں چین نہیں لینے دیتے۔ کوئی بھی آ کر ہم پر رحم نہیں کرتا۔ میں سر کے بال کھولے رو رو کر بَین کر رہی ہوں۔

انیسویں صدی کے پنجابی اور سرائیکی مرثیہ نگاروں میں غلام سکندر، منشی غلام حسن گامن، صید علی ملتانی، کمال مگسی، نور محمد چشتی، مخدوم شاہ محمود، شاہ چراغ چوہانوی، سید اکبر شاہ، کریم بخش بدر، بخش فقیر، غلام نبی حسینی، مولوی حبیب اللہ، مولوی فیروز، شرف حسین ملتانی، نور محمد گدائی، شمشیر علی ذاکر، غلام مصطفیٰ، موسیٰ لدھیانوی، عبدالرحیم استاد لاہوری، غلام محمد شاہ بخاری، مائل بہاولپوری، عاجز شاہ نواز خاں، خادم، سید نابت علی ملتانی، شائق، ذوالفقار شیرازی، مخدوم صاحب علی شاہ، فیض علی مشہدی، سردار علی شاہ مشہدی، صابر ملتانی،

محمد خان خوشابی، محمود مولائی، امام بخش، نبی بخش سکے زئی، فدوی اور بیدہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے غلام سکندر کا نمونہ کلام دیکھیے:

کر فکر میڈا ہمشیر نئیں
جو بچدا ہن شبیر نئیں
ولدی ول تقدیر نئیں
شبیرؑ نہ جیندا آسیا
روندی عمر وہا سیا

ترجمہ: اے میری بہن! میری فکر نہ کر کیوں کہ تیرا بھائی اب نہیں بچے گا۔ تقدیر نہیں بدلتی۔ شبیر واپس نہیں آئے گا اور تو ساری عمر رو رو کر گزار دے گی۔

کمال مگسی کے مرثیے کا ایک شعر دیکھیے:

رو بیمار اکبر کوں آکھے سُن میڈی گفتار وے ویرن
بھین غریب کوں چھوڑی ویندے کہی نبی لاچار وے ویرن

ترجمہ: بیمار صغرا بھائی اکبر کو کہتی تھی کہ بھائی میری بات سنو! ایسی کیا مجبوری ہے کہ مجھ غریب بہن کو اکیلے چھوڑ جا رہے ہو۔

بیسویں صدی میں دبیر پنجاب مولوی غلام حیدر فدا اور گُل محمد عاشق ملتانی مرثیے کو اوجِ ثریا تک لے گئے۔ ان شعرا نے اپنے ہی انداز اور اسلوب اختیار کیے۔ فدا نے مرثیے کے ساتھ مقفّٰی نثر کو رواج دیا۔ فدا کے ہم عصر عاشق ملتانی، مضطر ملتانی، آصف قمر، خادم اور ان کے بعد بہار، شوق، فوق اور غلام حسین منیر نے بھی مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔

میدانِ کربلا میں حضرت امام حسنؑ کے فرزند حضرت قاسمؑ عرب کے مشہور پہلوان ارزق کے چاروں بیٹوں کو قتل کرنے کے بعد جب ارزق کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس منظر کو عاشق ملتانی نثر و نظم میں یوں بیان کرتے ہیں:

"اے حُب دار امیرؑ دے! روون والے تخی شبیرؑ دے۔ جناب حسینؑ نے عباسؑ کوں فرمایا۔ میان وچ ونج۔ قاسم وار کرے یا دشمن دے وار کوں رو کے مرحبا آکھیں۔ عباسؑ میدان وچ آیا۔ قاسم کوں فرمایا:

آواز مرحبا ڈتا عباسِ نامدار
قاسم! عدو ہے سخت خبردار ہوشیار

مانند برق چمکے جڈاں تیغ آبدار
جاری رہے زباں تے یا حیدر کرار
قائل ہے کل زمانہ جو توں خورد سال ہیں
کھاویں نہ قطرہ خوف جو حیدر دا لال ہیں

ترجمہ: اے امیرؓ کے حب وار اتخی شبیر کے رونے والے! جناب حسینؑ نے عباسؓ سے فرمایا۔ میدان میں جاؤ۔ قاسم وار کرے یا دشمن کے وار کو روکے مرحبا کہنا۔ عباس میدان میں آئے اور انھوں نے قاسم سے کہا۔۔۔ عباسِ نامدار نے مرحبا کی آواز دیتے ہوئے کہا اے قاسمؑ! دشمن سخت ہے اس لیے خبردار اور ہوشیار رہنا۔ جب تمھاری تیغ آبدار بجلی کی طرح چمکے تو زبان پر یا حیدر کرار کا نعرہ جاری رہے۔ اگرچہ تم کم سن ہو مگر سارا زمانہ تمھیں مانتا ہے۔ تم حیدر کے لال ہو اس لیے ذرا بھی خوف نہ کھانا۔

بیسویں صدی عیسوی میں ملتانی زبان میں مرثیے کے سلسلے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ اس کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس زمانے میں پنجابی اور سرائیکی شاعروں نے اردو مرثیے کے زیر اثر اس صنف کو ایک نئی راہ دکھائی۔ ان مرثیوں میں اردو مرثیے کے اجزائے ترکیبی یعنی چہرہ، رخصت، آمد، سراپا، جنگ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، شہادت، بین اور دعا سب کچھ موجود ہے۔ اس دور کے ایک مشہور شاعر غلام حسین تائب کے مرثیے کا آغاز دیکھیے:

پڑھ بسم اللہ رکھ قدم قلم میدان صفحے قرطاس اُتے
لکھ صلِ علیٰ نت نام سید اتے لعنت ہر خناس اُتے
ول کربل والے غازیاں کوں لکھ پاس ایمان دی پاس اُتے
لکھ صاحب وفا ہر غازی کوں پر ختم وفا عباس اُتے
جہڑا ہیر شبیر دے بالاں توں رہیا صدقوں صدق پیاس اُتے
کیتا آن سلام امام دا جاں چا مشک اللہ دی آس اُتے

ترجمہ: اے قلم بسم اللہ پڑھ کر صفحۂ قرطاس کے میدان میں قدم رکھ۔ سیدؐ کے نام پر صلِ علیٰ لکھ اور ہر خناس پر لعنت۔ پھر کربل والے غازیوں کو اس امتحان میں کامیاب لکھ۔ یوں تو ہر غازی صاحبِ وفا تھا مگر عباسؓ پر وفا ختم ہے۔ جو حضرت شبیر کے بچوں کی پیاس پر قربان ہو گیا۔ جس نے اللہ کی آس پر مشک اٹھائی اور امام کو سلام کر کے روانہ ہوا۔

دبیر پنجاب غلام حیدر فدا کے ایک مرثیے کا اقتباس دیکھیے جس میں جنگ کے دوران تلوار کا چلنا کس خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔۔۔ بے ساختہ میر انیس یاد آ جاتے ہیں:

لشکی جاں تیغ ڈر توں زمیں تھر تھرا گئی
دل وچ پیا ایہہ خوف کہ اوہ تیغ آ گئی
پہنچی دھڑک دھمک تاں سمک خوف کھا گئی
اج تیغ آ کے فرش حشر دے وچھا گئی
ول ول کے وچ کے خبر گدی آسمان دی
ڈیون ملک فلک دے صدا الامان دی

ترجمہ: جب امام حسینؓ کی تلوار میدانِ جنگ میں چمکی تو خوف کے مارے زمیں تھرتھرا گئی۔ دشمن کی فوجوں کے دل میں یہ خوف چھایا کہ وہ تلوار آ گئی۔ اس کی دھڑک اور دھمک کو دیکھ کر پاتال پر بھی خوف طاری ہوگیا۔ آج تو یہ تلوار حشر کے فرش بچھا رہی ہے۔ اس تلوار نے بار بار بلند ہوکر آسمان کی خبر لی اور اسے دیکھ کر آسمان کے فرشتے بھی الامان کہنے لگے۔

اسی دور میں ملکھی رام نے کربلا کے موضوع پر باراں ماہ لکھا جو بہت مشہور ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

ہاڑ ہائے رگاں ہویاں خشک اندروں کرے وا ویلا پئی زبان پانی
کہیا شاہ حسینؓ نوں علی اکبر بابا طبع کیتی پریشان پانی
اگوں پاک امام جواب دتا صبر شکر دا لازمی جان پانی
ملکھی عقل تھیں سانوں معلوم ہووے دیسی وچ بہشتاں رحمان پانی

ترجمہ: سخت گرمی کا مہینہ ہاڑ آیا تو رگیں خشک ہوگئیں اور اندر سے پانی پانی کا واویلا ہوا۔ علی اکبرؓ نے شاہ حسینؓ سے کہا۔ بابا پانی نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ امام پاکؓ نے جواب دیا بیٹے صبر شکر ہم پر لازم ہے اے ملکھی! ہمیں معلوم ہوا کہ رحمان جنت میں ان پیاسوں کو ضرور پانی دے گا۔

دورِ حاضر میں جدید سرائیکی مرثیہ گو شعرا میں غلام حیدر یتیم، جانباز جتوئی، ارشاد جھنڈیر، خلیفہ نذیر حسین، محمودی، زوار جھامری، سرور کربلائی، اقبال سوکڑی، نسیم لیہ، پیر خلش اصحابی، محسن نقوی، حیدر گردیزی، ولدار بلوچ، شاہد عزیز، شاکر شجاع آبادی، احمد خاں طارق، عمران گردیزی اور کرامت گردیزی کے نام نمایاں ہیں۔ اقبال سوکڑی کا ایک شعر دیکھیے:

اقبال ہر ستم کوں مٹاون دے واسطے
ہر دور وچ ہے سخت ضرورت حسینؓ دی

ترجمہ: اے اقبال! ہر ظلم و ستم کو مٹانے کے لیے ہر دور میں حسینؓ کی سخت ضرورت ہے۔

نسیم لیہ امام عالی مقام کے حضور اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

جبریل کنوں نہ تھئے جیندے دیوار تے در تعمیرے
او قصر شریعت زہرا دے کیتا لختِ جگر تعمیرے
ایہہ نور محل کر سگدا ہا کیا کون بشر تعمیرے
تھیا خون حسین دے گارے نال اسلام دا گھر تعمیرے

ترجمہ: جس کے دیوار و در جبریل سے تعمیر نہ ہو سکے اس قصرِ شریعت کو زہرا کے لختِ جگر نے تعمیر کر دیا۔ یہ نور محل اور کون بشر تعمیر کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خونِ حسینؓ کے گارے سے ہی اسلام کا گھر تعمیر ہوا۔

موجودہ دور میں پنجابی مرثیے نے جن شعرا کی بدولت ترقی کی ان میں محمد بوٹا گجراتی، ملکھی رام، فقیر بخت علی، استاد ہمدم، بشیر احمد جھلا، غلام محمد باغبان، امیر الدین دائم اقبال، جیون شاہ، صفدر حسین، محمد شاہ ماہر، منشی محمد حسین، حشمت شاہ، حکیم لاہوری، محی الدین قصوری، مولوی نجم الدین فائز اور معراج دین اختر کے نام نمایاں ہیں۔ محمد بوٹا گجراتی کے یہاں شہادت کا بیان کچھ یوں ہے:

پائی جدوں شہادت ولی نے سی ویلا ظہر نماز دا
جا ڈگا اُپر زمین دے کر سجدہ عجز نیاز دا
پھڑ تیغ چلائی شمر نے جا اوپر منہ امام دے
جا پچھوں نیزہ ماریا بن انس سنان حرام دے
جھب گھوڑے اتوں لہہ کے اوہ خونی پُت یزید دا
پھڑ خنجر جا کٹ دا سر عالی قدر مجید دا
وچ سجدے سیس کٹا کے اس حضرت شاہ حسین نے
سر کٹاں ویلے بات نہ کوئی کیتی نور العین نے

ترجمہ: جب اللہ کے ولی نے شہادت پائی تو نمازِ ظہر کا وقت تھا۔ سجدے کے لیے وہ زمین پر آ گرے تو شمر نے تیغ امامؓ پر چلا دی۔ پیچھے سے سنان بن انس حرامی نے نیزہ دے مارا۔ وہ یزیدی خونخوار گھوڑے سے اترا اور اس نے خنجر سے حضرتؓ کا سر کاٹ دیا۔ سجدے میں حضرت امام حسینؓ نے اپنا سر کٹا دیا اور کوئی بات نہ کی۔

دائم اقبال دائم اپنے جنگ نامے میں کربلا کی زینب اور کنعان کی زینب کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اوہ یعقوب جائی میں علی جائی جے اوہ شان والی میں بھی شان والی
میں حسین دی بھین سدان والی اوہ یوسف دی بھین سدان والی

میرا نام زینب کربلا والی اوہدا نام زینب کنعان والی
سُتی رہی اوہ ویر دے ٹرن ویلے تے میں جاگدی رہی ارمان والی
روتی رہی اوہ گھراں وچ بیٹھ پردے قدم اک نہ بوہے تو چان والی
میں پردیسن مسافر بے وطن زینب کربلا جنگل ڈیرے لان والی

ترجمہ: حضرت بی بی زینبؑ فرماتی ہیں۔ وہ زینب یعقوبؑ کی بیٹی تھی۔ میں علیؑ کی بیٹی ہوں۔ اگر وہ عزوشان والی ہے تو میں بھی عزوشان والی ہوں۔ میں حسینؑ کی بہن ہوں اور وہ یوسفؑ کی بہن۔ میں کربلا والی زینب ہوں اور وہ کنعان والی زینب ہے۔ جب اس کا بھائی جدا ہوا تو وہ سو رہی تھی جب کہ میں نے جاگتے ہوئے بھائی کو الوداع کیا۔ وہ پردے میں بیٹھ کر اپنے گھر کے اندر روتی رہی اور اس نے ایک قدم باہر نہ نکالا جب کہ میں پردیسی اور مسافر ہوں اور کربلا کے جنگل میں مَیں نے ڈیرے لگائے۔

اسی طرح دائم کا ایک اور رنگ دیکھیے:

ویکھ ویکھ نقشہ سرخ کربلا دا حُور و ملک رو رو رہن وین کردے
پیہم نالے شمال جنوب کردے مشرقین کردے مغربین کردے
سُرمہ خاک شفا دا ڈال اکھیں غین غلط عقیدے نوں عین کردے
رو رو وین بے چین دن رین دائم یا حسین حسین حسین کردے

ترجمہ: کربلا کا سرخ نقشہ دیکھ کر حور و ملک رو رو کر بین کرتے رہیں گے۔ شمال ہو کہ جنوب اور مشرق ہو کہ مغرب مسلسل رونے کی آوازیں آتی ہیں اور خاکِ شفا کا سرمہ آنکھوں میں ڈال کر غلط عقیدے کو مٹاتے ہیں۔ اے دائم دن رات بھی رو رو کر اور بے چین ہو کر یا حسین یا حسین کہہ رہے ہیں۔

عہد حاضر میں جن پنجابی شعرا کے یہاں رثائیت کا رنگ ملتا ہے۔ اُن میں پیر فضل گجراتی، صحرائی گورداسپوری، عبدالحمید امر، حفیظ تائب، وحید قریشی، اصغر شامی، اختر امام رضوی، افضل پرویز، نذر بھٹی امام دین مجاہد، اسمٰعیل سفری، سلیم کاشر، یونس احقر، مظہر حیدری، اختر چنیوٹی، میاں برکت علی، چاچا جگ، بشیر احمد بشیر، امین خیال، اعزاز احمد آذر، شوکت علی قمر، خان محمد ساجد، نذیر چودھری، مقبول احمد، شہزاد قیصر، اختر حسین اختر اور نادر جاجوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے چند ایک شعرا کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے:

کہدا غم ہر ویلے ہجرا اے کہدے غم وچ اتھرو رُکدے نئیں
اوہ لال اے زہرا بی بی دا جہدے فیض دے چشمے سُکدے نئیں
حیدر دے شیر نے سر دے کے دس دتا ساری دنیا نوں

تو حیدر دا مطلب جو جانن اوہ غیراں اگے جھکدے نئیں
کربل دی دھرتی دے ذرے ایہو پیغام سناندے نئیں
عمراں مُک جاندیاں نیں تائب پر عشق دے پینڈے مُکدے نئیں

(حفیظ تائب)

ترجمہ: وہ کس کا غم ہے جو ہر وقت تازہ ہے۔ کس کے غم میں آنسو رُکتے نہیں۔ وہ حضرت بی بی زہرا کا لال ہے جس کے فیض کے چشمے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ حیدر کے شیر نے سر دے کر ساری دنیا کو بتلا دیا کہ تو حید کا مطلب جاننے والے کسی غیر کے آگے کبھی نہیں جھکتے۔ آج بھی کربلا کی دھرتی کے ذریعے یہ پیغام سناتے ہیں کہ عمریں ختم ہو جائیں لیکن عشقِ حقیقی کا سفر کبھی تمام نہیں ہوتا۔

خاکی جُسے اندر روح حسینی ہووے
فیر کسے کربل وچ باطل کیویں کھلووے

(افضل پرویز)

ترجمہ: خاکی جسم کے اندر اگر حسینی روح آ جائے تو کسی کربلا میں پھر اس کے مقابلے میں باطل کیسے کھڑا رہ سکتا ہے؟

کیہ دساں کس ظلم کمایا
آلِ نبی تے جو بیتی سی
بیتی کل جہان

ایہہ دنیا ایہہ میری دنیا
کربل دا میدان (وحید قریشی)

ترجمہ: کیا بتاؤں کس نے ظلم ڈھایا۔ آلِ نبی پر جو گزر رہی تھی اس کا اثر سارے جہان پر پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ میری دنیا بھی کربلا کا ایک میدان ہے۔

حسین ابنِ علی اج وی لوڑ تیری اے
چڑھی جہان تے مڑ ظلم دی ہنیری اے
ذلیل ہو چکی انسانیت جھیری اے
ہر اک نگاہ پئی دیوے اشاریاں دا سلام
قبول کروی لے نمانیاں وچاریاں دا سلام

(سلیم کاشر)

ترجمہ: اے حسینؓ ابن علیؓ! آج پھر آپ کی ضرورت ہے کیوں کہ دنیا پر پھر ظلم وستم کی آندھی چھائی ہوئی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسانیت ذلیل وخوار ہو رہی ہے۔ آج بھی ہر نگاہ اشاروں کی زبان سے آپؓ کو سلام کہتی ہے۔ میری ان بے چاری آنکھوں کا سلام بھی قبول کریجیے۔

دورِ حاضر میں پنجابی سرائیکی کے جدید مرثیے میں اظہار وابلاغ کی جدت کے ساتھ امام عالی مقامؓ کے مقصدِ شہادت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یعنی فکر میں نئے پن کے ساتھ ساتھ اس میں ایک تبلیغی رنگ نمایاں ہے۔ آج واقعۂ کربلا کو زندگی کی تعبیر اور ظالم ومظلوم، خیر وشر اور حق وباطل کی جنگ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ مرثیے کے اصل مضمون یعنی رثائیت میں بھی کمی نہیں آئی۔

سرائیکی اور پنجابی میں مرثیہ صرف ایک صنفِ سخن ہی نہیں بل کہ دینی شاعری کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور شروع ہی سے عزاداری کی مجالس میں اسے خاص پذیرائی حاصل رہی ہے۔ ان زبانوں میں یہ مرثیے شہادت ناموں، جنگ ناموں، سی حرفیوں اور سلام کی صورت میں بھی ہیں اور چوبرگوں اور حسینی ڈوہڑوں کی شکل میں صرف چار مصرعوں کی مختصر نظم کی صورت میں بھی ملتے ہیں۔ جن کا اثر مسلمہ ہے۔

عہدِ حاضر میں جدید حسیّت کے باعث مرثیے کا منظر نامہ کافی حد تک بدل چکا ہے کیوں کہ آج اس میں حسینی کردار کی عظمت ورفعت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے انقلاب آفریں واقعے یعنی سانحۂ کربلا کو اب پہلے سے زیادہ حریت اور آزادی کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی جاتی ہے۔ کیوں کہ آج کے ادب میں کربلا حق وصداقت کے ایک منور استعارے اور حریتِ فکر وعمل کی ایک روشن علامت کے طور پر زندہ ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

پنجابی اور فارسی کے لسانی و ادبی اشتراکات

پنجاب دُنیا کے قدیم اور تاریخی خطوں میں شامل ہے۔ آثار شناسوں اور محققین و مؤرخین نے یہاں سے ملنے والے مختلف آثار اور نقوش سے اس کی قدامت کا سراغ لگانے کا جتن کیا ہے۔ ماہرین کے اندازوں کے مطابق پنجاب کی تاریخ کئی ہزار سال پُرانی ہے۔ اگر ان اندازوں کو درست تسلیم نہ بھی کیا جائے تب بھی وادی سواں کے تہذیبی نقوش اور ہڑپہ سے برآمد ہونے والے آثار پنجاب کی پانچ ہزار سالہ قدامت کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں۔ یہ دھرتی زمانہ قدیم ہی سے مختلف حملہ آوروں کی گزرگاہ اور بعض کا مسکن و مامن رہی ہے۔ یہاں کئی اقوام آئیں اور آباد ہوئیں۔ پنجاب کے قدیم ترین باشندے دراوڑ خیال کیے جاتے ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ دراوڑ بھی یہاں کے اصلی باشندے نہ تھے بلکہ وہ ایشائے کوچک سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہوئے تھے اور آریاؤں کی آمد تک وہ یہاں سکونت گزیں رہے۔ آریا پنجاب میں شمال مغربی دروں سے داخل ہوئے۔ وہ یہاں بہت عرصہ گزار کر گنگ و جمن کی طرف بڑھے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ اس کے بعد یہ علاقہ سکندرِ اعظم، باختریوں، ہنوں، کشان، پارتھیوں اور ساسانیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ چوتھی صدی عیسوی میں چندر گپت موریا نے ساسانیوں کو شکست دے کر یہ علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے قافلے مغربی پنجاب پر قابض ہوئے۔ اس کے بعد اس علاقے پر مغلوں، سکھوں اور انگریزوں نے حکومت کی۔ قیامِ پاکستان کے وقت اس صوبے کو جو نوشہرہ سے دہلی تک اور جموں سے بہاول پور تک پھیلا ہوا تھا دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور مشرقی و مغربی پنجاب کے نام سے بالترتیب ہندوستان اور پاکستان میں شامل ہوا۔ مختلف اقوام کی آمد و رفت اور مختلف تہذیبوں کے باہمی میل ملاپ نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کو ایسی ہمہ رنگی عطا کی ہے جس کی مثال کم کم نظر آتی ہے۔

پنجاب اور ایران کا تعلق زمانہ قدیم سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخ کے معلوم دور سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ایران اور پنجاب کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے متعلق رہے ہیں۔ ہخامنشی دور سے ساسانی عہد تک تو پنجاب کا بیشتر علاقہ سلطنتِ ایران کا باقاعدہ حصہ رہا ہے۔ ہندوستان میں قائم حکومتوں کی

سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی یہاں تک کہ سکھوں کے دورِ اقتدار میں بھی فارسی ہی سرکاری زبان کے منصب پر سرفراز رہی۔ اہلِ ایران کی پنجاب کے ساتھ قدیم وابستگی اور فارسی زبان کی سرکاری حیثیت نے یہاں کی مقامی تہذیب وثقافت، زبانوں اور انسانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندوستان کی ساری زبانوں نے فارسی کے خوانِ علم وادب سے اپنی اپنی توفیق واستعداد کے مطابق ریزہ چینی کی ہے۔ پنجابی اور اُردو کے علاوہ یہاں کی دیگر زبانوں جیسے پشتو، سندھی، کشمیری، گجراتی، ہندی، بنگالی، براہوی اور بلوچی کی لسانی زیب وزینت اور ادبی رنگ وآہنگ میں فارسی کا حصہ دوسری تمام زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ عربی زبان وادب کے اثرات بھی ان زبانوں پر فارسی کے وسیلے سے پڑے۔ فارسی نے بھی یہاں کی زبانوں سے اظہار وبیان کے سلیقے اور ان کی لفظیات سے تازگی اور خوش بو کشید کر کے اپنے دامن کو وسعت دی ہے۔ بلاشبہ زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ انھیں تازگی، شادابی اور توانائی فراہم کرتا ہے اور وہی زبانیں زندہ زبانیں کہلانے کی حق دار ہیں جو دوسری زبانوں کے تجربات سے برابر کسبِ فیض کرتی ہیں۔

پنجابی زبان کے آغاز کے متعلق ماہرینِ لسانیات نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ماہرین کے ایک گروہ کے خیال کے مطابق ہندوستان کی بیشتر زبانوں کی طرح پنجابی بھی سنسکرت سے نکلی ہے۔ دوسرا گروہ اس نظریے سے متفق نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق سنسکرت ایک محدود اور جامد زبان تھی، اردگردی بولیوں سے اس کا میل جول نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک محدود اور جامد زبان کس طرح دوسری زبانوں کی تشکیل میں معاونت کر سکتی ہے؟ اس خیال کے حاملین نے دلائل وبراہین سے ثابت کیا ہے کہ سنسکرت اور پنجابی زبانوں کے قواعد میں اصولی اور بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کے نظریے کے مطابق پنجابی زبان کی تشکیل میں داوڑی بولیوں نے فعال اور بنیادی کردار ادا کیا۔ جب آریا پنجاب میں داخل ہوئے اُس وقت یہاں آباد دراوڑ اقوام میں یہی زبان جو بعد میں پنجابی کے نام سے موسوم ہوئی، رابطے کا ذریعہ تھی۔ ہڑپہ سے ملنے والے کتبے ہنوز پوری طرح سے نہیں پڑھے جا سکے، امکانِ غالب ہے کہ ان کی خواندگی کے بعد پنجاب کی زبان کو نئے تناظر میں دیکھنے کا موقع ملے گا اور اس زبان کے دوسری بولیوں اور زبانوں کے ساتھ رشتوں کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔

پنجاب کا نام دو فارسی الفاظ ''پنج'' اور ''آب'' کا مجموعہ ہے اور یہ نام اس دھرتی کو ہندوستان میں مسلم اقتدار کے زمانے میں ملا۔ اس سے پہلے یہ دھرتی مختلف ناموں سے موسوم رہی۔ پنجاب کے معلوم ناموں میں سے سب سے پُرانا نام ''سپت سندھو'' ہے۔ یہ نام رگ وید میں متعدد بار آیا ہے۔ اس کا مطلب سات دریاؤں

کی سرزمیں ہے۔ سپت کا لفظ پنجابی کے ست اور فارسی کے ہفت سے جو مشابہت رکھتا ہے وہ بھی فارسی پنجابی کے قدیمی روابط پر دال ہے۔ ژند اوستا میں اس دھرتی کو ''ہپت ہندوٗ'' کہا گیا ہے جو اسی سپت سندھو کی مبدل صورت ہے۔ پنجاب کو واہیک، پنج ند، شت گو، پے ٹوا اور پیتے پوتا موس جیسے ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ بیش تر ناموں کا مطلب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ اس دھرتی کے لیے پنجاب کا لفظ محمد آصف خاں کی تحقیق کے مطابق گیارھویں صدی عیسوی میں کشمیری پنڈت سوم دیو کی کتاب ''کتھا سرت ساگر'' اور شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئیوں میں استعمال ہوا۔ (۱)

پنجابی اور فارسی کے روابط زمانۂ قدیم سے قائم ہیں۔ اس لیے دونوں زبانوں میں واضح لسانی اور ادبی اشتراک پایا جاتا ہے۔ قدیم فارسی کے متعدد الفاظ جو جدید فارسی میں متروک ہیں، آج بھی پنجابی میں مستعمل ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کا ایک مصرع دیکھیے:

نہ ایدر ھمی ماند خواہی دراز

''ایدر'' کا لفظ جدید فارسی میں مستعمل نہیں مگر پنجابی میں ''ایدھر'' اب بھی انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اوہدر (بہ معنی آں طرف) بھی قدیم فارسی میں مستعمل رہا ہے۔ قدیم دراوڑ بولیوں کے بعض الفاظ پنجابی اور فارسی دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی کی تعمیر میں بھی پنجابی کی طرح دراوڑی بولیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ رہا ہے۔ ذیل میں پنجابی اور فارسی زبانوں کے لسانی اور ادبی اشتراکات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

رسم الخط

دونوں زبانوں کا رسم الخط ایک ہے۔ پنجابی ابتدا میں مختلف خطوں جیسے خروشتی، ناگری، لنڈا وغیرہ میں لکھی جاتی رہی ہے مگر جب سے مسلمانوں نے پنجاب میں قدم رکھے، اُس وقت سے اس نے فارسی رسم الخط کو اپنا لیا۔ بعد میں سکھوں نے پنجابی کے لیے گورمکھی رسم الخط اختیار کیا مگر مسلمانوں نے شاہ مکھی یعنی فارسی رسم الخط ہی کو اپنائے رکھا۔ مسلمان اب بھی اسی رسم الخط میں پنجابی لکھتے پڑھتے ہیں۔

حروفِ تہجی

فارسی اور پنجابی کے بتیس (۳۲) حروفِ تہجی مشترک ہیں۔ فارسی اور پنجابی کے حروفِ علت (الف، و، ی) میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔ حروفِ تہجی کے اس اشتراک کے باعث دونوں زبانوں میں الفاظ کا تبادلہ آسان ہے اور مستعار لفظیات میں اجنبیت اور مغائرت دکھائی نہیں دیتی۔ فارسی پنجابی حروفِ مشترک درج

ذیل ہیں:

ا، ب، پ، ت، ث، ج، چ، ح، خ، د، ذ، ر، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ،
ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی

مشترک لفظیات

فارسی اور پنجابی کے ہزاروں لفظ مشترک ہیں۔ پنجابی نے مختلف فارسی الفاظ کو من وعن قبول کیا یعنی تلفظ اور معنی سمیت۔ بعض فارسی الفاظ کا تلفظ اور معانی پنجابی نے اپنے مزاج کے مطابق بدل لیے۔ بعض الفاظ ہندوستان کی قدیم بولیوں اور زبانوں کے ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ فارسی پنجابی کا مشترک ذخیرۂ الفاظ اسمِ عام، اسمِ کیفیت اور اسمِ جمع کو محیط ہے۔ ذیل میں فارسی پنجابی مشترک ذخیرۂ لفظیات کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

آب، آتش، آہو، آدمی، آغاز، آزاد، ، آس، آسماں، آشنا، آل، آباد، آسان، آہستہ، آزادی۔ (پنجابی میں بعض اوقات الف ممدودہ کی جگہ الف مقصورہ استعمال ہوتا ہے جیسے آزاد کی جگہ ازاد اور آباد کی جگہ اباد۔) افسانہ، انار، استاد، باز، بیابان، باغ، بادام، بخت، بندہ، بول، برف، بنیاد، بانگ، بیلچہ، بستر، بغل، بوریا، بہشت، بادبان، بازار، بال، بُت، بلبل، بہار، بیوہ، باریک، بزرگ، بلند، پروانہ، پا، پشم، پیمان، پل، پیشانی، پری، پیشوا، پرچم، پیرہن، پیاز، پستہ، پیالہ، پیالی، پیغام، تازیانہ، تخت، تختہ، تن، تودہ، تابستان، تخم، تیشہ، ترازو، تسمہ، توشک، جا، جرگہ، جنازہ، جادو، جام، جنگ، جنگل، جہان، جان، جگر، جانور، چادر، چراغ، چمن، چارہ، چراگاہ، چشمہ، چرخ، چاہ، چرم، چشم، چیز، خار، خالو، خربوزہ، خواجہ، خنجر، خوراک، خوان، خزاں، خاک، خانہ، خر، خاور، خم، خو، خرگوش، خوبانی، خوشہ، دالان، دروازہ، دند، درد، دستہ، دیوار، دام، دانہ، دست، دشت، دم، دوزخ، دہقان، داماد، دربار، درویش، دوست، دشمن، دوگانہ، دمہ، دلیر، داستان، دامن، دستار، دل، دیگ، داغ، در، دستہ، دیگچہ، دیگچی، دلبر، دلدار، دورنگی، دورہ، دید، دیدہ، دیدار، دیو، راست، رخ، ران، رخسار، رشتہ، روز، روزگار، رہ، راہ، روزن، روزہ، ریگستان، روغن، ریزہ، زخم، زنگ، زہرہ، زہر، زمستان، زنجیر، زبان، زین، زانو، زر، زینہ، زائچہ، زن، زندان، زیور، زچہ، زندگی، زیرہ، سبزہ، سبزی، سیاہ، ساز، سائبان، سخن، سنگ، سم، سینہ، سوراخ، سیماب،

سرکہ، سیلاب، سایہ، ستارہ، سراب، سرسام، سرود، سود، سوزن، سیراب، سیخ، شاخ، شانہ، شب، شبستان، شاگرد، شاہ، سال، شاہین، شام، شبنم، شامیانہ، ستر، شمشیر، شوہر، شہباز، شکار، شلغم، شہر، شیشہ، شلوار، شورش، شکم، شگاف، شیر، شمار، طوطی، طبلہ، طشت، غنچہ، غلہ، غلیل، فاختہ، فالودہ، فرزند، فتراک، فرنگ، فولاد، فرشتہ، فانوس، فرخ، فرخندہ، فردوس، فجر، فرنی، قلاقند، قلندر، قیمہ، کاسہ، کرایہ، کشتی، کوچہ، کاخ، کاشانہ، کمر، کار، کشکول، کمند، کنیز، کوس، کاروان، کشور، کاغذ، کبوتر، کلید، کجاوہ، کمان، کوفتہ، کوہ، گرد، گردہ، گریبان، گلیم، گندم، گوہر، گرداب، گل، گلابگور، گہوارہ، گناہ، گوشہ، گوش، گیسو، گردن، گلو، گنج، گوشت، گنبد، لالہ، لشکر، لب، لبادہ، لنگ، لبریز، لفنگا، لگام، لگن، مال، ماہ، ماتم، ملخ، میخ، مادر، ماہی، مرغ، موم، میدان، مادہ، مایہ، مرغابی، مزدور، مہر، میدہ، میوہ، مزہ، میز، نرخ، ناسور، نسترن، ناخن، ناف، نسرین، نان، نشان، نمک، نشیمن، نغمہ، نمدہ، نہنگ، نقارہ، نگینہ، نوشادر، نقرہ، نماز، نوک، نوالہ، نواسہ، نوید، نیاز، نیام، نیچہ، نیزہ، نیش، نشتر، نیم، والا، ورزش، ویران، ورم، ہالہ، ہاون، ہندوانہ، ہستی، ہنگامہ، ہفتہ، ہوش، ہزار، ہشیار، ہمدم، ہما، ہنر، یاور، یزدان، یار، یخنی، یاد، یارانہ۔

فارسی کی اس لفظیات میں پنجابی نے اپنی ضرورت، مزاج اور جغرافیائی اثرات کے مطابق بعض جگہ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ مثال کے طور پر ''ش'' پنجابی میں بعض اوقات مبدل بہ ''س'' ہوتا ہے، اسی طرح ''ف'' ''گ''، ''غ'' پنجابی میں اکثر ''پ، پھ''، ''غ'' اور ''گ'' میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جیسے شیشہ بجائے سیسہ، باغ بجائے باگ، مغرور بجائے مگرور وغیرہ۔ پنجابی میں ایسے مرکبات بھی عام ملتے ہیں جو فارسی اور پنجابی الفاظ سے مل کر بنے ہیں۔ بعض مرکبات مکمل طور پر فارسی ہیں۔ شعرا نے فارسی کے الفاظ کو پنجابی کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان میں جو اضافے کیے ہیں، ان سے پنجابی زبان کو اظہار و بیان کے نئے پیمانے میسر آئے۔ جیسے زخم سے زخمایا، مشک سے مشکی، چمک سے چمکن، صاف سے صافوں وغیرہ۔

مصدر کی شناخت

فارسی میں مصدر کی شناخت ''ن'' سے ہوتی ہے، جیسے: خوابیدن، نشستن، خرامیدن، آراستن، نوشتن، خواندن وغیرہ۔ پنجابی میں ''نا'' سے مصدر کی پہچان ہوتی ہے؛ تاہم پنجابی میں ''ن'' سے بھی مصدر پہچانا جا سکتا ہے، جیسے: اٹھن، بہن، جاگن، سون، نہان، دھون، جان، رہن، کھلون، نسن، بجھن، کھاون، پیون، پچھن وغیرہ۔

ضمائر میں اشتراک

فارسی اور پنجابی کے ضمائر میں بھی کچھ نہ کچھ اشتراک پایا جاتا ہے۔ جیسے واحد حاضر کے لیے فارسی میں اُو اور پنجابی میں اوہ واحد حاضر کے لیے فارسی میں تو اور پنجابی میں تُوں استعمال ہوتا ہے۔ پنجاب کے بعض علاقوں میں "اوہ" کا "ہ" اور "تُوں" کا "ں" محذوف ہو جاتا ہے۔

قواعدِ جمع میں اشتراک

فارسی میں جمع بنانے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ واحد کے ساتھ "ان" کے اضافے سے جمع بنانے کا ہے۔ جیسے: بزرگ سے بزرگان، کودک سے کودکان، دند سے دندان، شاعر سے شاعران وغیرہ۔ پنجابی میں بھی "اں" کے اضافے سے جمع بنانے کا قاعدہ عام ہے۔ جیسے گل سے گلاں، چیز سے چیزاں، پھل سے پھلاں، مجھ سے مجھاں وغیرہ۔ پنجابی میں مستعمل فارسی الفاظ کی جمع بھی اسی طریق کے مطابق بنائی جاتی ہے، جیسے گلشن سے گلشناں، بہار سے بہاراں، ہوش سے ہوشاں، جنگ سے جنگاں وغیرہ۔

سابقوں لاحقوں میں مماثلت

فارسی کے بیشتر سابقے (پیشوند) اور لاحقے (پسوند) پنجابی میں بھی مستعمل ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

سابقے

شہ: شہسوار، شہتیر، شہکار، شہ رگ۔

بے: بے مزہ، بے کار، بے صبر، بے عیب۔

نا: ناسمجھ، نادان، نامعقول، ناواقف، نامحرم۔

لاحقے

گر: کاری گر، قلعی گر، ستم گر، زرگر۔

دار: دکان دار، چوکیدار، سرمایہ دار، دولت دار۔

ور: ہنرور، پیشہ ور، طاقت ور، زورور، سخن ور۔

ادبی اشتراکات

فارسی کی توانا ادبی روایت سے دُنیا کی دوسری زبانوں کی طرح پنجابی نے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔

اس استفادے کے باعث پنجابی زبان کو اصناف، موضوعات، تشبیہات و استعارات، تلمیحات و اشارات، لفظیات و مرکبات اور اظہار و بیان کا گنجِ گراں مایہ میسر آیا جس نے اس کے دامن کو کشادگی اور ادب کو ہمہ رنگی کے ذائقے سے متصف کیا۔ پنجابی کی عظیم شعری روایت صوفی شعرا کے عارفانہ کلام سے مستحکم ہوئی ہے۔ یہ صوفی شعرا فارسی اور عربی کے ذخائر سے کاملاً آگاہ اور فیض یاب تھے۔ انھوں نے فارسی کے عرفانی شاعروں سے کسبِ فیض کر کے پنجابی کی ادبی روایت کو سیراب کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ پنجابی کی مثنویوں اور قصوں کے عنوانات اکثر و بیشتر فارسی میں ملتے ہیں۔ بعض شعرا نے قصوں اور مثنویوں پر فارسی میں حواشی بھی لکھے ہیں۔ گویا فارسی پوری طرح پنجابی ادبیات میں رچی بسی نظر آتی ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ فارسی زبان و ادب کے استفادے نے پنجابی زبان و ادب کے دامن کو وسعت سے ہم کنار کیا۔ کرنل بھولا ناتھ اپنی کتاب میں فارسی کے ان اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ”مسلماناں نے اپنے ویلے پنجابی نال چنگی نبھائی، فارسی دی مدد لے کے ایہناں
> پنجابی دی چنگی ٹہل کیتی۔ تے اوہنوں مالا مال کر دتا۔ اسیں کہہ سکدے آں جو اج کل دی
> پنجابی مسلماناں دی بنائی ہوئی اے۔“(۲)

صنفی اشتراک

پنجابی میں اگرچہ مقامی اصناف جیسے: دوہڑا، شلوک، بھجن، کافی، وار، سورٹھہ، چوپائی، ستوارہ، باراں ماہ، سی حرفی وغیرہ ہر دور کے شعرا کے ہاں مقبول رہی ہیں اور ان اصناف میں شعرا نے لاجواب شاعری تخلیق کی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ پنجابی شعرا نے فارسی کی ادبی اصناف میں سے بہت سی اصناف جیسے: غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، مثنوی اور قطعہ وغیرہ کو اظہارِ جذبات و احساسات کا وسیلہ بنا کر بڑا اور اعلیٰ ادب تخلیق کیا۔ پنجابی کلاسیکی شعرا کے کلام سے چند نمونے مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پیش خدمت ہیں۔ یہ نمونے دونوں زبانوں کے باہمی تعلق کے غماز ہیں۔ پنجابی میں فارسی کی آمیزش اور پیوستگی دونوں زبانوں کے ہم مزاج ہونے کی خبر دیتی ہے:

بابا فرید

فریدا جے تو عقل لطیف، کالے لکھ نہ لیکھ
آپنڑے گریوان میں، سر نیواں کر دیکھ (۳)

اُٹھ فریدا! وضو ساج، صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نویں سو سر کپ اُتار (۴)

فریدا محل نِسکھن رہ گئے واسا آیا تل
گوراں سے نمانیاں بہسن روحاں مل
ااکھیں شیخا بندگی، چلن اج کہ کل (۵)

سیّد بُلھے شاہ

ہُن مینوں کون پچھانے، ہُن میں ہو گئی نی کُجھ ہور
ہادی مینوں سبق پڑھایا
اوتھے غیر نہ آیا جایا
مطلق ذات جمال وکھایا
وحدت پایا نی شور
ہُن مینوں کون پچھانے، ہُن میں ہو گئی نی کُجھ ہور
اوّل ہو کے لا مکانی
ظاہر باطن وسدا جانی
رہیا نہ میرا نام نشانی
مٹ گیا جھگڑا شور (۶)

سلطان باہو

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں ، عالم ہوئے سارے ہو
حرف عشق دا نہ پڑھ جانن بھلے پھرن وچارے ہو
اِک نگاہ جے عاشق ویکھے لکھ ہزاراں تارے ہو
لکھ نگاہ جے عاشق ویکھے کدی نہ کدھی چاہڑے ہو (۷)

سیّد وارث شاہ

حکم من کے سجناں پیاریاں دا قصہ عجب بہار دا جوڑیا ئے
فقرہ جوڑ کے خوب درست کیتا نواں پھُل گلاب دا توڑیا ئے

بہت جیو دے وچ تدبیر کر کے فرہاد پہاڑ نوں پھوڑیا ئے
سبھا وَدھ کے زیب بنا دِتا جیہا عرق گلاب نچوڑیا ئے (۸)

میاں محمد بخش

مان نہ کیجے روپ گھنے دا ، وارث کون حسن دا
سدا نہ دِسن شاخاں ہریاں ، سدا نہ پھول چمن دا
سدا نہ رسد بازاریں وسی ، سدا نہ رونق شہراں
سدا نہ موج جوانی والی ، سدا نہ ندئیں لہراں
سدا نہ تابش سورج والی ، جیونکر وقت دوپہراں
بے وفائی رسم محمدؐ ، سدا ایہو وچ دہراں (۹)

مولوی غلام رسول عالم پوری

حمد چراغ دلاں تاریکاں مشعل شب مجوراں
ہر ہر ذرّہ جس تھیں چمکیا وچ اقرار قصوراں
پاک منزّہ خالق عالم باجھ مثال نظیروں
اُس دا شکر نہ عذر بندے دا عقلاں دی تدبیروں (۱۰)

فارسی پنجابی کے منظوم نصابات

پنجاب میں بچوں کو فارسی زبان سے آشنا کرنے کے لیے نصاب الصبیان یا خالق باری کی طرز میں کئی منظوم نصاب لکھے گئے۔ خاص طور پر اورنگ زیب کے زمانے میں کثرت سے ایسے نصاب ملتے ہیں جن میں فارسی کی روزمرہ لفظیات کو پنجابی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے خیال کے مطابق ایک خاص تحریک کے زیرِ اثر ہندوستان کی مقامی زبانوں میں منظوم نصاب نامے تحریر ہوئے۔ پنجاب میں منظوم نصاب ناموں کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

> ”دیسی زبانوں میں نصاب لکھے جانے کی تحریک تقریباً ایک ہی زمانے میں نمودار ہوئی۔ سب سے پہلے یہ نصاب اُردو زبان میں شروع ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں میں لکھے جانے لگے۔ پنجاب نے اس تحریک کو بے حد فروغ دیا اور ایسے نصاب جن میں ذریعۂ تعلیم پنجابی تھی، کثرت کے ساتھ لکھے گئے۔“(۱۱)

فارسی پنجابی کے ان منظوم نصابات میں واحد باری، ایزد باری، اللہ باری اور صمد باری نہایت معروف ہیں۔ مدارس اور گھروں میں ان نصاب ناموں کی خواندگی نے فارسی پنجابی رشتے کو مزید استحکام بخشا۔

فارسی پنجابی کے باہمی تراجم

پنجابی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی فارسی کے چمنستانِ ادب کی خوشہ چینی سے کیا۔ پنجابی کا بیشتر کلاسیکی سرمایہ فارسی کے کھلے تراجم پر مشتمل ہے۔ فقہی مسائل کی بیسیوں فارسی کتابوں کے پنجابی میں منظوم تراجم ہوئے۔ معراج نامے، جنگ نامے، نور نامے اور سیرت کی حامل کئی منظوم و منثور فارسی کتابیں پنجابی میں منتقل ہوئیں۔ قصوں اور مثنویوں میں یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شاہ بہرام وغیرہ کے متعدد تراجم ملتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی، بوستانِ سعدی، پند نامۂ عطار، کریمائے سعدی، رباعیاتِ عمر خیام اور دوسرے فارسی شہ کاروں کے منظوم اور منثور پنجابی تراجم کی ایک بڑی روایت موجود ہے۔ پنجابی زبان نے ان تراجم کے ذریعے فارسی کے لسانی اور ادبی مزاج اور منہاج سے کامل استفادہ کیا اور اپنے دامن کو کشادگی عطا کی۔ پنجابی سے فارسی میں بھی تراجم ہوئے۔ پنجاب کے کئی رومانی قصے فارسی کے شاعروں نے نظم کیے۔ یوں پنجاب کی زمین کی بوباس سے فارسی شاعری کا چمنستان مشک بار رہا۔

حوالہ جات

۱۔ مزید دیکھیے: ہک ٹک از محمد آصف خاں؛ لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۲۰۰۴ء۔
۲۔ کرنل بھولا ناتھ: شہر لاہور دی تاریخ۔ لاہور؛ مرکنٹائل پریس؛ ۱۸۴۳ء؛ ص ۳۴۸۔
۳۔ آکھیا بابا فرید نے، مرتب محمد آصف خاں؛ لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ چھیویں وار، ۲۰۰۹ء؛ ص ۱۴۹۔
۴۔ ایضاً: ص ۲۱۶۔
۵۔ ایضاً: ص ۲۴۲۔
۶۔ آکھیا بلھے شاہ نے [مرتب: محمد آصف خاں]؛ لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ دوم، ۱۹۹۹ء؛ ص ۴۰۸۔
۷۔ بہ حوالہ: لعلاں دی پنڈ [مرتب: اقبال صلاح الدین]: لاہور؛ عزیز بک ڈپو؛ ۱۹۹۵ء؛ ص ۴۰۴۔
۸۔ وارث شاہ: ہیر وارث شاہ [مرتب: ڈاکٹر محمد باقر]؛ لاہور؛ پنجابی ادبی اکیڈمی؛ ۱۹۷۳ء۔
۹۔ بہ حوالہ: لعلاں دی پنڈ: ص ۵۲۷۔
۱۰۔ مولوی غلام رسول عالم پوری: یوسف زلیخا؛ میاں مولا بخش کشتہ اینڈ سنز تاجران و ناشرانِ کتب؛ لاہور؛ ص ۳۳؛ س ن۔
۱۱۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (ج: دوم): لاہور؛ مجلسِ ترقی ادب؛ دوم، ۱۹۸۷ء؛ ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر گل عباس اعوان

سرائیکی افسانے کا موضوعاتی مطالعہ

حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق پنجاب اردو کا مسکن و مولد ہے اور اردو زبان پر سرائیکی کے واضح اثرات موجود ہیں۔ جنوبی پنجاب کی زبان سرائیکی میں افسانہ، اردو زبان کے راستے آیا۔ اردو افسانے کی ترقی و ترویج کے پس منظر میں جو عوامل کارفرما ہے اور جو مسائل اردو افسانے کا موضوع بنے، کچھ اسی طرح کے مسائل کا سامنا سرائیکی خطے کے لوگوں کو بھی کرنا پڑا۔ سرائیکی افسانے میں، بھی کئی ایسے موضوعات سامنے آئے جو اردو میں پہلے کہیں نہ کہیں موجود تھے مگر ایسے بھی موضوعات سامنے آئے جو صرف سرائیکی خطے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سرائیکی افسانہ نگاروں نے کس حد تک اپنے معاشرے کا مطالعہ و تجزیہ کیا اور سرائیکی افسانے کو کن کن موضوعات سے روشناس کرایا۔ میرے نزدیک درج ذیل موضوعات سرائیکی افسانے میں بار بار آ رہے ہیں:

۱۔ وسیبی (خطے) قدروں کی پاسداری اور حقیقت پسندانہ رویہ
۲۔ تاریخی موضوعات
۳ ترقی پسندی اور روشن خیالی
۴۔ عشق و محبت اور رومانویت
۵۔ جاگیردارانہ نظام (نوآبادیاتی فکر) کے خلاف ردعمل
۶۔ ضعیف الاعتقادی کے خلاف احتجاج
۷۔ عورت پر مظالم
۸۔ زن، زر اور زمین پر جھگڑے
۹۔ جدید دور کے انسان کے مسائل اور آج کے انسان کا ردعمل
۱۰۔ تارکین وطن کے مسائل
۱۱۔ انسان دوستی و محبت کا درس
۱۲۔ بین الاقوامی مسائل (تراجم کے ذریعے مطالعہ و تجزیہ)

یوں تو سرائیکی افسانہ ”جھاڑو دا تیلہ“ 1948 سے لکھا جانے لگا تھا۔ (1) جب سرائیکی ادب میں ہفت روزہ (اختر) ماہنامہ اور سہ ماہی کے طور پر چھپنے لگے۔ اس کے بعد اور بھی ادبی رسائل سامنے آئے اور یوں سرائیکی

اصناف بھی (ان رسائل کے باوصف) تسلسل سے لکھی جانے اور چھپنے لگیں۔ سرائیکی افسانہ نگاروں کے پیش منظر اور پس منظر ان کا اپنا وسیب (خطہ، علاقہ) تھا جو پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح مقامی اور ملک گیر مسائل کا شکار تھا۔

1947ء کی تقسیم برصغیر نے سرائیکی خطے کو ثقافتی طور پر بہت متاثر کیا۔ اس خطے سے کوچ کر جانے والے دھرتی جائے (مٹی کے بیٹے) وادیِ سندھ کی عظیم تہذیبی و ثقافتی قدروں کے امین اور علمبردار تھے۔ ان کے جانے سے ایک بڑا تہذیبی و ثقافتی خلا پیدا ہو گیا۔ جسے یہاں آ کر بسنے والے فوری طور پر پُر نہ کر سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ اس وسیب (خطے) کے رہائشی نہ تھے اور نہ ہی یہاں کی تہذیبی و ثقافتی قدروں سے آشنا۔ لہٰذا سرائیکی کے اولین افسانہ نگاروں میں شمار ہونے والے افسانہ نگار غلام حسین حیدرانی کے افسانے (2) مرتبہ مہر گل محمد 1994ء میں دیہاتی قدریں، ان کی ترویج اور تحفظ کا واضح احساس ملتا ہے۔ دیہاتی لوگوں کا رکھ رکھاؤ، قربانی کا جذبہ، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت اور مل بیٹھنا ان کا موضوعِ خاص ہے۔ دیہات کی تہذیبی و ثقافتی قدروں کی پاسداری کا موضوع (مینگھ ملہاراں۔ ساونی دھپ) میں بھی نمایاں نظر آتا ہے

علی گڑھ تحریک کے اکابرین نے نشاۃ ثانیہ کی جوت جگانے کے لیے تاریخ کی ورق گردانی کا راستہ تلاش کیا تو سرائیکی افسانہ نگاروں نے بھی اپنی تاریخ کو موضوع بنا کر قارئین کو مسلمانوں کی تاریخ سے روشناس کرانے کی سعی کی۔ دلشاد کلانچوی نے یوں تو معاشرتی الجھنوں اور مسائل کے ساتھ ساتھ روایتی کہانیوں کو بھی موضوع بنایا ہے، مگر ''رات دی کندھ'' (3) میں ان کا افسانہ ''کوڑا''، ''نبی تے کوڑی'' ''نبین'' نے سرائیکی افسانے میں تاریخی موضوعات متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔

اردو علاقوں میں تو ترقی پسند تحریک اور اس کے اثرات 1936 سے ہی سامنے آنے لگ گئے تھے مگر سرائیکی خطے میں یہ اثرات تھوڑی تاخیر سے پہنچے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسندانہ سوچ کی گونج اقبال سوکڑی کے افسانہ شاداں 1966ء (4) سے شروع ہوئی تو اسماعیل احمدانی کے افسانوں ''ترلے'' 1969ء اور ''ترکیڑا'' سے ہوتی ہوئی، عامر فہیم کے ہاں ایک مربوط آواز کا روپ دھار لیتی ہے۔ عامر فہیم کے افسانوں میں جابر قوتوں کے خلاف بھرپور احتجاج ملتا ہے۔ احتجاج کے مختلف انداز، ان کے افسانوں 'بھارت، طوطے تے بڈھڑا، تنگی آکھ تے نیلا کیرہ، اسم اعظم اور سوجھلا'' وغیرہ میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ عامر فہیم کے مجموعے ''جاگدی اکھ دا خواب'' (5) کے ایک افسانے ''اسم اعظم'' میں راہ گیر ایک شخص کو روک لیتے ہیں۔ راہ گیروں کا یہ ہجوم اس سے ایک ہی سوال پوچھتا ہے کہ اس کے پاس کون سا اسم اعظم ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا وزن اٹھا کر جی رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس مشکل زندگی کا بوجھ صرف اسم اعظم جاننے والا ہی اٹھا سکتا ہے۔ وہ شخص اس بات کا مسلسل انکار کرتا ہے کہ وہ اسم اعظم جانتا ہے۔ لوگ اسے بہت تنگ کرتے ہیں تو وہ وہاں سے بھاگ اٹھتا ہے۔ مگر لوگ اس کے سر پہ جا پہنچتے ہیں۔

''ہمیں اسم اعظم بتا۔ انھوں نے چلا کر پوچھا، مجھے نہیں پتہ۔ اس نے چلا کر جواب

> دیا۔ کچھ ناخن کچھ دانت آگے بڑھے اور اس کی چمڑی ادھیڑنے لگے۔ اسکا خون بہہ نکلا۔ کپڑے خون سے رنگین ہونے لگے۔ اپنا خون دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔ ''دھب' اس نے ایک کی ناک پر زوردار مکا جڑا، وہ اچھل کر دور جا پڑا۔ گیلی مٹی کی خوشبو اس کے نتھنوں میں پہنچنے لگی۔ درختوں کے سرسبز و شاداب پتے ہلنے لگے، ہوا، پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ جادو ٹوٹ گیا تھا وہ سب چمکتے سفید کپڑے پہنے اس کے سامنے سجدے میں پڑے تھے (6)'' (ترجمہ راقم)

ترقی پسندی اور روشن خیالی کی ایک اور مثال، احسن واگھا ہیں۔ احسن واگھا کا شمار، سرائیکی کے پڑھے لکھے اور روشن خیال دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ریڈیو پاکستان میں ایک عرصہ خدمات دینے کے باوصف، ان کا مطالعہ ومشاہدہ وسیع ہے۔ انھوں نے فیوڈل سوچ کے مضامین، آفاقی قدروں بھائی چارے اور حریت فکر کے نظام کو پیش کیا ہے۔ البتہ جدید زندگی کے موضوعات نے ان کی لسانی تشکیلات کو متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید الفت ملغانی نے ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا لکھا ہے کہ ''وہ علامت برتنے کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (7)

سرائیکی افسانہ، نسوانی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، یہاں کی عورت صرف مسائل زندگی میں الجھ کر ہی نہیں رہ گئی بل کہ وہ زندگی اور زندگی کے رنگوں میں خود کو ڈھال (Adjust) لیتی ہے۔ زندگی جہاں بھی اسے سانس لینے اور اپنا آپ بیان کرنے کا موقع دیتی ہے، سرائیکی خطے کی عورت، اپنا بھرپور اظہار کرتی ہے۔

سرائیکی خواتین افسانہ نگاروں میں اہم ترین نام ''مسرت کلانچوی'' کا ہے۔ ''اُچی دھرتی، جھکا اسمان اور ڈکھن کنیں دیاں والیاں'' جیسے افسانوی مجموعوں کی خالق، مسرت کلانچوی نے سرائیکی افسانے کو نئے موضوعات دیے۔ عورت اور روہی کے دکھ بیان کرنے پر، انھیں ملکہ حاصل ہے۔ کہیں کہیں تو، روہی اور دکھ، ایک دوسرے کا عکس نظر آتے ہیں۔ مسرت کلانچوی کی تخلیقی قوتوں نے سرائیکی وسیب کی عورت کو اپنے مسائل اور وسائل کے درمیان زندگی گزارتا دکھایا ہے۔ سرائیکی وسیب میں موجود طبقاتی کشمکش نے، مصنف کو بے چین کر دیا ہے۔ آسمان جو کہ عدل انصاف، انتظام اور مساوات وغیرہ کی علامت تھا، مسرت کے مطابق یہی آسمان، طاقتور قوتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہا ہے۔ یہ طاقت ور قوتیں، آسمان سے غریبوں کے حقوق چھین رہی ہیں۔ کہیں آسمان، وسیب (خطے) کی رسم و رواج کے سامنے بے بس نظر آتا ہے تو کہیں دولت مند اپنی دولت کے زور پر اسے خرید رہا ہے۔ مسرت کلانچوی کو یوں محسوس ہوا کہ زمین (دھرتی) اونچی ہو گئی ہے اور اس کے مقابل آسمان جھک گیا ہے۔

سرائیکی افسانہ نگار خواتین میں دوسرا اہم نام ''شیما سیال'' کا ہے۔ سرائیکی رسائل کے ذریعے ان کے افسانے ہم تک پہنچے۔ شیما سیال کے افسانے، نسوانی محسوسات کا خوبصورت اظہار یہ ہیں۔ افسانہ ''شال'' کی واحد

متکلم کی، ریل گاڑی کے سفر کے دوران میں ایک خوبصورت نوجوان سے ملاقات ہوتی ہے۔ شدید سردیوں میں، ریل گاڑی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے آنے والی سرد ترین ہوائیں بھی اس کے اندر لگی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتیں۔ تاہم نوجوان کو سخت سردی سے بچانے کے لیے وہ اسے اس توقع پر اپنی شال دیتی ہے کہ یہ شال آئندہ کی ملاقات کا سبب بنے گی۔ شال اور ملاقات کے انتظار میں، اس کے بالوں کی سیاہ چمک چاندی کے تاروں میں بدل جاتی ہے مگر وہ نہیں آتا۔ پھر، ایک دن، اسے ایک نوجوان کے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔

> ایک لمحے بعد، اس کے سامنے وہی یوسف کھڑا تھا، جو کئی برس پہلے اسے گاڑی کے سفر کے دوران میں ملا تھا، مگر وہ تو جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا اور وہ خود، وقت کی جھریوں میں جکڑی جا چکی تھی۔ (8)

نوجوان اسے بتاتا ہے کہ اس کے والد نے مرتے وقت اسے وصیت کی تھی کہ یہ شال ہر حال میں واپس کرنا۔ یہ نوجوان اسی مسافر کا بیٹا تھا۔ وہ اس لڑکی کی کیوں ملنے نہ آ سکا، اس کا جواب، اسے اس پیغام کی صورت میں ملا۔ جو اس نوجوان نے اسے آ کر دیا، نوجوان نے بتایا کہ اس کے باپ نے کہا تھا کہ:

> ”میرا خیال تھا کہ جب میں اپنی پوشاک کو سورج میں گم کر دوں گا تو شال واپس کرنے جاؤں گا مگر میرے حالات نے مجھے اپنی گلی سے ہی نہیں نکلنے دیا۔ میرے ترازو کا پلڑا کبھی بھی برابر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکے تو مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا اور معاف کر دینا۔“(9)   (ترجمہ راقم)

سرائیکی افسانے میں ”وجودیت“ کے نظریات بہت واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ دیہاتی زندگی میں جاگیردار اور زمیندار کا کردار اتنا ہی مؤثر اور فیصلہ کن ہے، جتنا شہروں میں صنعت کار، سرمایہ دار، سرکاری افسر، عدالت اور پولیس کا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی منفی راستے پر چل نکلے تو لوگوں کی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے۔ سرائیکی افسانے کا ایک بڑا موضوع، دیہات میں جاگیرداروں اور زمین داروں کے مظالم ہیں، لہٰذا ”تتیاں چھانواں“(10)، ”پلر پانی“(11)، ”نگر دے پھل“(12)، ”وکاؤ چھانورا“(13) کے علاوہ ”کچیاں تندوں“ اور ”پنڈ ڈکھاں دی“ (قاسم جلال) میں ان مظالم کے خلاف یہاں کے دھرتی جائے کی بلند ہوتی آواز، محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان افسانوی مجموعوں میں ”فلسفہ وجودیت“ مختلف اشکال میں بار بار پڑھنے کو ملتا ہے۔ سرائیکی افسانے میں یہ فلسفہ شعوری اور لاشعوری دونوں طرح سے آیا ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں جہاں انسان کو اپنا وجود مجبور یا مٹتا ہوا نظر آئے گا، وجودی نظریات، بغیر کسی طبقۂ فکر کی رہنمائی کے، ٹکراؤ کے طور پر سامنے آئیں گے۔ روہی، سرائیکی وسیب میں ایک مقام کا نام ہی نہیں۔ اب تو یہ سرائیکی ادب میں ”تس، ڈکھ، بے وسی اور محتاجی“ کا استعارہ بن چکی ہے۔ دردانہ نوشین کا افسانہ ”بے بسی“ اگرچہ اردو میں ہے، مگر روہی کی تس کا ایک خوبصورت اظہاریہ ہے۔ سرائیکی افسانہ نگاروں

حفیظ خان، مسرت کلانچوی، احسن واگھا، اسلم عزیز درانی اور حیدرانی نے روہی کے مسائل کو بے پناہ لطافت سے پیش کیا ہے۔ تھل کی تس کی وجہ سے نقل مکانی کرتے لوگ، ان کی بے گھری، ان کی بے بسی، ماؤں کی گودوں میں مرتے بچے، سانپ کے ڈنگ سے مرتی حیات، حیات سے جڑی خوشیاں۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اگر سرائیکی افسانہ نہ ہوتا تو روہی کے مسائل باہر کی دنیا کے سامنے نہ آتے۔

زن، زر اور زمین سے منسلک مسائل بھی سرائیکی افسانے کا موضوع ہیں۔ زر اور زمین کی خواہش نے انسان کے اندر کی انسانیت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ شیما سیال کا افسانہ ”میڈا گھر“ بتول رحمانی کے زیادہ تر افسانے اور ”ڈوجھی کندھی“ (14) کے افسانے معاشرتی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

جنس کی اپنی نفسیات ہے۔ حفیظ خان اور احسن واگھا نے انسان کے جنسی مسائل کو جس حقیقت نگاری سے پیش کیا ہے، وہ نہایت ہی قابلِ ذکر ہے۔ احسن واگھا کا افسانہ ”ماس دے مُل“ میں مرد کی نفسیات کے حوالے سے جنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک نوجوان اور ترقی پسند سوچ رکھنے والے قلم کار کے عمیق مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ (15) حفیظ خان نے ”ویندی رُت دی شام“ میں جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ”تن من سیس سریر“، ”جنت، حور، قصور“ اور ”قاتل“ میں تیلی کا کردار، جنسی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حفیظ خان کا افسانہ ”تن من سیس سریر“ جنسی نا آسودگی کا خوبصورت اظہاریہ ہے۔

جنس ایک نفسیاتی مسئلہ ہے تو حفیظ خان کا یہ افسانہ ایک بڑا افسانہ ہو سکتا تھا۔ اگر اسکا مرکزی کردار ذہنی کشمکش کے ارتقائی مراحل طے کرتا تو یہ ایک بڑا افسانہ ہوتا۔ ارتقائی مراحل سے مراد یہ ہے کہ جس طرح افسانے کا مرکزی کردار، افسانے کے آخر میں اپنی بہو کی طرف ”مائل“ نظر آتا ہے اگر اس طرح وہ اپنے علاقے کی دیگر عورتوں پر دست درازی کرتا تو یہ اس کا نفسیاتی ارتقا ہوتا۔ مگر کسی اور عورت پر دست درازی کیے بغیر اس کا اپنی بہو کی طرف بڑھنا پہلے سے طے شدہ عمل "Pre-decided action" دکھائی دیتا ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ سرائیکی میں جنسیات کے موضوع پر ایک قابلِ ذکر افسانہ ہے۔

سرائیکی افسانہ محض بے چارگی، بے بسی اور کم ہمتی کا اظہاریہ نہیں بل کہ ان مسائل کے مقابل، آج کے انسان کا ردِعمل بھی ہے۔ ”بشارت“، ”پرلی کندھی“، ”اسمِ اعظم“، ”چھیکڑی شعاع“ جیسے افسانوں میں آج کے انسان کا ردِعمل واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے فلسفہ ”عصا نہ ہو تو کلیمی ہے بے کار بے بنیاد“ کے مصداق، اپنے مسائل اپنی دانست اور اپنی قوت کے بل بوتے پر حل کرنے کو تیار ہو چکا ہے۔

سرائیکی افسانے کا ایک اہم موضوع یہاں کے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی ہے۔ اس ضعیف الاعتقادی نے نہ صرف انھیں بے عمل بنا دیا ہے، بل کہ ایک آرام پرست طبقہ ان پر مسلط ہو چکا ہے۔ سرائیکی افسانہ میں اس ضعیف الاعتقادی سے جنم لینے والے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جہاں غریب اور متوسط طبقہ اپنے وسائل خود لے کر حاضر ہوتا ہے اور نذر، نذرانے کے طور پر پیش کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ جبکہ اس کا اپنا

خاندان، زندگی کی بنیادی سہولتوں کو ترس رہا ہوتا ہے۔ افسانہ "بغاوت" (15) اس کی واضح مثال ہے، جس میں بالآخر "زرقا" اپنی ماں کو پیر صاحب کے گھر سے لے کر ہسپتال داخل کرا دیتی ہے۔ اس طرح کی اندھی عقیدت کو اللہ بخش یاد نے بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

سرائیکی افسانے میں تراجم کے ذریعے خطے کے مسائل کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی مسائل بھی سرائیکی افسانے کا موضوع رہے ہیں۔ تراجم نگاروں میں محترم اسلم رسولپوری، سئیں اسماعیل احمدانی، ڈاکٹر قاسم جلال، مرید قیصرانی، فرحت نواز، ممتاز حیدر ڈاہر، ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، تنویر شاہد محمد زئی نے قابل ذکر کام کیا ہے۔ تنویر شاہد محمد زئی نے اُردو سے سرائیکی میں افسانے ترجمہ کر کے، بہت سے نئے موضوعات سے سرائیکی ادب کا دامن مالا مال کیا ہے۔

ان موضوعات کے علاوہ باہمی محبت کا درس و اہمیت، تارکین وطن کے مسائل، ڈرون حملوں سے پیدا ہونے والی بے چینی بھی سرائیکی افسانوں کا موضوع بنی رہی ہے۔ جس طرح سرائیکی افسانہ اپنا سفر کر رہا ہے، امید ہے جلد ہی اس کی فنی و فکری اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ ضروری ہے کہ سرائیکی افسانہ کے بارے کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اسکا مطالعہ کیا جائے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید ۔ (مرتب) پنجابی زبان وادب کی مختصر تاریخ ۔ مضمون از حنیف چوہدری
2۔ غلام حسین حیدرانی ۔ غلام حسن حیدرانی کے افسانے (مرتبہ گل محمد) مجلس ایوان تعلیم ملتان ۔
3۔ دلشاد کلانچوی ۔ رات دی کندھ ا کادی سرائیکی ادب، بہاول پور ۔ 1988
4۔ اقبال سوکڑی ۔ شاداں ۔ مطبوعہ ہفت روزہ اختر ــــ ملتان ۔ 1966
5۔ عامر فہیم ۔ جاگدی اکھ دا خواب ۔ الکمال اشاعتی ادارہ، ڈیرہ غازی خان ۔ نومبر 1978
6۔ عامر فہیم ۔ ــــ جاگدی اکھ دا خواب ــــ
7۔ ڈاکٹر حمید الفت ملغانی ۔ لکھت تے لکھاری ۔ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۔ 2003
8۔ امراؤ طارق (مرتب) سرائیکی دے شاہکار افسانے (افسانہ شال از شیما سیال) طیب اقبال پرنٹرز لاہور، 2001
9۔ ایضاً
10۔ ظفر لشاری، تتیاں چھانواں، سرائیکی ادبی تحریک، احمد پور شرقیہ، 1984
11۔ میاں نذیر، پلر پانی، پاکستان سرائیکی رائٹرز گلڈ، ملتان، 1990
12۔ سید نصیر شاہ ۔ گکر دے پھل ۔ پنجابی ادبی بورڈ لاہور، 1987
13۔ عبدالباسط بھٹی، وکاؤ چھانورا، سمل پبلی کیشنز، احمد پور شرقیہ، 2004
14۔ تحسین سبائے والوی، ڈوجھی کندھی (مرتبہ غلام جیلانی چاچڑ)، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان، 2001
15۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، سرائیکی زبان وادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان اسلام آباد طبع سوم 2006، ص 143
16۔ ڈاکٹر گل عباس اعوان ۔ (افسانہ بغاوت) مشمولہ سوجھل سویل نمبر ۔ جھوک پبلی کیشنز ملتان

محمد عارف

چلو ناران چلتے ہیں!

ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلے اور ساڑھے سات بجے واہ کینٹ بیریئر 2 سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ ٹورسٹ ہمارے ساتھ تھے اور کچھ حضرات راستے سے اُٹھائے گئے۔ حسن ابدال سے نکلے تو تعداد میں تینتیس ہو گئے اور بالاکوٹ تک یہ تعداد پینتیس تک پہنچ گئی کہ مانسہرہ سے ہزارہ یونیورسٹی کے فزیکل ایجوکیشن کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ محمد اقبال اور بالاکوٹ سے ''پی ٹی ڈی سی'' موٹل کے مینیجر طیب میر صاحب بھی ہمراہ ہو گئے۔

ہری پور سے نکلتے ہی بعض احباب کی چھوٹی انگلی بار بار اُوپر اٹھنے لگی، جب یہ فریکوئنسی بڑھ گئی تو میرِ کاروان راجہ نثار نے کسی ناگہانی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے گاڑی ایک سائیڈ پر روک لی اور انگلی کھڑی کرنے والے احباب تیزی سے نیچے اُتر گئے۔ کافی دیر بعد قافلہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔۔۔ بالا کوٹ کی وادی میں داخل ہوئے تو تھوڑا آگے جا کر ایک موڑ مڑنے کے بعد گاڑی ایک ایسی جگہ روکی گئی جہاں سے بالا ہی بالا، بالاکوٹ اور دریائے کنہار کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سڑک کے ساتھ کچے پر گاڑی پارک کر دی گئی۔۔۔ بریک کا اعلان ہوا اور ٹورسٹ جو اب اپنے آپ کو مکمل اور بجا طور پر ٹورسٹ سمجھ رہے تھے اپنے اپنے کیمرے اور موبائل سنبھالتے نیچے اُتر گئے۔ دن بارہ بجے کا وقت ہوگا، سورج بالکل سر پہ تھا نظارے بہت خوب تھے لیکن کیمرے کی آنکھ انھیں اس طرح دیکھنے سے قاصر تھی جیسے سر کی آنکھ دیکھ رہی تھی، کہ اس وقت منظر روشن ہو بھی تو چہرے تاریک ہو جاتے ہیں۔

اگلا پڑاؤ کیوائی میں ہوا، جمعے کا دن تھا، کیوائی اُترتے ہی کچھ احباب نے مسجد کی راہ لی، لیکن مسجد راہ میں نہ تھی، ڈیڑھ بجے کا وقت تھا، جس راہ گیر سے مسجد کا پتا پوچھتے وہ ٹورسٹ نکلتا، دکان دار حضرات سے دریافت کیا تو ایک ہی مسجد میں جمعہ کی نماز کے تین وقت نکلے۔۔۔ اس کے بعد مزید کچھ پوچھنے کے بجائے وہ راہ لی جو مسجد کی راہ تھی لیکن عجیب بات ہے کہ مسجد راہ میں نہ تھی ملی کہ ایک پہاڑ کے دامن میں کچھ پہاڑ کے اندر اور کچھ لٹکی ہوئی۔ مسجد کے قریب پہنچے تو لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ ہم ایک غسل خانے کی لائن میں لگ گئے

کہ کُل ملا کے دوہی تو تھے۔۔۔ ایک غسل خانے سے تین صاحب فیض یاب ہو چکے تھے اور ایک تھا کہ اس سے پانی گرنے کی آواز تو آ رہی تھی لیکن اندر والے صاحب باہر آنے کو شاید رضامند نہیں۔۔۔ اور باہر والے اندر والے کی قبض اور اسی قسم کی دیگر بیماریوں کو موضوعِ بحث بنائے ہیں، ایک صاحب کہنے لگے کہ اندر جو پانی آ رہا ہے وہ گلیشیر کا ہے شاید ان کا کچھ حنوط ہی نہ ہو گیا ہو۔۔۔ دوسرے غسل خانے سے جب چوتھے صاحب باہر آئے تو اپنی باری کا انتظار کرنے والے صاحب نے غصے اور کچھ ڈرتے ڈرتے دروازہ اندر دھکیل دیا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔ ٹوٹی کھلی تھی، لوٹا لبالب بھرنے کے بعد بہہ رہا تھا۔۔۔ اور اندر کوئی بھی نہ تھا۔ خیر وضو کیا اور نماز کے لیے مسجد کا دروازہ ڈھونڈا اور اندر پہنچے۔ مسجد کی وسعت ایک چھوٹے سے قصبے کا پتا دیتی تھی۔ اندر چند نمازی اور مولوی صاحب کسی بحث ومباحثے میں شریک تھے، نمازی حضرات اپنی گفت وشنید سے مسجد کمیٹی کے ممبران ٹائپ کی کوئی چیز معلوم ہوتے تھے۔ خیر نماز پڑھی اور اسی راستے سے واپس پہنچے جس راستے سے گئے تھے اور یہ کوئی آسان راستہ نہ تھا۔

واپس آئے تو کچن بس کی چھت سے اُتر چکا تھا، گیس کا چولہا ایک زیرِ تعمیر بلڈنگ کی چھت پر روشن تھا اور بریانی دَم لگنے کے قریب تھی، اس کی خوش بو سے بھوک مچل اٹھی، ہم دَم کا حساب ذہن میں رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے آوارہ ہو لیے۔۔۔ اقبال صاحب، طیب میر اور ہم کیوائی کے اس نالے کے ساتھ ہو لیے جو پہاڑوں پر سے اتر رہا ہے اور نالا اور آبشار کے درمیان کی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے ہم اس کے کنارے کنارے چلتے کافی اوپر تک ہو آئے، کچھ تصویریں لیں اور لوٹ آئے۔ چٹائیاں لگ چکی تھیں، صفیں سیدھی ہو رہی تھیں، رائتہ اور سلاد تیار تھا۔ چند منٹ بعد بریانی پتیلے سے ڈشوں اور پھر پلیٹوں سے ہوتی ہوئی وہاں منتقل ہونا شروع ہو گئی جو اس کا اصل مقام تھا۔ کھانے کے بعد کچن سمیٹ کر دوبارہ چھت پر چڑھا دیا گیا اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔

عصر کا وقت نکل رہا تھا اور کاغان شہر کی آمد آمد تھی۔۔۔ بازار کے درمیان میں کاغان کی خوب صورت جامع مسجد ہے یہاں گاڑی نماز کے لیے رکی اور جب بھائی لوگ نماز پڑھ کر واپس آئے تو بہت سوں کی بتیسی راگ الاپ رہی تھی۔ فوری طور پر جیکٹ اور اوورکوٹ نکل آئے اور چند منٹ کے بعد قافلہ خراماں خراماں ہو گیا۔ اب رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔۔۔ روڈ خطرناک، ٹریفک زیادہ اور پھر چڑھائی سونے پہ سہاگہ۔ ناران سے تقریباً دس کلومیٹر دور ہوں گے کہ ٹریفک آہستہ آہستہ ہوتے بالکل رک گئی۔۔۔ چند منٹ انتظار کے بعد نیچے اُتر کے دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی لائن تھی اور آگے والی گاڑیاں وہی خاص پاکستانی سٹائل میں جلدی نکلنے کی

کوشش میں تین رویہ ہو گئیں وہ بھی وہاں جہاں بہ مشکل دو رویہ کی گنجائش تھی۔۔۔ شام کے سائے گہرے ہونے شروع ہو گئے تھے، اور سردی شدت پکڑتی جا رہی تھی، کافی دیر انتظار کے بعد بھی جب کچھ ہل جُل نہ ہوئی تو آگے جا کر قوعہ دیکھنے کی خواہش ہوئی، پہنچے تو معلوم ہوا کل لینڈ سلائڈنگ کے باعث روڈ کا ایک حصہ ”کنہاڑ“ بُرد ہو گیا تھا اور آج بارش کے باعث اس بیس پچیس گز کے کچے رستے پر چند مقاماتِ آہ و فغاں اور ایک گڑھا ایسا آتا ہے جو چڑھائی پر چوٹی سے تھوڑا نیچے ہے، جس کے آگے کار اور اس قبیل کی ملتی جلتی گاڑیاں اپنے ”گوڈے“ ٹیک دیتی ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ دس منٹ میں ایک گاڑی نکلتی ہے، تمام راستہ گارے اور کیچڑ سے لت پت ہے اور کار اپنے زور سے نہیں ٹورسٹ کے زورِ بازو سے پار جاتی ہے۔۔۔ گاڑی ایک خاص مقام پر پہنچتی تو دونوں اطراف میں کھڑے ٹورسٹ اسے رکنے کا اشارہ کرتے۔۔۔ اگلی گاڑی اس مقامِ آہ و فغاں سے نکلتی تو اشارہ ملتا۔۔۔ اس گاڑی والے کو با آوازِ بلند ہدایات دی جاتیں۔۔۔ پہلے گیئر میں۔۔۔ بریک نہیں لگانی۔۔۔ سیدھا ہو کے۔۔۔ جہاں ٹارچ جل رہی ہے وہاں سے رائیٹ۔۔۔ پھر لیفٹ۔۔۔ رکنا نہیں۔۔۔ رفتار کم نہیں کرنی۔۔۔ اس خاص مقام پر ٹورسٹ کی ایک ریسکیو ٹیم موجود تھی جو گاڑی پھنسنے کی صورت میں خود اپنی جان پر کھیل کر اسے پار لگاتے کہ یہ پار جاتی تو ان میں سے کسی اور کی باری پار جانے کی آتی۔۔۔ اب کافی دیر سے منافع خوری کا شکار، ایک اوور لوڈڈ ٹرک اس گڑھے میں زور آزمائی کر رہا ہے۔۔۔ ٹورسٹ بے چارے اس بلا کو کنارے لگانے کے لیے اپنا سارا زور لگا رہے ہیں۔۔۔ یک دم ایک نعرہ بلند ہوا۔۔۔ ٹرک گڑھے سے باہر نکلا۔۔۔ داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک تیز رفتاری سے واپس آیا اور ایک صاحب کو اس زور کی ٹکر لگی کہ وہ ہوا میں اچھلتے ہوئے کئی گز دور روڈ کے کنارے جا گرے، تھوڑا آگے گرتے تو سیدھا دریا میں گرتے۔۔۔ خون میں لت پت چہرہ لیے یہ صاحب بے ہوش ہو چکے تھے۔۔۔ موبائل سروس بند تھی۔۔۔ ان کی جیب سے گاڑی کے کاغذات برآمد ہوئے ان کی گاڑی تلاش کی تو پتہ چلا ان کے ساتھ صرف خواتین ہیں۔۔۔ درجنوں گاڑیوں میں کسی کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان نہیں۔۔۔ کافی دیر بعد انھیں ہوش آیا، ایک صاحب کے ساتھ انھیں بالاکوٹ روانہ کیا گیا۔۔۔ گاڑیوں کے اس گورکھ دھندے سے اُن کی گاڑی واپس کیسے ہوئی یہ ایک الگ داستان ہے۔۔۔ اب لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اس گڑھے کو پاٹنے میں لگ گئے۔۔۔ کافی دیر بعد کچھ صورت بہتر ہوئی اور گاڑیاں نکلنا شروع ہو گئیں۔۔۔ اور کچھ دیر بعد ہی یہ سلسلہ پھر موقوف ہو گیا کہ اب جو گاڑیاں دوسری طرف رکی ہوئی تھیں وہ آ رہی ہیں اور پھر وہی ہوا جو کہ اس موقع پر ہوتا ہے کہ ادھر تین رویہ قطاروں کے باعث روڈ مکمل طور پر بند

تھا۔۔۔ آنے والی گاڑیوں کے لیے دو ہی رستے تھے، اُڑ کے آئیں یا نیچے دریائے کنہار میں اُتر کر پار آئیں۔۔۔ کئی سو گاڑیاں پھنس چکی تھیں، بڑی محنت اور منت ترلے کے بعد ایک لائن کلیئر کی گئی، آنے والی گاڑیاں گزریں اور پھر ہم لوگ روانہ ہوئے۔۔۔ قافلے پر پژمردگی چھا چکی تھی۔۔۔ بھوک لگ رہی تھی ایک مشورہ یہ بھی آیا کہ مینو کے مطابق کوفتے پکنے ہیں کیوں نہ ادھر ہی پکا لیے جائیں۔۔۔

ساڑھے سات بجے ناران پہنچنا تھا ساڑھے دس پہنچے، گاڑی سے اُترتے ہی شدید سردی نے استقبال کیا۔۔۔ پہلا پڑاؤ ”کنہار ویو“ ہوٹل تھا۔۔۔ جہاں چند کمرے بک تھے۔۔۔ ادھر کے سامان اتارا، لوگ اتارے، ان کو کمروں میں ایڈجسٹ کرتے کافی وقت لگ گیا۔۔۔ باقی بچ رہنے والے لوگ اپنے اگلے پڑاؤ ”پی ٹی ڈی سی“ موٹل روانہ ہوئے۔۔۔ پہنچے تو یہ موٹل کچھ سست اور کچھ سویا سویا سا لگا۔۔۔ استقبالیہ پر تھوڑی دیر بعد مینجر ہوٹل ہذا اصغر علی تنولی بھی آ گئے۔۔۔ حال احوال دریافت کیا اور ہمارے لیے "River Cottage" کھلوا دیا۔ باہر نکلے تو کمال نظارہ تھا۔۔۔ سامنے پہاڑ۔۔۔ پہاڑوں پر برف۔۔۔ ایک طرف چیڑ کے آسمان کو چھوتے درخت اور ان کے عین اوپر چمکتا چاند۔۔۔ دریائے کنہار کی موسیقی اور سائیں سائیں کرتی یخ ہوا۔۔۔ منظر ایسا کہ آنکھوں میں سما نہیں پا رہا تھا کہ آنکھیں اتنی خوب صورتی دیکھنے کی کہاں عادی تھیں۔۔۔ میں اندر استقبالیہ واپس آ گیا۔۔۔ اندر ایک نیوز چینل نے وہی ماحول بنایا ہوا تھا جس سے بچنے کے لیے میں اتنا دور آیا تھا، لیکن یہ میرا پیچھا کرتا کرتے یہاں تک آ پہنچا تھا۔۔۔ اندر اور باہر کے ماحول میں اس قدر فرق تھا کہ مجھے محسوس ہو کہ شاید میں خواب میں ہوں اور باہر وہ کچھ نہیں ہے جو میں دیکھ کے آیا ہوں اور ہاں اندر تو وہی کچھ ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ میں گھبرا کے باہر نکلا اور پھر دنیا سے کٹ گیا۔۔۔ کافی دیر بعد احباب اپنے اپنے سامان سے لدے باہر نکلے، مجھے آواز دی پتا نہیں کتنی آوازوں کے بعد میں اس سحر سے واپس آیا۔۔۔ میں نے بھی اندر جا کر بیگ اُٹھایا اور چپ چاپ ان کے پیچھے چلنے لگا۔۔۔ کچے لیکن کھلے راستے، جن کی دونوں اطراف چونا کیے پتھر ایستادہ تھے۔۔۔ چونا شاید پچھلے برس کیا گیا تھا کہ اس کی اجلاہٹ کم کم تھی یا یہ وجہ تھی کہ آس پاس موجود برف زیادہ گوری اور تر و تازہ تھی۔۔۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد دریا کا شور صاف سنائی دینے لگا تو تارچ تھامے ہمارا گائیڈ ایک ہٹ کے سامنے رک گیا۔۔۔ سر! یہی "River Cottage" ہے۔ میرے اور نثار کے چہرے پر خوشی کا کچھ آثار دیکھے جا سکتے تھے باقی احباب شاید کوس رہے تھے کہ اس سے تو اچھا وہ ”کنہار ویو“ تھا۔۔۔ سر! اس نے کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہا ”اس میں دو کمرے ہیں اور اس کے پیچھے ایک اور کاٹج ہے اس میں بھی دو کمرے ہیں۔“ یہی کافی ہیں ہم آٹھ لوگ ہیں چار چار

ایڈجسٹ ہو جائیں گے۔۔۔

"ہوں! اُس کی بھی کیز سے دے دو ضرورت پڑی تو استعمال کر لیں گے۔"

سر! "ہر کمرے میں دو سنگل بیڈ ہیں۔"

"آپ ایسا کرو دو دو میٹرس نیچے بچھا دو اور ہاں ہر بستر پر کمبل دو دو ہونے چاہئیں۔"

"جی بہت بہتر"

وہ جانے لگا تو میں نے دریافت کیا۔

"یار ادھر پانی کی کیا صورتِ حال ہے۔۔۔ صبح گرم پانی ملے گا؟"

"آدھی رات کے بعد ادھر ڈیوٹی پر موجود بندہ گیزر میں لکڑی جلا دے گا، صبح پانی گرم ملے گا۔"

موبائل کب کے بجھ چکے تھے، ہدایات کے مطابق فوری طور پر چارجنگ پر لگا دیے کہ "پی ٹی ڈی سی" ابھی تک جنریٹر سے روشن تھا۔۔۔ تین دن پہلے ناران کے رستے کھلے تھے اور ابھی تک بجلی کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔۔۔ خیر اس کے تو ہم پہلے بھی عادی ہیں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد موبائل روشن ہوئے تو سگنل ندارد۔۔۔ میرے دونوں نیٹ ورک زیرو تھے ایک اقبال صاحب کا موبائل تھا جو کارگر تھا۔۔۔ اور اس کی حالت پی سی او کے بوتھ جیسی تھی۔۔۔ اپنی باری پر یہ موبائل لے کر ہم بھی باہر نکلے مگر کال کی دو منٹ اور اٹھاون سیکنڈ کی اس کال میں ہماری بتیسی بجنے لگی تو ہم بجتی بتیسی کے ساتھ اندر آ گئے۔۔۔ اقبال صاحب اپنا بستر سیدھا کیے آرام فرما تھے۔۔۔ دوسرے بیڈ پر ہم بھی "لمے پے گئے۔"

تھوڑی دیر بعد خبر آئی کہ کوفتے گل چکے ہیں اور نان مزید ٹھنڈے ہو رہے ہیں لہذا فوراً سے پیشتر ڈائننگ پہنچیں۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھے اور سب سے پہلے باہر آ کر دیگر احباب کی راہ تکنے لگے۔ اب جو کاٹج کے آگے لان میں پڑی کرسیوں پر تشریف فرما ہو کر ارد گرد کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ اس کاٹج کا شمار واقعی "پی ٹی ڈی سی" کے خوب صورت ترین کاٹجز میں ہوتا ہوگا۔ کاٹج کے سامنے ٹیبل اور کرسیوں سے مزین لان۔۔۔ اس کے سامنے درختوں کا ایک جھنڈ۔۔۔ اور آگے میرا یار "کنہار"۔۔۔ کنہار کے پار پہاڑ جن کے اوپر پڑی برف جواب بھی وقفے وقفے سے نیچے کھسکتی ہے۔۔۔ لان سے نیچے دائیں ہاتھ لان جتنا ہی رقبہ "الاؤ" کے لیے مخصوص ہے۔۔۔ یہاں پچھلے سیزن کی الاؤ باقیات ابھی تک بکھری پڑی ہیں۔۔۔ اور اس سے پیچھے اوپن ایئر کار پورچ جہاں ایک ٹرک بھی با آسانی پارک کیا جا سکتا ہے۔۔۔ کاٹج کے پیچھے چیڑ کے بلند و بالا درخت۔۔۔ اور ان میں سب سے بلند درخت کی چوٹی پر رکھا تیرھویں کا چاند۔۔۔ میں آنے والی رات کا منظر

بنا رہا تھا کہ آواز آئی ۔۔۔ چلو نا سرکار، اور سرکار چل پڑے ۔۔۔ لیکن سرکار بار بار مڑ کے دیکھتے تھے کہ کیا خبر کل یہ منظر ملے نہ ملے ۔

کوفتے قیمہ ہو چکے تھے ۔۔۔ کہ آلو گلانے کے چکر میں اس قدر دَم کیے گئے کہ کوفتے، کوفتے نہ رہے ۔۔۔ میں مسکراتا ہوا انور مسعود کی پنجابی نظم ”کوفتہ“ گنگنانے لگا ۔

”بوٹی لئی تے ٹوکے دے نال قیمہ قیمہ کیتی
محنت کر کے اس قیمے دی فر بنائی بوٹی
فر بنایا قیمہ اس دا رکھ کے دنداں تھلے
شاوا ۔۔۔ بلے ۔۔۔ بلے
میں ایہہ سالن کھاواں
نالے ہساں دھیماں دھیماں
بوٹی قیمہ، قیمہ بوٹی ہر بوٹی دا قیمہ
کوفتے ورگا لگا ایہہ مینوں سارا سفر اساڈا
پانی دے وچ پینڈا اکھیا کھا کھا لے غوطے
جیہڑی تھاں توں ٹرے ساں انوراوتھے آن کھلوتے“

۔۔۔ اس میں آسانی بھی تو تھی کہ ”کوفتہ“ پلیٹ مل کر ڈونگے ہی میں قیمے کی شکل میں موجود تھا ۔۔۔ کھانے کا ذائقہ بہت اچھا تھا اور نان تو اس سے بھی اچھے تھے انتہائی خستہ، نرم و گرم ۔۔۔ ہمیں نانوں کے بارے میں غلط ڈرایا گیا ۔۔۔ پیٹ بھر کے مل کر پلیٹ بھر کے کوفتے یا شاید قیمہ یا پھر قیمہ یا کوفتے تھے خیر جو بھی تھے خوب ڈٹ کر کھائے ۔۔۔ اُٹھے اور پھر نیم غنودگی میں چلتے چلتے کالج پہنچے سردی بڑھ چکی تھی ۔ شرٹ کے اوپر سویٹر اور اوورکوٹ تھا ٹوپی پہنی اور ڈبل کمبل میں اپنی وول کی گرم چادر لگائی اور انٹاغفیل ہو گئے ۔

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

انگریزی سے ترجمہ: منیر فیاض

آدھا دن

میں اپنے باپ کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے تھامے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ میرا سارا لباس نیا تھا: کالے جوتے، سکول کی سبز وردی اور سرخ ٹوپی۔ مگر مجھے اس کی خوشی نہیں تھی کیوں کہ آج وہ دن تھا جب مجھے پہلی مرتبہ سکول میں پھینکا جا رہا تھا۔

میری ماں دروازے میں کھڑی ہماری پیش قدمی کو دیکھ رہی تھی اور میں گاہے گاہے مدد کی امید پر مڑ کے اسے دیکھتا تھا۔ ہم ایک ایسی گلی میں چل رہے تھے جس کے دائیں بائیں فصلیں تھیں اور کناروں پر کھجور اور ناشپاتی کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

”سکول کیوں؟“ میں نے پوچھا، ”میں نے کیا کیا ہے؟“۔

”میں تمھیں کسی بات کی سزا نہیں دے رہا“ اس نے ہنستے ہوئے کہا، ”سکول کوئی سزا نہیں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں لڑکوں کو کارآمد افراد بنایا جاتا ہے۔ کیا تم اپنے بھائیوں کی طرح کارآمد نہیں بنا چاہتے؟“۔

میں اس بات سے قائل نہیں ہوا۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ گھر سے اٹھا کر مجھے اس اونچی دیواروں والی بڑی عمارت میں پھینکنے کا واقعی کوئی فائدہ تھا۔

جب ہم دروازے پر پہنچے تو لڑکوں اور لڑکیوں سے بھرا اسکول کا وسیع صحن نظر آنے لگا۔

”خود اندر جاؤ اور ان سے ملو“ میرے باپ نے کہا ”چہرے پر مسکراہٹ سجاؤ اور دوسروں کے لیے اچھی مثال بنو“۔

میں ہچکچایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا مگر اس نے مجھے نرمی کے ساتھ خود سے جدا کیا۔ ”مرد بنو“ اس نے کہا۔ ”آج تم صحیح معنوں میں اپنی زندگی آغاز کرنے جا رہے ہو۔ چھٹی کے وقت تم مجھے یہاں اپنا منتظر پاؤ گے۔“

میں چند قدم آگے بڑھا۔ پھر مجھے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے نظر آنے لگے۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ان میں سے کوئی مجھے جانتا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اجنبی ہوں اور راستہ بھٹک کر

یہاں آ گیا ہوں۔ مگر پھر کچھ لڑکوں نے مجھے متجسس نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا اور ان میں سے ایک نے میرے قریب آ کر پوچھا، ''تمھیں کون لایا؟''

''میرا باپ۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''میرا باپ مر گیا۔'' اس نے بس یہی کہا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ اب کیا کہنا ہے۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ کچھ بچے رونے لگے۔ گھنٹی بجی۔ ایک عورت آئی جس کے پیچھے کچھ مرد تھے۔ مردوں نے ہماری درجہ بندی شروع کر دی۔ ہمیں طویل عمارتوں کے درمیان پھیلے اس وسیع صحن میں پیچیدگی سے مرتب کر دیا گیا۔ ہر منزل پر موجود لکڑی کی چھت والے چھجوں سے ہمیں دیکھا جا رہا تھا۔

''یہ تمھارا نیا گھر ہے۔'' عورت نے کہا۔ ''یہاں تمھاری مائیں اور باپ بھی ہیں۔ ہر وہ چیز یہاں موجود ہے جو تمھارے لیے فائدہ مند اور لطف اندوز ہے۔ اپنے آنسو پونچھو اور بخوشی زندگی کا سامنا کرو۔''

ایسا لگتا تھا کہ میری بدگمانیاں بے بنیاد تھیں۔ اولین لمحات سے ہی میں نے بہت سے دوست بنائے اور بہت سی لڑکیوں کی محبت میں گرفتار رہا۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ سکول اتنے سارے خوش کن تجربات سے بھرپور ہو گا۔

ہم نے بہت سے کھیل کھیلے۔ موسیقی کے کمرے میں ہم نے اپنا پہلا گانا گایا۔ زبان سے بھی ہمارا پہلا تعارف ہوا۔ ہم نے زمین کا گلوب دیکھا جو گھومتا تھا اور اس پر بہت سے ممالک اور براعظم نظر آتے تھے۔ ہم نے گنتی سیکھی اور ہمیں خدا اور کائنات کی تخلیق کی کہانی سنائی گئی۔

ہم نے مزیدار کھانا کھایا، قیلولہ کیا اور بیدار ہو کے اپنی دوستی اور محبت، کھیلنے اور سیکھنے کو جاری رکھا۔

ہمارا راستہ مکمل طور پر لطف آگیں اور آسان نہیں تھا۔ ہمیں صبر کے ساتھ بہت کچھ دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ محض کھیلنے کودنے اور مستیاں کرنے کا معاملہ نہیں تھا۔ یہاں دشمنیوں سے نفرت پیدا ہو سکتی تھی جس سے لڑائی ہونے کا بھی خدشہ تھا۔ اور وہ عورت جہاں کبھی کبھی مسکراتی تھی تو اکثر ڈانٹتی اور چلاتی بھی تھی۔ بلکہ اکثر اوقات وہ جسمانی سزا بھی دیتی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ اب ارادہ بدلنے کا وقت ختم ہو چکا تھا اور گھر کی جنت کو کبھی بھی پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے سامنے اب محنت، کوشش اور ثابت قدمی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو قابل تھے انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کامیابی حاصل کی۔

گھنٹی کی آواز نے دن اور کام کے اختتام کا اعلان کیا۔ بچے بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑے جو دوبارہ کھول دیا گیا تھا۔ میں نے دوستوں اور محبوباؤں کو خدا حافظ کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے اردگرد دیکھا مگر اپنے باپ کا، جس نے مجھ سے وہاں موجود ہونے کا وعدہ کیا تھا، کہیں نشان نہ پایا۔ میں ایک طرف کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ طویل اور رائیگاں انتظار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود گھر چلا جاؤں۔ میں چند قدم چلا اور پھر حیرت زدہ ہو کر رک گیا۔ اوخدایا! وہ گلی کہاں گئی جس کے دونوں طرف باغات تھے؟ وہ کہاں غائب ہو گئی؟ یہ سب گاڑیاں یہاں کب داخل ہوئیں؟ اور یہ سب لوگ کب زمین پر آ گئے؟ یہ کوڑے کے ڈھیر کی پہاڑیاں کناروں پر کیسے آ گئیں؟ وہ فصلیں کہاں گئیں جو دونوں کناروں پر موجود تھیں؟ ہر طرف بلند عمارتیں تھیں، گلیاں بچوں سے بھری ہوئی تھیں اور ہوا میں پریشان کن شور کی آوازیں تھیں۔ ادھر اُدھر مداری کھڑے تھے جو اپنی ٹوکریوں سے سانپ نکالنے اور غائب کرنے کے کرتب دکھا رہے تھے۔ پھر ایک بینڈ تھا جو سرکس کے افتتاح کا اعلان کر رہا تھا جس کے آگے آگے مسخرے اور پہلوان چل رہے تھے۔

اوخدایا! میں ہکا بکا رہ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ صرف آدھے دن میں، صبح اور شام کے درمیان، یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ گھر پہنچ کر مجھے اپنے باپ سے اس کا جواب مل جائے گا۔ مگر میرا گھر تھا کہاں؟ میں چوراہے کی طرف بھاگا کیوں کہ مجھے یاد تھا کہ گھر پہنچنے کے لیے مجھے سڑک پار کرنا ہوگی۔ مگر گاڑیوں کے دھوئیں نے مجھے پار نہیں ہونے دیا۔ انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں میں نے سوچا کہ پتہ نہیں کب میں سڑک پار کرنے کے قابل ہوں گا۔

میں بہت دیر تک وہاں کھڑا رہا اور تب کونے پر واقع دھوبی کی دکان سے کپڑے استری کرنے والا ملازم لڑکا میرے پاس آیا۔

اس نے اپنا بازو میری طرف بڑھایا اور کہا، ''بابا جی، آئیں میں آپ کو سڑک پار کروا دوں۔''

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

انگریزی سے ترجمہ: منیر فیاض

محلے کی کہانیاں

(۱)

مجھے زیریں منزل اور احاطے میں واقع تکیہ کے درمیان کھیلنا اچھا لگتا تھا اور دوسرے بچوں کی طرح میں بھی ہمیشہ تکیے میں واقع بیر کے درخت کی طرف جاتا تھا۔ درخت کے سبز پتے اس نواح میں اگنے والا اکلوتا سبزہ تھے مگر ہمارے ننھے دل تو صرف اس کے سیاہ پھل کے دیوانے تھے۔ یہ تکیہ ایک چھوٹے قلعے کی مانند تھا جس کا رخ باغ کی طرف تھا مگر اس طرف کو کھلنے والا اداس دروازہ، اور کھڑکیاں بھی، ہمیشہ بند رہتیں۔ ساری عمارت اداسی اور تنہائی میں ڈوبی رہتی۔ جب ہمارے ہاتھ اس کی فصیل کو چھوتے تو ایسا لگتا کہ ہم قلعے کے اندر پہنچ گئے ہوں۔ کبھی کبھی لمبی داڑھی، ڈھیلے چوغے اور سجی ہوئی ٹوپی والا کوئی آدمی ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تو ہم دعا دیتے: ''درویش! خدا تمھاری عمر دراز کرے۔'' مگر وہ زمین کو گھورتے ہوئے یا چشمے کے قریب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خاموشی سے وہاں سے گزر جاتا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ اندرونی دروازے سے گم ہو جاتا۔

''ابا! یہ کون لوگ ہیں؟''

''یہ اللہ والے ہیں۔''

پھر وہ تنبیہہ کے انداز میں کہتا،

''جو انھیں تنگ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا''۔

مگر میرا دل تو صرف بیریوں کا دیوانہ تھا۔

ایک دن کھیل کے بعد میں زمین پر آرام کی غرض سے لیٹا اور سو گیا۔ جب میں جاگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں باغ میں تنہا تھا۔ سورج پرانی فصیل کے پیچھے غروب ہو چکا تھا اور بہار کی نرم ہوا غروب آفتاب کی خوشگوار ہوا کے ساتھ مل کر اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ مجھے تاریکی ہونے سے پہلے محلے میں واپس جانے کے لیے زیریں منزل سے ہو کر گزرنا تھا اس لیے میں چھلانگ لگا کر اٹھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں اکیلا نہیں تھا۔ کسی کی نظر نے مجھے محصور کیا ہوا تھا، میرے دل کو اپنی گرم نگاہ کی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ میں نے اپنا سر تکیے کی طرف موڑا تو ایک آدمی کو دیکھا جو درمیان والے بیری کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ کوئی درویش تھا مگر ان

درویشوں سے مختلف تھا جنھیں میں نے پہلے وہاں دیکھا تھا۔ کافی بوڑھا، دراز قامت، چہرہ جیسے نور کی جھیل ہو، سبز چوغہ، لمبی سفید پگڑی، نا قابلِ یقین جمال۔ اسے گھورتے رہنے سے مجھے جیسے نور کا نشہ ہو گیا جس نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ اس جگہ کا مالک ہوگا۔ دوسروں کے برعکس اس کا رویہ دوستانہ تھا۔ میں باڑ کی طرف گیا اور اسے خوشی سے کہا:

”مجھے بیر اچھے لگتے ہیں ---“

مجھے لگا جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو اور اپنی مترنم آواز میں کہہ رہا ہو:

”بلبلی خونِ دلی خورد وگلی حاصل کرد“(۱)

مجھے یوں لگا جیسے اس نے میری طرف کوئی پھل پھینکا ہوا۔ میں ڈھونڈنے کے لیے جھکا مگر مجھے کچھ نہ ملا۔ میں سیدھا ہو کے کھڑا ہوا تو اسے وہاں نہ پایا اور اندرونی دروازہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے باپ کو یہ کہانی بتائی مگر اس نے مجھے شکی نظروں سے دیکھا۔ میں نے زور دے کے اپنی بات کی سچائی کا یقین دلایا تو اس نے کہا:

”یہ نشانیاں صرف بڑے شیخ کی ہیں مگر وہ اپنی خلوت سے باہر نہیں آتا“

پھر میں نے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی قسم اٹھائی تو اس نے کہا:

”ان الفاظ کا کیا مطلب ہے جو تم نے یاد کیے ہیں؟“

”میں نے تکیہ کی محفلوں میں انھوں کئی بار سنا ہے“

میرا باپ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا:

”کسی کو اس کے بارے میں مت بتانا“

پھر اس نے اپنے بازو میری طرف پھیلائے اور صمدیہ(۲) پڑھنا شروع کر دی۔

اس کے بعد میں کئی دن تک بھاگ کے احاطے میں جاتا اور لڑکوں کے کھیل ختم کرنے کے بعد بھی بہت دیر اکیلا وہاں رہتا اور بڑے شیخ کا منتظر رہتا مگر وہ نہ آتے۔ پھر میں اونچی آواز میں کہتا:

”بلبلی خونِ دلی خورد وگلی حاصل کرد“

مگر کوئی جواب نہ آتا۔ میں انتظار کی اذیت میں مبتلا رہتا مگر انھوں میری اور میری بیتابی پر رحم نہ آیا۔

مجھے بعد کی زندگی میں بھی یہ واقعہ یاد آتا اور میں سوچتا کہ واقعی ایسا ہوا تھا یا یہ صرف میرا تصور تھا۔ کیا میں نے واقعی بڑے شیخ کو دیکھا تھا؟ یا میں نے محض اسے دیکھنے کا دعوی کیا تھا تا کہ لوگوں کی توجہ حاصل کر سکوں؟ کیا وہ میرا کوئی ایسا تصور تھا جو حقیقت میں نہیں تھا اور مجھے اس لیے ایسا لگا کہ میں نیند میں تھا؟ یا شیخ کے

---

(۱) بلبل نے اپنے دل کا خون پیا اور پھول حاصل کیا

(۲) سورۃ اخلاص

بارے میں جو باتیں ہمارے گھر میں ہوتی تھیں اس وجہ سے تھا؟ ایسا ہی ہوگا ورنہ شیخ دوبارہ نمودار کیوں نہیں ہوئے؟ ہر کوئی یہ کیوں کہتا تھا کہ وہ اپنی خلوت سے باہر نہیں آتے؟ اس طرح سے میں نے یہ افسانہ تخلیق کیا اور اسے پھیلا دیا۔ مگر شیخ کا وہ فرضی دیدار بھی کہیں میرے اندر جا کے جم چکا ہے اور میری یادوں کو معصومیت سے بھر دیتا ہے، اور مجھے اب بھی پیر بہت اچھے لگتے ہیں۔

---

(۲)

وہ ایک خوبصورت مگر پُراسرار دن تھا۔

میرے باپ نے کافی پیتے ہوئے میری طرف پیار سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ باہر جانے لگا تو اُس نے میرے سر اور شانوں کو شفقت سے تھپتھپایا اور باہر چلا گیا۔ میری ماں نے اپنے روزمرہ کا کام حسبِ معمول غصے میں کیا مگر اس نے میرے پھیلائے ہوئے گند کو نظر انداز کر دیا اور حوصلہ افزائی کے انداز میں مجھے کہا:

"کھیلو میرے بیٹے، کھیلو"

اس نے مجھے بالکل بھی نہیں ڈانٹا۔

پھر میں کچھ دیر کے لیے چھت پر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اپنی تنومند ہمسائی اُمِ ہبڑ وم کو اپنے سامنے موجود پایا۔ میں تیزی سے باورچی خانے کی طرف گیا تا کہ ماں کو بتاؤں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے اسے آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اُمِ ہبڑ وم نے مجھے کہا:

"تمھاری ماں کو ضروری کام سے اچانک کہیں جانا پڑا، اس کی واپسی تک میں تمھارے پاس رہوں گی"

میں نے روہانسے ہو کے اسے کہا:

"مگر میں گلی میں کھیلنا چاہتا ہوں"

"کیا تم اپنی مہمان کو اکیلا چھوڑ کے باہر چلے جاؤ گے؟"

میں صبر کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی؛ اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف چلی گئی۔ وہ کچھ دیر دروازے پر رہی اور جب واپس آئی تو محلے کا حجام حسن اور اس کا ملازم اس کے ساتھ تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ میں نے فوراً انھوں کہا:

"ابو باہر گئے ہیں"

بوڑھے نے کہا:

"ہم تمھارے مہمان ہیں! آج ہم تمھیں ایک منفرد کھیل دکھائیں گے"

وہ بسم اللہ پڑھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اپنے تھیلے سے چمکدار اوزار نکالتے ہوئے کہنے لگا:

’’تم یقیناً جاننا چاہو گے کہ ہم یہ اوزار کیسے استعمال کرتے ہیں‘‘

میں بیتابی سے اس کی طرف بھاگا۔

اس کے ملازم نے اس کے سامنے ایک کرسی لا کے رکھی اور مجھے اس پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے کہا:

’’اب ٹھیک ہے‘‘

اسی لمحے اس کے ہاتھوں نے مجھے اتنی مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ گوند اور قبضوں کے ساتھ مجھ سے چپک گئے ہوں۔ میں غصے سے چلایا:

’’مجھے چھوڑ دو‘‘

میں نے اُم بہروم سے مدد مانگنا چاہی مگر وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا جب تک وہ خوفناک جراحی شروع نہیں ہو گئی۔ میں ایک خطرناک حملے کی زد میں تھا جس سے فرار یا بچاؤ ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنا گوشت کٹنے کا شدید درد محسوس ہوا، شیطانی دھوکہ بازی سے بھرا ہوا درد جو میری پسلیوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر گیا۔ میری چیخیں دیواروں سے ٹکرا کے سارے محلے میں پھیل گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتنی دیر تک رہا مگر میں نیند اور بیداری کے درمیان تیرتا رہا، مختلف رنگ میرے سامنے آتے جاتے رہے۔ خوف اور اداسی میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔

کسی لمحے میری ماں نے حوصلہ افزائی کے لیے معذرت بھرے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں شکایت یا الزام کے لیے منہ کھولتا اس نے میرے ہاتھوں کو تحائف، چاکلیوں اور ٹافیوں سے بھر دیا۔

میں بہت دن ان دردناک یادوں اور مزیدار اور رنگا رنگ ٹافیوں کے خزانوں سے معمور رہا۔ گھر میں بہت سے رشتے دار اور دوست بھی آ گئے۔

میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے اپنے چوغے کو ہاتھ سے پکڑ کے اپنے جسم سے دور رکھتا۔

(۳)

وہ ایام جب مجھے گھر والوں کے ساتھ قبرستان جانا ہوتا تھا میری زندگی کے پُرمسرت دن ہوتے تھے۔

ہم صبح جلدی روانہ ہونے کے لیے شام کو ہی کھجوریں اور میٹھی روٹیاں تیار کر کے رکھ لیتے تھے۔ میں بید اور تلسی اُٹھائے ہوئے اپنے ماں باپ کے درمیان چلتا اور ہماری ملازمہ نیاز کی ٹوکری اُٹھائے ہوئے ہمارے پیچھے آتی۔

لوگوں کا رش اور لکڑی کے چھکڑوں کی قطاریں دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی۔ قبرستان کا دروازہ میرے لیے کسی پرانے دوست جیسا تھا۔ قبر میں مجھے اس کی ساخت، تنہائی، پتھریلے کتبے اور داخلی اسرار کی وجہ سے بہت کشش محسوس ہوتی، اور یہ دیکھ کر بھی کہ میرا باپ کس طرح قبر کا احترام کرتا تھا۔ قبر پر اُگنے والے دھتورے کے پودے

میں بھی میرے لیے کشش تھی ۔ میرا کھلے آسمان کے نیچا چھلنے کو دل کرتا اور تجسس میری رگ رگ میں سما جاتا ۔

لیکن حمام کی وجہ سے یہ سارا تاثر بدل گیا ۔ میری بہن اور اس کا بیٹا ہمارے گھر کچھ دن قیام کے لیے آئے ۔ حمام چار سال یا اس سے کچھ زیادہ کا تھا ۔ مجھے وہ بہت خوش طبع ساتھی لگتا جس کی صحبت نے میری تنہائی کو دور کر دیا ۔ بہت پیارا اور زندہ دل تھا وہ جو میرے ہر جھوٹ اور مکاری پر اعتبار کر لیتا تھا اور مجھ سے اکتاتا بھی نہیں تھا ۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ بستر پر خاموش لیٹا ہوا تھا ۔ میں نے اسے کھیلنے کے لیے بلایا مگر اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا ۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ وہ بیمار تھا ۔ ساری فضا کسی احتیاط زدہ اعصابی بوجھ کے زیر اثر آ گئی ۔ مجھے لگا کہ جیسے گھر میں گھٹی ہوئی بے چینی کی کیفیات تھیں ۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ بے چین ماں اور بے چاری بہن کے ساتھ میرا بہنوئی بھی گھر آ گیا ہے تو میری تشویش بڑھ گئی ۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو مجھے الگ لے جا کر کہا گیا کہ میرے کام کی کوئی بات نہیں اور میں کہیں اور جا کر کھیلوں ۔

مگر مجھے گھر میں کچھ غیر معمولی بات محسوس ہو رہی تھی ---

خطرے کی کوئی بات، کیوں کہ میری ماں رو رہی تھی اور میری بہن چلا رہی تھی ۔ میں نے دور سے دیکھا کہ میرا دوست بستر پر تکیے کی طرح ڈھکا ہوا پڑا تھا جس کے سانس لینے کے لیے کوئی درز یا سوراخ نہیں تھا ۔ بالآخر میں نے 'موت' کا لفظ سنا اور سمجھ گیا کہ یہ ہمیشہ رہنے والی جدائی تھی ۔ میں بھی رونے والوں کے ساتھ رونا شروع ہو گیا اور میرے دل میں اتنا شدید درد اٹھا جتنی شدت کی میری چھوٹی سی عمر متحمل نہیں تھی ۔

قبرستان جانے والے دن میرے لیے خوشگوار نہیں رہے تھے اور اب قبرستان کا تاثر میرے لیے تبدیل ہو گیا تھا ۔ میں اس کے راز جاننا چاہتا تھا مگر اس کی خاموشی نے مجھے مغموم کر دیا ۔ اس بات سے کہ حمام جنت میں پھولوں کے درمیان ہنسی خوشی رہ رہا ہے میری تسلی نہیں ہوتی تھی ۔ دن گزرنے کے ساتھ بھی یہ دکھ مٹا نہیں ۔ ہر طرف اداسی، خوف، محبت کی گمشدگی، درد کی یادیں اور نادیدہ کے رازوں سے بیزاری پھیلی ہوئی تھی ۔

(۴)

ہم سب مدرسے کے احاطے میں کھڑے اپنے امتحان کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے ۔ ہم نے 'مکتب'(ا) کا درجہ مکمل کرنے کے بعد اس کا امتحان دیا تھا اور اب ہم نتیجے کا انتظار کر رہے تھے ۔ سکول کا مہتمم ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے باہر آیا اور ان طلبا کے نام پکارے جو امتحان میں کامیاب ہوئے تھے ۔ پھر اس نے کہا "جنھوں نے اپنے نام اس فہرست میں سُن لیے ہیں وہ یہیں رہیں اور باقی اپنے گھروں کو جائیں ۔"

میرا نام اس فہرست میں نہیں تھا ۔ میں خوشی سے بھر گیا ۔ میں نے سوچا کہ امتحان میں ناکامی کا مطلب یہ

ا۔ مدرسے کا ابتدائی درجہ جس میں طالبعلم زیادہ تر قرآن حفظ کرتے ہیں ۔

ہوا کہ میرا تعلیم اور استاد کی چھڑی سے رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور آئندہ زندگی بہت مزیدار اور پریشانیوں سے آزاد ہو گی۔

میرے باپ نے میرے نتیجے کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے نہایت سکون سے اسے جواب دیا:

‘‘میں فیل ہو کے گھر واپس آ گیا ہوں’’

‘‘شرم آنی چاہیے تمھیں۔۔۔میرا خیال تھا تم کسی قابل ہو گے۔۔۔’’

میں نے پھر بھی خوشدلی سے کہا:

‘‘اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا’’

‘‘کوئی فرق نہیں پڑتا؟’’

‘‘مجھے ‘کتب’ سے اور مدرسے سے اور استاد سے نفرت ہے۔۔۔خدا کا شکر ہے کہ میری ان سب سے جان چھوٹی’’

میرے باپ نے غصے سے کہا:

‘‘کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ اب تم گھر میں ہی رہو گے؟’’

‘‘ہاں، یہی بہتر ہے’’

‘‘گلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے، درست؟’’

میں نے بیتاب ہو کے اس کو دیکھا اور اس نے حتمی انداز میں کہا:

‘‘تم ایک سال مزید کتب کے درجے میں پڑھو گے، اور پاؤں پر چھانٹے لگنے سے تمھاری عقل ٹھکانے آ جائے گی’’

میں احتجاجاً کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے پھر کہا: ‘‘تعلیم کے ایک لمبے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب تک تم ایک معزز انسان نہیں بن جاتے ایک کے بعد ایک درجہ پڑھتے رہو گے۔’’

امتحان میں ناکام ہونے کی خوشی بس چند گھنٹے ہی رہ سکی!

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

انگریزی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

خواب کہانیاں

(1)

میں دریائے نیل کے سرسبز کناروں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ رات نم تھی جیسے دریا کے پانی اور چاند کے درمیان ایک خفیہ مکالمہ جاری ہو، جس پر جگمگاتی کرنیں ہلکورے کھا رہی تھیں۔ میری روح عباسیہ کے نہاں خانوں میں بھٹک رہی تھی، جس پر محبت اور یاسمین کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

میں نے خود کو ایک سوال کے ساتھ مکالمہ کرتے پایا جو وقتاً فوقتاً مجھے پریشان کرتا رہتا تھا کہ وہ ایک بار بھی میرے خواب میں نہ آئی تھی۔ جب سے اس کی وفات ہوئی تھی، کم از کم ایک بار بھی نہیں صرف اس بات کی یقین دہانی کے لیے کہ وہ حقیقت تھی نہ کہ صرف ایک الھڑ جوان خوبصورت سا تخیل ۔۔۔؟ کیا اس کی وہ تصویر جو میرے ذہن پر ثبت ہو چکی تھی، واقعی ایک حقیقی چاہت تھی؟ پھر موسیقی کی جھنکارتی آواز کے ساتھ، جو کہ اندھیری گلی کی جانب سے آ رہی تھی، بھوت نمودار ہوئے۔ اُن کی شکلیں پیلے لیمپ کی روشنی میں واضح ہوئیں۔ جس کی جانب وہ بڑھ رہے تھے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ پینتل کا فیتہ میرے لیے اجنبی نہ تھا، میں کئی بار ان کو اپنی جوانی میں سن چکا تھا جیسا کہ جنازوں کے انتظار میں پیش قدمی کرتے تھے۔ اس دُھن کو میں دل سے پہچانتا تھا۔

لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ میں نے اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ کو دیکھ لیا جو اس موسیقار کے پیچھے چل رہی تھی۔ یہ یقیناً وہی تھی، اپنے دل موہ لینے والے روپ میں۔ اس کے پُرجلال قدم اور اپنے شاندار چہرے کے ساتھ۔ آخرکار اُس نے مجھے اپنے دیدار کا شرف بخشا۔ جنازے کے جلوس کو چھوڑ کر، وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ساری زندگی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ بغیر سانس لیے بالکل سیدھا کھڑے ہوئے، میں اپنی روح کی ساری طاقت کے ساتھ اس کی جانب بڑھا، اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے کہ یہی موقع ہے اپنے دل کی محبوبہ کو چھونے کے لیے اور ایسا موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔

اُس کی جانب ایک قدم اُٹھاتے ہوئے، میں نے اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ تب میں نے کچھ چٹکنے کی آواز سُنی جیسے کچھ ٹوٹا ہو۔ اس کا لباس ایسے محسوس ہوا جیسے یہ کسی خالی خلا کے اوپر لپٹا ہوا اور جیسے ہی مجھے معلوم ہوا۔ تب ہی وہ شاندار سرزمین پر گرا اور لڑھکتا ہوا دریا میں گُم ہو گیا۔ لہروں نے اس کا ایسے خیر مقدم کیا جیسے وہ دریائے نیل کا گلاب ہو لیکن وہ مجھے ایک دائمی غم دے گیا۔

(۲)

میں گلی میں ٹہل رہا تھا۔ میں اچھی طرح اس جگہ سے واقف تھا کیوں کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے کام کیا تھا اور جہاں کھیلا تھا، جہاں میں اپنے دوستوں اور محبوباؤں سے ملا تھا یہ جانتے ہوئے کہ ایک شخص میرے سامنے سے گذر رہا تھا جو نہ زیادہ قریب تھا اور نہ زیادہ دُور تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ، وہ یہ یقین دہانی کرنے کے لیے صرف مُڑا کہ میں اس کے پیچھے تھا۔ شاید ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ میں نے اسے دیکھا تھا لیکن یقیناً ہمارے درمیان کوئی باہمی رابطہ یا رشتہ نہ تھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا، وہ میرے لیے پریشان کن تھا اور اس نے مجھے دعوتِ مبازرت پیش کی تھی۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے افسوس ہوا جیسے وہ کچھ سوچ رہا تھا اور اس نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔ اسی وقت مجھے ایک دوست نے کچھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے آواز دی اور میں اس کی دکان کی جانب بڑھ گیا اور اس کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گیا اور مجھے اس شخص کا خیال جاتا رہا۔

جب بعد از دوپہر ہمارا کام ختم ہوا تو میں نے اپنے دوست کو خدا حافظ کہا۔ جیسے ہی میں نے اپنے گھر کی جانب راہ لی تو مجھے اس شخص کی یاد آئی اور میں نے پیچھے مُڑ کر اُس کو دیکھا۔ وہ پھر میرا تعاقب کر رہا تھا جیسے کہ پہلے میں نے اُس کو اپنے آگے چلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔۔۔ غصے میں آ کر۔۔۔ میں نے رُکنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کر رہا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے اپنے قدموں میں تیزی محسوس کی جیسے کہ میں اُس سے دُور بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں حیران و پریشان تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟

جب مجھے اپنا گھر نظر آنے لگا تو مجھے سکون محسوس ہوا جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا اور میں بغیر پیچھے مُڑے یا دیکھے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کو خالی پاتے ہوئے میں اپنے سونے کے کمرے کی جانب بڑھا اور پھر میں ٹھٹھر کر رہ گیا کہ وہ آدمی دبے پاؤں اندر گھوم رہا تھا۔

(۳)

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے کامیاب آپریشن پہ مجھے مبارک باد دی۔ نشہ ختم ہونے کے بعد جب میں اُٹھا تو مجھے اپنی نئی زندگی پر خوشی اور سکون محسوس ہوا۔ مجھے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

جب ایک نرس آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنا سر میرے قریب لے آئی۔ خاصی دیر سوچ میں ڈوبی ہوئی وہ مجھے گھورتی رہی اور پھر ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی، ''میں کب سے تمھیں اس طرح بے یار و مددگار اور بیمار لیٹے ہوئے دیکھنے کا انتظار کر رہی تھی۔''

میں نے دوبارہ اُس کی جانب دیکھا اور مایوسی سے کہا، ''لیکن یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں نے زندگی میں آپ کو دیکھا ہے۔۔۔ آپ مجھے کوئی تکلیف کیوں دینا چاہیں گی؟''

وہ شائستہ اور پرسکون لہجے میں جواب دینے لگی، ''انتقام کا وقت آگیا ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل گئی جبکہ میں پریشانی، خوف اور بے چینی کے بھنور میں گھر گیا۔ یہ عورت کیسے تصور کر سکتی ہے کہ میں نے کبھی اُسے اذیت پہنچائی ہے، جب کہ میں نے آج سے پہلے اُسے کبھی دیکھا تک نہیں۔ ''ڈاکٹر میرا معائنہ کرنے کے لیے واپس آگیا تھا۔ میں اُس سے چمٹ گیا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر پلیز، میری زندگی خطرے میں ہے۔'' اُس نے سب کچھ سنا جو میں نے اُس سے بولا۔ اُس نے وارڈ میں کام کرنے والی ساری نرسوں کو حکم دیا کہ وہ میرے سامنے ایک قطار میں کھڑی ہو جائیں لیکن وہ جس کی مجھے تلاش تھی، وہ اِن میں نہ تھی۔ جیسے ہی وہ چلی گئیں، ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا، ''آپ یہاں پر ہماری مکمل حفاظت میں ہیں۔''

لیکن اُس دہشت ناک عفریت نے مجھے معاف نہ کیا۔ جو کوئی بھی کمرے میں داخل ہوا، اُس نے عجیب و غریب نظروں سے مجھے گھورا۔ جیسا کہ میں حیران اور شک کی کوئی چیز ہوں جبکہ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے مشکلات سے بھرپور ایک لمبی سڑک تھی۔

(۴)

نیا کمرہ دیکھنے کے بعد میری آنکھیں چُندھیا گئیں تھیں جو کچھ دیر پہلے ہی مجھے ملا تھا۔ میں نے ہر کونے کا معائنہ کیا اور اس نے میری روح کو خوشی سے سرشار کر دیا۔ ''اب تمھیں ایک باقاعدہ ملازمت کی ضرورت

ہے۔'' میں نے خود کو بتایا۔ ''تمھیں بغیر کسی تاخیر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔''

میں مارکیٹ گیا جو ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی، ایک خوف ناک دیوار سے گھری ہوئی تھی۔ میں نے فلیٹ کے لیے اپنی ملکیت کا ارادہ ظاہر کیا اور انھوں نے مجھے اندر بلا لیا۔

وہ جگہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے وہاں کئی عورتوں کو دیکھا جن کے ساتھ ماضی میں، مَیں محبت کر چکا تھا لیکن وہ سب بازوؤں میں بازو لیے اپنے مردوں کے ساتھ چل رہی تھیں۔ میں متعلقہ کھڑکی کی جانب بڑھا اور اپنے کاغذات پیش کیے جو نئے فلیٹ کے لیے میری ملکیت کا پہلا ثبوت تھا۔ آدمی نے اُن کاغذات کو دیکھا اور مجھے بتایا، ''تمھارے پاس فی الوقت کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم مناسب وقت پہ آپ سے رابطہ کریں گے۔''

مجھے اپنی اُمیدیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں کہ مجھے کافی عرصے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بھیڑ کو چیر کر اپنا راستہ بناتا ہوا پلٹا، اُن دل کش اور جگمگاتے چہروں کا تصور کرتے ہوئے جن سے میں نے محبت کی تھی۔ میں نے اکیلے ہی اُس فلیٹ میں آرام کیا جبکہ گلی میں، مَیں نے ایک شخص کو اونچی آواز میں یہ کہتے سُنا، ''یہ ایک آدمی کے لیے حماقت ہے کہ وہ نوکری نہ کرتے ہوئے ایک فلیٹ خریدے۔ اُسے یہ کسی اور خوش نصیب کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، جس کی نوکری پکی ہو چکی ہو۔''

جو کچھ اُس نے کہا، اُس نے مجھے پریشان کر دیا اور جتنی دیر میں نے اس کے بارے میں سوچا مجھے یہ سچ ہی لگا۔

پریشانی اور شک کے اس شدید حملے کے بعد، میں نے اپنی پریشان اور نیند سے عاری آنکھوں کے ساتھ دیکھا کہ کل کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔

(۵)

یہاں پر ائرپورٹ تھا، اس کا ماحول آوازوں اور زبانوں سے گونجتا رہتا۔ عورتیں جو اپنے سارے کاغذات چیک کروانے کے بعد، کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ میں اُن کے قریب آیا اور ہر ایک کو چاندی کے کاغذ میں لپٹا گلاب کا ایک پھول پیش کیا۔

''با حفاظت سفر فرمائیں۔۔۔ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔'' میں نے کہا۔

انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور اُن میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت ہی جفاکش مشن ہے اور اس کی کامیابی کے لیے کئی سال درکار ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب تھا اور درد نے میرے دل کو جکڑ لیا۔ ہم نے خاموش الوداعی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا، جس طرح پرانا زمانہ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔ جہاز نے حرکت کی، میری نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ اُس کا پیکر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب میں استقبالیہ ڈیسک کی جانب واپس آیا، جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ صرف یہ خواہش تھی کہ مجھے پوسٹ آفس تلاش کرنا تھا۔

یہ ایسے ہی تھا جیسے کہ میں صرف یہی مقصد لے کر آیا تھا۔ میں نے ایک سرگوشی سنی، ''کیا آپ ڈاکخانے جانا چاہتے ہیں؟'' میں حیران ہوا اور اس جانب نظریں دوڑائیں تو ایک لڑکی کو پایا جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون تھی؟

''میں رابیہ کی بیٹی ہوں۔ شاید آپ کو رابیہ اور سکینہ یاد ہوں؟''

تذبذب کے عالم میں، مَیں نے جواب دیا، ''یادوں سے مجھے خوف آتا ہے۔''

''اگر آپ ڈاکخانے جانا چاہتے ہیں، ''تو میرے پیچھے آیئے۔'' اُس نے نصیحت کی۔

تاہم، شدید خوف اور پریشانی کے باوجود، میں نے ایسا ہی کیا جیسا اس نے کہا تھا۔

☆☆☆☆

نجم الدّین احمد

سویتلانا الیگزائی وِچ: تعارف

نوبیل انعام برائے ادب ۔۲۰۱۵ء سے بیلارس (رُوس) کی صحافی خاتون سویتلانا الیگزائی وِچ کو سرفراز کیا گیا ہے کہ ”اُس کی لکھتیں ہمارے عہد کی گوناں گوں صوتوں کی حامل یادگار لکھتیں ہے۔“ انعام کا اعلان کرتے ہوئے نوبیل پرائز کمیٹی نے الیگزائی وِچ کی اِن الفاظ میں تحسین کی: ”اُس کا اسلوب غیر معمولی ہے۔ انسانی آوازوں کا احتیاط سے ترتیب دیا ہوا کولاژ، جو ایک پُورے عہد کے ہمارے فہم کو گہرا کرتا ہے۔“ الیگزائی وِچ ادب کا نوبیل پانے والی چودھویں اور رُوس کی پہلی لکھاری خاتون ہیں۔ اِس سے قبل رُوس کے کسی لکھاری یا ادیب کو اس اعزاز سے نہیں نوازا گیا۔ الیگزائی وِچ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ دُنیا بھر کے مرد و زن صحافیوں میں نوبیل انعام پانے والی پہلی صحافی ہے۔

سویتلانا کا پُورا نام سویتلانا الیگزینڈر روفنا الیگزائی وِچ ہے۔ وہ ۳۱ مئی ۱۹۴۸ء کو مغربی یوکرین کے شہر سٹانسلاوِف (جس کا نام ۱۹۶۲ء میں تبدیل کر کے ایوانوفرانک فسک رکھ دیا گیا تھا) میں پیدا ہوئی۔ اُس کے والد کا تعلق بیلارس سے تھا جب کہ ماں یوکرینی تھی۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، بیلارسین سٹیٹ یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے اور منسک کے ادبی جریدے ”نیمان“ (Neman) کی نامہ نگار بننے سے قبل، اُس نے بہت سے مقامی اخباروں میں نمائندے کی حیثیت سے کام کیا۔ اُس نے اپنی صحافتی زندگی کے دوران رُوس کے بہت سے ڈرامائی واقعات کے، مثلاً دُوسری جنگِ عظیم، رُوس افغانستان جنگ اور سانحۂ چرنوبل، عینی شاہدین کے انٹرویو قلم بند کیے۔ لُوکاشینکو انتظامیہ کے سیاسی جبر و استحصال کے بعد سال ۲۰۰۰ء میں اُس نے بیلارس کو داغِ مفارقت دیا۔ اُسے پناہ گزینوں کے عالمی شہروں نے پناہ کی پیشکش کی اور اُس نے ۲۰۱۱ء تک کا عرصہ پیرس، گوتھن برگ اور برلن میں بسر کیا۔ ۲۰۱۱ء میں وہ منسک لوٹ آئی۔

الیگزائی وِچ کی کتب کو سوویت اور سوویت ٹُوٹنے کے بعد کی جذباتی تاریخ گردانا جاتا ہے جسے محتاط طریقے سے انٹرویوز کے کولاژ میں بیان کیا گیا ہے۔ رُوسی مصنف اور نقاد دمتری بائیکوف کے مطابق اُس کی کتابوں میں بہت سے خیالات و نظریات بیلارس کے لکھاری ایلس ایڈموویچ سے مستعار لیے گئے ہیں جس کا خیال تھا کہ بیسویں صدی کی ہولناکیوں کو بیان کرنے کے لیے افسانوی تخلیقات سے زیادہ بہترین راستہ گواہوں کے بیانات کی قلم بندی ہے۔

بیلارس کے شاعر اَلاوزمیرنیا کلیایوف نے ایڈموویچ کو ”الیگزائی وِچ کا جدِ امجد“ قرار دیا ہے۔ اُس نے ایڈموویچ کے دستاویزی ناول ”میں جلے ہوئے گاؤں سے آیا ہوں“ کا حوالہ دیا ہے جس میں نازی فوجی دستوں نے

بیلا رس پر قبضے کے دوران اُلا دزمیر کالیس نِک اور جانکابرل نامی گاؤں کو آگ لگا دی تھی کہ یہ واحد کتاب ہے جس نے ادب کی سمت الیگزائی وِچ کے روّیے پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ الیگزائی وِچ نے خُود بھی ایڈموویچ کے اثر کو تسلیم کرتے ہوئے اضافہ کیا کہ بیلا رس کے ایک اور لکھاری واسِل بائی کاؤ سے بھی وہ متاثر ہے۔

الیگزائی وِچ کی انگریزی میں صرف تین کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں: Zinky Boys: Soviet Voices from Afghanistan War (یہی کتاب Zinky Boys: Soviet Voices from Forgotten War کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے)، War's Unwomanly Face، اور بے حد پذیرائی حاصل کرنے والی Voices from Chernobyl۔ اپنی تخلیقات کے بارے میں الیگزائی وِچ کہتی ہے: ’’اگر ہماری تمام تاریخ پر نظر ڈالی جائے، سوویت اور مابعد سوویت دونوں پر، تو وہ ایک وسیع وعریض اجتماعی قبر اور خُون میں نہائی ہوئی ظالموں اور مظلوموں کا دائمی نوحہ ہے۔ ستم رسیدہ رُوسی سوال کرتے ہیں کہ کیا کیا جائے اور کس پر الزام دھرا جائے: انقلاب پر، جبری مشقت کے کیمپوں پر (gulag: ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران سوویت یونین میں جبری مشقت کے کیمپ بنائے گئے تھے جن میں بے شمار لوگ مر گئے تھے۔ مترجم)، جنگِ عظیم دوم پر، عوام سے خفیہ رکھی جانے والی سوویت افغان جنگ پر، عظیم سلطنت کے انہدام پر، عظیم اشتراکی ملک کے زوال پر، مثالی سرزمین پر اور اب آفاقی مسئلے چرنوبل پر۔ ایسا مسئلہ جو رُوئے ارض کے تمام جان داروں کا مسئلہ ہے۔ یہ ہماری تاریخ ہے۔ یہی میری تخلیقات ہیں اور یہی میرا راستہ ہے۔‘‘

الیگزائی وِچ کی پہلی کتاب ’’War's Unwomanly Face‘‘ ۱۹۸۵ء میں منصۂ شہود پر آئی جو اُن لاکھوں خواتین کا تذکرہ کرتی ہے جنھوں نے ریڈ آرمی میں شمولیت اختیار کر کے شانہ بہ شانہ جنگ لڑی لیکن اُن کا کبھی نام تک نہیں لیا گیا۔ یہ کتاب ناول کی صورت میں ہے جس میں عورتوں کو خُود کلامی کے ذریعے جنگِ عظیم دوم کے اُن پہلوؤں کے بارے میں باتیں کرتے دکھایا گیا ہے جن کا پہلے کبھی تذکرہ نہیں ہوا۔ اِس کے متعدد ایڈیشن بہت سے ناشروں نے شائع کیے اور یہ کتاب لاکھوں کی تعداد فروخت ہوئی۔ الیگزائی وِچ نے ۲۰۰۲ء میں اِس پر دوبارہ کام شروع کیا اور سینسر کی زد میں آنے والے حصوں کو دوبارہ شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن چیزوں کو بھی شامل کیا جنھیں شامل کرنے کا وہ اس وقت حوصلہ نہیں کر سکی تھی۔

دُوسری کتاب ’’The Last Witness: The Book of Childlike Stories‘‘ زمانۂ جنگ کے بارے میں بچوں کی ذاتی یادوں کا احاطہ کرتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کی آنکھوں کے ذریعے جنگ کو دیکھنے کے عمل نے احساسات وجذبات کے نئے دَر وَا کیے ہیں۔ ’’Zinky Boys: Soviet Voices from Forgotten War‘‘ ۱۹۹۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی جو افغانستان کے میدانِ جنگ سے جستی تابوتوں میں آنے والے فوجی جوانوں کے بارے میں ہے۔

۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ’’Enchanted With Death‘‘ سوویت یونین کے انہدام پر خودکشی

کرنے والوں کے متعلق ہے۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو اشتراکیت سے جُدا کر پائے نہ نئے نظامِ حیات کو قبول کر پائے۔ ۱۹۹۳ء کے بعد بیلارس کے سرکاری نشر و اشاعت کے اداروں نے اُس کی کتب چھاپنا بند کر دیں۔ تاہم نجی اداروں نے اُس کی دو اور کتب ”Voices From Chernobyl“ ۱۹۹۹ء میں اور ”Second Hand Time“ ۲۰۱۳ء میں شائع کیں۔ الیگزائی وچ اپنے وطن بیلارس سے زیادہ دُنیا بھر میں معروف ہے۔

ناقدین کا خیال ہے کہ ”وہ ایک صحافی ہے جج نہیں۔ وہ کہانیاں سنا کر فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتی ہے۔“ نوبیل انعام کے اعلان کے بعد الیگزائی وچ نے اُسے ملنے والے نوبیل انعام کے متنازعہ ہونے اور سیاسی عمل دخل کا کرشمہ قرار دینے والی خبروں پر سوالات کے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اس سے فون پر بیلارس کے صدر الیگزینڈر لُوکاشینکو یا حکام میں سے کسی نے فون تک نہیں کیا اور وہ یوں ظاہر کر رہے ہیں جیسے ”وہ عدم وجود ہے“ اور ”بیلارس یورپ کی آخری آمریت ہے۔“ تاہم نوبیل انعام ۲۰۱۵ء متنازعہ ہے کیوں کہ غیر افسانوی نثر نگار کو نوبیل انعام برائے ادب دیے جانے کا یہ پہلا موقع ہے۔

زیرِ نظر چاروں تحریروں کا انتخاب سویتلانا الیگزائی وچ کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ”Voices From Chernobyl“ سے کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں دراصل ۱۹۸۶ء میں چرنوبل کے ایٹمی گھر میں آگ لگنے اور ایٹمی دھماکوں کے نتیجے میں تابکاری سے متاثرین کے ۱۹۹۶ء میں لیے گئے انٹرویو ہیں جنھیں سویتلانا خود کو پس منظر میں رکھتے ہوئے تاہم کہیں کہیں اپنی جھلک بھی دکھاتے ہوئے، افسانوی انداز میں ضبطِ تحریر میں لائی ہے۔ یہ ستم رسیدگی کی ایسی داستانیں ہیں جو درحقیقت انسان کی سائنس کی ترقی کے نام پر اپنے ہی ہاتھوں زمین پر زندگی کی تباہی و بربادی اور قلع قمع کی داستانیں ہیں۔

☆☆☆☆

سویتلانا الیگزانی وِچ

ترجمہ: نجم الدّین احمد

تنہا انسانی پُکار

مجھے نہیں پتا کہ میں کس کے بارے میں بات کروں -- موت کے متعلق یا محبت کے بارے میں؟ یا یہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں؟ میں دونوں میں سے کس کے بارے میں بات کروں؟

ہمارا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ ہم اب تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے تھے، چاہے ہم صرف دُکان تک ہی جا رہے ہوتے۔ میں اُس سے کہتی: ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' لیکن اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کتنی۔ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا......

ہم فائر سٹیشن کی، جہاں وہ کام کرتا تھا، اقامت گاہ میں دُوسری منزل پر رہتے تھے۔ وہاں تین اَور نوجوان جوڑے بھی رہ رہے تھے۔ ہم سب ایک ہی باورچی خانہ استعمال کرتے تھے۔ پہلی منزل پر وہ ٹرک کھڑے کرتے تھے۔ آگ بجھانے والے دو سُرخ رنگ کے ٹرک۔ یہی اُس کا کام تھا۔ مجھے ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے -- وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟

ایک رات میں نے شور سُنا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ ''کھڑکی بند کر لو اور جا کر دوبارہ سو جاؤ۔ ایٹمی گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

میں نے خود دھماکہ نہیں دیکھا تھا۔ صرف شعلے اُٹھتے دیکھے تھے۔ ہر شے روشن اور چمک دار ہو رہی تھی -- سارا آسمان بھی۔ فلک بوس شعلے اور دھواں -- حدت نا قابلِ برداشت تھی۔ اور وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔

جلتی ہوئی رال سے دھواں اُٹھ رہا تھا جس نے چھت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے بعد میں بتایا کہ یُوں لگ رہا تھا جیسے دھواں کولتار پر چل رہا ہو۔ اُنھوں نے آگ بجھانے کی بہت کوشش کی۔ اُنھوں نے جلتی ہوئی رال پر اپنے پیر مارے...... وہ اپنے کرنچ کے پہیوں والے جوتے پہنے ہوئے نہیں تھے۔ وہ جس حالت میں تھے اُسی میں چلے گئے تھے، اپنی بے آستینوں قمیصوں ہی میں۔ کسی نے اُنھیں بتایا ہی نہیں تھا۔ اُنھیں تو محض آگ بجھانے کے لیے بُلایا گیا تھا، بس۔

چار بج گئے۔ پانچ اور پھر چھے۔ چھے بجے ہمیں اُس کے والدین کے ہاں جانا تھا۔ آلو بیجنے کے لیے۔ پرِپ یات سے سپیری زیبے تک چالیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا، جہاں اُس کے والدین رہتے تھے۔ کھیتی باڑی -- اُسے بہت پسند تھی۔ اُس کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کیوں نہیں چاہتے تھے کہ وہ شہر جاتے۔ یہاں تک کہ

اُنھوں نے اُس کے لیے ایک نیا گھر بھی تعمیر کیا تھا۔ اُس کا نام فوج میں درج کر لیا گیا تھا۔ اُس نے ماسکو کی فائر بریگیڈ میں خدمات سرانجام دی تھیں اور جب لوٹا تو بھی وہ فائر مین ہی بننا چاہتا تھا۔ [خاموشی۔]

بعض اوقات مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اُس کی پُکار سُنائی دے رہی ہو۔ جیتی جاگتی پُکار۔ حد یہ کہ اُس کی تصویر بھی مجھ پر اُتنا اثر نہیں کرتی جتنی وہ پکار۔ لیکن وہ مجھے کبھی نہیں پکارتا...... میرے خوابوں تک میں نہیں۔ بس میں ہی اُسے پُکارتی پھرتی ہوں۔

سات بجے۔ مجھے سات بجے بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ میں اُدھر دوڑی لیکن پولیس نے پہلے ہی سے ہسپتال کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ کسی کو اندر جانے نہیں دے رہے تھے۔ صرف ایمبولینسیں جا سکتی تھی۔ پولیس والے چلّا رہے تھے: ایمبولینسوں پر تابکاری کے اثرات ہیں، دُور رہو! وہاں میں تنہا نہیں تھی۔ وہ تمام بیویاں پہنچ چکی تھیں جن کے شوہر اُس رات ایٹمی گھر میں تھے۔ میں ایک دوست کو تلاش کرنے لگی جو اُس ہسپتال میں ڈاکٹر تھی۔ جب وہ ایک ایمبولینس سے باہر نکلی تو میں نے اُس کا سفید کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ ’’مجھے اندر جانے دو!‘‘ ’’میں یہ نہیں کر سکتی۔ اُس کی حالت بُری ہے۔ اُن سب ہی کی حالت خراب ہے۔‘‘ میں مصر رہی۔ ’’بس اُسے دیکھ لینے دو!‘‘ ’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ بولی۔ ’’میرے ساتھ آؤ۔ صرف پندرہ یا بیس منٹ کے لیے۔‘‘ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ سارے کا سارا سُوجا اور پھُولا ہوا تھا۔ صرف اُس کی آنکھیں دِکھائی دے رہی تھیں۔

’’اُسے دُودھ کی ضرورت ہے۔ بہت سارے دُودھ کی۔‘‘ میری دوست نے کہا۔ ’’اُن میں سے ہر ایک کو کم از کم تین لیٹر دُودھ پلانا چاہیے۔‘‘ ’’لیکن وہ تو دُودھ پسند نہیں کرتا۔‘‘ ’’اب وہ پیے گا۔‘‘ اُس ہسپتال کے بہت سے ڈاکٹر اور نرسیں، اور خاص طور پر وہاں کی چھوٹی نرسیں، بیمار پڑ جائیں گی اور اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ لیکن اُس وقت ہم یہ بات نہیں جانتے تھے۔

صبح دس بجے کیمرا مین شِشنے نوک چل بسا۔ وہ پہلے دِن کی پہلی موت تھی۔ ہمیں پتا چلا دُوسری موت ملبے تلے رہ جانے والے -- والیرا خودیے چک -- کی تھی۔ وہ اُس تک کبھی نہیں پہنچ پائے۔ اُنھوں نے اُسے کنکریٹ تلے ہی دفنا دیا تھا۔ تب ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف وہی پہلی اموات ہیں۔

میں نے پُوچھا۔ ’’واسیا، میں کیا کروں؟‘‘ ’’یہاں سے نکل جاؤ! جاؤ! تمھارے پاس ہمارا بچہ ہے۔‘‘ لیکن میں اُسے کیسے چھوڑ دیتی؟ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا: ’’جاؤ! چلی جاؤ! بچے کو بچاؤ۔‘‘ ’’پہلے میں تمھارے لیے کچھ دُودھ لاتی ہوں، پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔‘‘ میری دوست تانیا کبے نوک دوڑتی ہوئی اندر آتی ہے -- اُس کا خاوند بھی اُسی کمرے میں ہے۔ اُس کا باپ بھی ہم راہ ہے جس کے پاس اپنی کار ہے۔ ہم کار میں سوار ہو کر دُودھ لینے نزدیکی گاؤں چلے جاتے ہیں جو قصبے سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم تین تین لیٹر والی بوتلوں کے چھے خوشے خریدتے ہیں تاکہ سب کے لیے کافی ہو۔ لیکن وہ دُودھ سے اُلٹیاں کرتے

لگتے ہیں۔ وہ پاس سے گُزرتے رہے، اُنھوں نے ٹی وی چلا لیے۔ ڈاکٹر یہ بتانے میں لگے رہے کہ وہ زہریلی گیس سے متاثر ہوئے ہیں۔ تابکاری کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔ اور آنا فانا قصبہ فوجی گاڑیوں سے بھر جاتا ہے۔ اُنھوں نے تمام راستے بند کر دیے۔ ٹرالیاں اور ٹرینیں تک چلنا بند ہو گئیں۔ وہ سڑکوں کو کسی سفید پاؤڈر سے دھو رہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ اگلے روز کے لیے مزید تازہ دُودھ خریدنے گاؤں کیسے جاؤں گی۔ کسی نے بھی تابکاری کے بارے میں بات تک نہیں کی۔ صرف فوجی جراحی والے نقاب اُڑسے ہوئے تھے۔ قصبے کے لوگ دُکانوں سے روٹیاں لے جا رہے تھے، کھلی ہوئی بوریوں میں جن میں صرف روٹیاں ٹھونسی ہوئی تھیں۔ لوگ طشتریوں میں کپ کیک کھا رہے تھے۔

اُس شام میں ہسپتال میں داخل نہیں ہو پائی۔ وہاں لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں اُس کی کھڑکی کے نیچے کھڑی تھی کہ وہ آیا اور اُس نے پکار کر مجھ سے کچھ کہا۔ نہایت مایوس کُن بات تھی۔ ہجوم میں سے کسی نے اُس کی بات سُن لی تھی -- اُسی رات اُنھیں ماسکو لے جایا جا رہا تھا۔ ہمیں ہمارے شوہروں کے ساتھ جانے دیا جائے! تمھیں اِس کی اجازت نہیں! ہم نے گھونسے چلائے اور نوچا۔ فوجیوں نے -- فوجی وہاں پہلے ہی سے موجود تھے -- اُنھوں نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ پھر ڈاکٹر باہر آیا اور بولا: ٹھیک ہے۔ وہ ماسکو جہاز کے ذریعے جا رہے تھے لیکن ہمیں اُن کے کپڑے لانے تھے۔ وہ جو کپڑے نیوکلیائی مرکز میں پہن کر گئے تھے وہ جل چکے تھے۔ بسیں پہلے ہی چلنا بند تھیں اور ہم شہر میں دوڑیں لگا رہی تھیں۔ ہم اُن کے بیگ لیے بھاگتی ہوئی واپس آئیں تو جہاز جا چکا تھا۔ اُنھوں نے ہمارے ساتھ چھل کھیلا تھا تا کہ ہم وہ چیخنا چلّانا اور رونا دھونا نہ کریں۔

رات کا وقت ہے۔ سڑک کے ایک جانب بسیں ہیں سینکڑوں بسیں۔ وہ قصبے کو خالی کرنے کے لیے تیار کھڑی ہیں اور دُوسری جانب آگ بجھانے والے سینکڑوں ٹرک۔ وہ ہر شہر سے آئے ہیں۔ اور پُوری سڑک سفید جھاگ سے بھری پڑی ہے۔ ہم بس بددُعائیں دیتے اور روتے پیٹتے جھاگ پر چل رہے ہیں۔ ریڈیو پر وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ تین سے پانچ روز تک کے لیے شہر خالی کروا سکتے ہیں، اپنے گرم کپڑے ساتھ لے لیں، تمھیں ایک جنگل میں رہنا پڑے گا، تمبوؤں میں۔ اِس پر بھی لوگ خوش ہیں -- کیمپوں والا ایک تفریحی دورہ! ہم مے ڈے اِس طرح منائیں گے۔ روزمرّہ کی زندگی سے ایک وقفہ۔ لوگ تکّے کباب تیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے گٹار ہم راہ لے لیتے ہیں، اپنے ریڈیو بھی۔ صرف وہ عورتیں رو پیٹ رہی تھیں جن کے خاوند ایٹمی گھر میں تھے۔

مجھے اپنے والدین کے گاؤں سے باہر کوئی سفر یاد نہیں۔ یُوں لگتا ہے گویا میں نے نیند سے اُٹھ کر اپنی ماں کو دیکھا۔ ''امّی، واسیا ماسکو میں ہے۔ وہ اُسے خاص جہاز پر لے کر گئے ہیں!'' لیکن ہم نے باغ میں پودے لگانے کا کام ختم کیا۔ [ایک ہفتے بعد گاؤں خالی کروا لیا گیا تھا۔] کون جانتا تھا؟ اُس وقت کسے پتا تھا؟

دِن ڈھلے میں قے کرنے لگی۔ میں چھے ماہ کی حاملہ تھی۔ میں خوف زدہ ہو گئی۔ اُس رات میں نے اُسے خواب میں خُود کو پکارتے سُنا۔ “لیوسیا! لیوسینکا!” لیکن مرنے کے بعد اُس نے مجھے کبھی خوابوں میں بھی نہیں پکارا۔ ایک بار بھی نہیں۔ [وہ رونے لگتی ہے۔]

اگلی صبح میں یہ سوچتے ہوئے اُٹھی کہ مجھے ماسکو جانا چاہیے۔ تنہا مجھے۔ میری ماں رونے لگی۔ “تم کہاں جا رہی ہو، اِس حالت میں؟” پس میں نے اپنے والد کو ہم راہ لیا۔ وہ بینک گیا اور اُن کے پاس جتنی رقم تھی نکلوا لایا۔

مجھے سفر یاد نہیں۔ بس سفر میری یاد سے محو ہے۔ ماسکو میں ہمیں جو پہلا پولیس افسر نظر آیا ہم نے اُس سے پُوچھا کہ چرنوبل کے فائرمینوں کو کہاں رکھا گیا ہے اور اُس نے ہمیں بتا دیا۔ ہم بھی حیرت زدہ رہ گئے، ہر شخص خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیوں کہ یہ انتہائی خفیہ معاملہ تھا۔ “ہسپتال نمبر ۶۔ شچوکن سکایا سٹاپ پر۔”

وہ ایک خاص ہسپتال تھا، تابکاری کے علاج کا، جس میں بغیر پاس کے داخل ہونے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑی عورت کے حوالے کچھ پیسے کیے تو وہ بولی۔ “آگے چلی جاؤ۔” پھر میں نے کسی سے پُوچھا تو کسی کی منت سماجت کی۔ بالآخر ہیڈ ریڈیالوجسٹ، انجلینا واسلیفنا گسکووا کے دفتر میں جا بیٹھی۔ لیکن تب تک مجھے اُس کے نام کا پتا نہیں تھا، مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ مجھے اُس سے ملنا ہے۔ ٹھیک اُسی لمحے وہ دریافت کرتی ہے: “کیا تمھارے بچے ہیں؟

“میں اُسے کیا بتاؤں؟ میں پہلے سمجھ گئی تھی کہ مجھے یہ بات چھپانا ہو گی کہ میں حمل سے ہوں۔ وہ مجھے اُس سے ملنے نہیں دیں گے! یہ اچھی بات ہے کہ میں دبلی پتلی ہوں کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔

“ہاں۔” میں جواب دیتی ہوں۔

“کتنے؟”

میں سوچ رہی ہوں۔ مجھے اُسے بتانا چاہیے: دو۔ اگر صرف ایک بتایا تو وہ مجھے اندر نہیں جانے دے گی۔

“ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔”

“گویا تمھیں مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ سنو: اُس کا مرکزی اعصابی نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے، اُس کا ذہن مکمل طور پر بے کار ہو چکا ہے۔”

“ٹھیک ہے، میں سوچ رہی ہوں تو وہ تھوڑا سا بے حس ہو گا۔”

“اور سنو: اگر تم روئی پیٹیں تو میں تمھیں فوراً باہر پھنکوا دوں گی۔ بوس و کنار بالکل نہیں۔ اُس کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ تمھارے پاس آدھ گھنٹا ہے۔”

لیکن میرا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر میں گئی تو یہی کچھ اُس کے ساتھ ہو گا۔ میں اپنے آپ سے عہد کرتی ہوں۔ میں اندر داخل ہوتی ہوں۔ وہ بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں اور قہقہے

لگا رہے ہیں۔

''واسیا!'' وہ پکار اُٹھتے ہیں۔

وہ مُڑتا ہے۔

''اوہ، خُوب، اب کھیل ختم۔ اُس نے مجھے یہاں بھی ڈھونڈ لیا!''

وہ نہایت خُوش گوار طبیعت میں لگ رہا ہے۔ اُس نے ۴۸ نمبر کا پاجاما پہن رکھا ہے جب کہ اُس کا حجم ۵۲ نمبر کا تھا۔ آستینیں بہت چھوٹی ہیں۔ پینٹ بھی نہایت چھوٹی ہے۔ لیکن اب اُس کا چہرہ سُوجا ہوا نہیں ہے۔ اُنھیں کسی قسم کی سیال شے دی جاتی ہے۔

میں کہتی ہوں۔ ''تم کہاں تک بھاگو گے؟''

وہ مجھے گلے لگانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر لگانے نہیں دیتی۔ ''بیٹھو، بیٹھو۔'' وہ کہتی ہے۔ ''یہاں معانقہ نہیں ہوگا۔''

ہم اِس بات کو کسی نہ کسی طور مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔ اور پھر دُوسرے کمروں سے ہر شخص آنے لگتا ہے، ہر پ یات کا ہر شخص۔ جہاز پر اٹھائیس لوگ سوار ہوئے تھے۔ کیا ہو رہا ہے؟ قصبے کے معاملات کیسے جا رہے ہیں؟ میں اُنھیں بتاتی ہوں کہ اُنھوں نے ہر کسی کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا ہے، پُورا شہر تین سے پانچ روز کے لیے مکمل طور پر خالی کروایا جا رہا ہے۔ اُن میں سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور اُن میں سے ایک عورت، وہاں دو عورتیں تھیں جو حادثے کے روز اپنے کام پر تھیں، رونے لگتی ہے۔

''اوہ خدایا! میرے بچے وہاں ہیں۔ اُن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

میں اُس کے ساتھ تنہائی چاہتی ہوں، چاہے ایک منٹ ہی کی ملے۔ وہ لوگ یہ بات محسوس کر لیتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی حیلہ سازی کرتا ہے اور وہ تمام باہر چلے جاتے ہیں۔ پھر میں اُسے جپھی ڈال لیتی ہوں اور چُومتی ہوں۔ وہ پرے ہٹ جاتا ہے۔

''میرے نزدیک مت بیٹھو۔ کُرسی لے لو۔''

''یہ احمقانہ بات ہے۔'' میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتی ہوں۔ ''کیا تم نے دھماکہ دیکھا تھا؟ تم نے دیکھا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ تم وہاں پہنچنے والوں میں سب سے پہلے شخص تھے۔''

''وہ غالباً تخریب کاری تھی۔ کسی نے اُس کا منصوبہ بنایا تھا۔ سب کا یہی خیال ہے۔''

اُس وقت لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ یہی سوچ رہے تھے۔

اگلے روز وہ سب اپنے اپنے کمروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُن پر ہال وے میں جانے اور ایک دُوسرے سے بات چیت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ اپنے ٹھولوں سے دیواریں بجاتے تھے۔ ڈیش نقطہ، ڈیش نقطہ۔ ڈاکٹروں نے وضاحت کی کہ تابکار شعاعوں پر ہر شخص کا جسم مختلف ردِعمل دیتا ہے اور جو چیز ایک شخص کر سکتا ہے

وہی دُوسرا نہیں کر سکتا۔ حد یہ کہ اُنھوں نے اُنھیں جہاں رکھا تھا وہ اُس جگہ کی دیواروں کی تابکار شعاعوں کو بھی ماپ سکتے تھے۔ دائیں، بائیں اور قدموں تلے فرش کی بھی۔ اُنھوں نے نچلی اور بالائی منزلوں کے تمام مریضوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ اُس جگہ کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

تین روز تک میں ماسکو میں اپنی دوستوں کے ہم راہ رہی۔ وہ کہتی رہیں: برتن لے لو، رکابی لے لو، تمھیں جس چیز کی ضرورت ہے لے لو۔ میں نے چھے لوگوں کے لیے ٹرکی کی یخنی بنائی۔ ہمارے چھے فائرمینوں کے لیے، اُسی شفٹ کے چھوؤں کے لیے۔ اُس رات وہ سارے ڈیوٹی پر تھے: باشک، کِبے نوک، تِتے نوک، پراوِک، تِس پُتورا۔ میں دُکان پر گئی اور اُن کے لیے ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور صابن خریدے۔ ہسپتال میں اُن کے پاس اِس میں سے ایک بھی چیز نہیں تھی۔ میں نے اُن کے چھوٹے تولیے بھی خریدے۔ اب ماضی کی طرف دیکھتی ہوں تو میں اپنی دوستوں پر حیران رہ جاتی ہوں: وہ خوف زدہ تھیں۔ بے شک، کیوں نہ ہوتیں۔ ہر طرف افواہیں گرم تھیں لیکن وہ پھر بھی یہی کہتی رہیں: تمھیں جس چیز کی ضرورت ہے، لے لو! یہ لے لو! وہ کیسا ہے؟ وہ سب کیسے ہیں؟ کیا وہ بچ جائیں گے؟ زندہ۔ [وہ خاموش ہو جاتی ہے۔] اُس وقت میں بہت سے اچھے لوگوں سے ملی، مجھے وہ سب تو یاد نہیں البتہ ایک بوڑھی نگران عورت یاد ہے جس نے مجھے بتایا: ''ایسی بیماریاں بھی ہیں جو لاعلاج ہیں۔ تمھیں صرف بیٹھنا اور محض اُنھیں دیکھنا ہوتا ہے۔''

صبح سویرے میں مارکیٹ جاتی ہوں، پھر اپنی دوستوں کے گھر میں یخنی تیار کرتی ہوں۔ مجھے ہر چیز کوٹنا اور پیسنا ہوتی ہے۔ کسی نے کہا۔ ''مجھے سیب کا جُوس لا دو۔'' تو جُوس کے چھے ڈبے لے کر جاتی ہوں، ہمیشہ چھوؤں کے لیے! ہسپتال کو دوڑتی ہوں اور پھر شام تک وہیں رہتی ہوں۔ شام کو میں پھر شہر لوٹ جاتی ہوں۔ میں کتنا عرصہ یہ مسلسل بھاگ دوڑ کر سکتی تھی؟ تین روز بعد وہ مجھے بتاتے ہیں کہ میں طبّی کارکنوں کی اقامت گاہ میں قیام کر سکتی ہوں جو ہسپتال کی زمینی منزل پر ہے۔ میرے خدا، یہ کس قدر حیران کُن واقعہ تھا!

''لیکن وہاں کوئی باورچی خانہ نہیں ہے۔ میں پکاؤں کیسے؟''

''تمھیں پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خوراک ہضم نہیں کر سکتے۔''

وہ بدلنے لگا۔ میں روزانہ ایک نئے آدمی سے ملی۔ چھالے نمودار ہونے لگے۔ اُس کے مُنھ میں، زبان پر، چہرے پر---شروع میں وہ چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے اور پھر بڑے ہو جاتے۔ وہ تہہ در تہہ نمودار ہوتے---سفید جھلی کی مانند---اُس کے بدن کا رنگ نیلا...... سُرخ...... خاکستری سُرمئی۔ اور یہ سب میرا انتہائی ذاتی ہے! اِسے بیان کرنا بھی ممکن نہیں! اِسے لکھنا بھی ممکن نہیں! حد یہ کہ اِسے بُھلانا بھی ممکن نہیں ہے! میں اِسی لیے محفوظ رہی کہ یہ سب نہایت سُرعت سے وقوع پذیر ہوا: سوچنے تک کے لیے ایک لمحہ نہیں تھا۔ رونے تک کے لیے بھی ایک لمحہ تک نہیں تھا۔

مجھے اُس سے محبت تھی! مجھے نہیں معلوم کتنی! حال ہی میں تو ہماری شادی ہوئی تھی۔ ہم سڑک پر چل رہے

ہوتے --- وہ میرا ہاتھ تھامتا اور مجھے گھمانے لگ جاتا۔ مجھے چُومنے لگتا، مجھے چُومنے لگتا۔ پاس سے گزرتے لوگ مُسکرانے لگتے۔

وہ تابکار شعاعوں سے بدن میں زہر پھیلنے والے نازک حالت کے مریضوں کا ہسپتال تھا۔ چودہ دِن۔ ہر چودہ دِن بعد ایک شخص مرجاتا ہے۔

پہلے ہی روز، اُنھوں نے اقامت گاہ میں ڈوسی میٹر[۱] سے میری جانچ پڑتال کی۔ میرے کپڑے، بیگ، پرس، جُوتے --- ہر شے "گرم" تھی۔ اور اُنھوں نے فوراً وہ چیزیں مجھ سے وہیں لے لیں۔ حتّٰی کہ میرے زیر جامے بھی۔ اُنھوں نے صرف میرے پیسے چھوڑے۔ بدلے میں اُنھوں نے مجھے ہسپتال کا لباس دیا --- ۵۶ کے ناپ کا --- اور تقریباً ۴۳ کے ناپ کی چپلیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ شاید وہ کپڑے لوٹا دیں اور شاید نہ لوٹائیں کیوں کہ وہ وہاں اُنھیں اُن کے لیے "مسئلہ" ممکن نہیں تھا۔ پس جب میں اُس سے ملنے گئی تو ایسے حلیے میں تھی۔ میں نے اُسے ڈرا دیا تھا۔ "محترمہ، تمھارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" لیکن میں اب بھی اُسے یخنی بنا کر دے سکتی تھی۔ میں نے شیشے کے ایک مرتبان میں پانی اُبالا اور اُس میں مرغی کے تِکّے ڈالے --- چھوٹے چھوٹے تِکّے۔ پھر کسی عورت نے مجھے اپنا برتن دیا، شاید وہ صفائی کرنے والی عورت تھی یا خاتون سنتری۔ کسی نے مجھے اجمود[۲] کاٹنے کے لیے کٹائی والا تختہ دیا۔ میں اپنے ہسپتال والے لباس میں مارکیٹ نہیں جا سکتی تھی، لوگ مجھے سبزی لا دیتے۔ لیکن یہ فضول تھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں پی سکتا تھا۔ وہ کچا انڈہ تک نہیں نگل سکتا تھا۔ لیکن میں کوئی مزیدار شے بنانا چاہتی تھی! گویا زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہو۔ میں ڈاک خانے کو دوڑی۔ "لڑکیو۔" میں نے اُنھیں بتایا۔ "میں فوراً اپنے والدین کو ایوانوفرانکوفسک بلانا چاہتی ہوں! میرا خاوند مر رہا ہے!" وہ یکایک چلا اُٹھیں کہ میں کہاں سے آئی ہوں اور میرا خاوند کون ہے اور اُنھوں نے میرا رابطہ کروا دیا۔ اُسی روز میرے والد، بہن اور بھائی پرواز سے ماسکو آ گئے۔ وہ میری چیزیں لائے تھے۔ اور پیسے بھی۔ وہ مئی کی نو تاریخ تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتا تھا: "تمھیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ ماسکو کتنا خوب صورت ہے! خاص طور پر V-Day کو، جب آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ میں تمھیں وہ دِکھانا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے پاس کمرے میں بیٹھی ہوں۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ "دِن ہے یا رات؟"

"رات کے نو بجے ہیں۔"

"کھڑکی کھول دو! وہ آتش بازی چھوڑنے والے ہیں۔"

میں نے کھڑکی کھول دی۔ ہم آٹھویں منزل پر ہیں اور سارا شہر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے! آتش بازی کا ایک گُل دستہ فضا میں چُھوٹا۔

"وہ دیکھو!" میں نے کہا۔

"میں نے تمھیں کہا تھا نا کہ میں تمھیں ماسکو دِکھاؤں گا۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ عام تعطیل کے دِنوں

میں تمھیں سدا پھول دیا کروں گا......"

میں اُس کی جانب دیکھتی ہوں تو وہ اپنے تکیے کے نیچے سے تین گُل ناریاں نکال رہا ہوتا ہے۔ اُس نے نرس کو پیسے دیے تھے جنھیں وہ لے کر آئی تھی۔

میں دوڑ کر اُس کی طرف جاتی ہوں اور اُسے چُومنے لگتی ہوں۔

"میرے عشق! میرے واحد عشق!"

وہ دُکھنے لگتا ہے۔ "ڈاکٹروں نے تمھیں کیا بتایا ہے؟ مجھ سے لپٹنا نہیں اور مجھے چُومنا نہیں!"

وہ مجھے اُس سے لپٹنے نہیں دیتے لیکن میں...... میں نے اُسے اُٹھا کر اُس کی ٹیک لگوائی۔ اُس کا بستر ٹھیک کیا۔ میں نے حرارت پیما لگایا۔ میں نے گند والی قاب اُٹھائی اور واپس لا کر رکھی۔ میں ساری رات اُس کے ساتھ رہی۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ جب میرا سر چکرایا تو میں کمرے کی بجائے ہال میں تھی۔ میں نے کھڑکی کی دہلیز تھام لی۔ ایک ڈاکٹر وہاں سے گزر رہا تھا، اُس نے مجھے بازو سے پکڑا۔ اور پھر اچانک بولا۔ "تم حمل سے ہو؟"

"نہیں نہیں!" میں خوف زدہ ہو گئی کہ کہیں کوئی سُن ہی نہ لے۔

"جھوٹ مت بولو۔" اُس نے آہ بھری۔

اگلے روز مجھے ڈاکٹروں کی سربراہ کے دفتر میں طلب کیا جاتا ہے۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ دریافت کرتی ہے۔

"کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر میں تمھیں بتا دیتی تو تم مجھے گھر بھیج دیتیں۔ وہ مبنی بر مصلحت جھوٹ تھا!"

"تم نے کیا، کیا ہے؟"

"لیکن میں اُس کے ساتھ تھی......"

میں زندگی بھر انجلینا واسلیفنا گُسکووا کی ممنون رہوں گی۔ زندگی بھر! دُوسرے لوگوں کی بیویاں بھی آتی تھیں لیکن اُنھیں داخل ہونے ہی کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اُن کی مائیں میرے ہم راہ تھیں۔ والودیا پراوِک کی ماں خدا سے مسلسل دُعا مانگتی رہتی۔ "اِس کی بجائے مجھے اُٹھا لے۔" ایک امریکی پروفیسر ڈاکٹر گیل نے --- جس نے ہڈیوں کے گُودے کی جراحی کی تھی --- مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ اُمید کی نہایت ننھی سی کرن ہے، وہ بولا، لیکن زیادہ نہیں، البتہ ذرا سی۔ جتنا مضبوط شخص اُتنا ہی طاقت ور ریامیاتی جسم! اُنھوں نے اُس کے تمام عزیز و اقارب کو بُلا لیا۔ اُس کی دو بہنیں بیلا رس سے آئی تھیں، اُس کا بھائی لینن گراڈ سے۔ وہ وہاں فوج میں تھا۔ سب سے چھوٹی نتاشا چودہ برس کی تھی۔ وہ نہایت دہشت زدہ تھی اور بہت روتی تھی لیکن اُس کی ہڈیوں کا گُودا موزوں بیٹھا۔ [خاموشی۔] ۔ اب میں اِس پر بات کر سکتی ہوں۔ پہلے میں نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے دس برس تک اِس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ [خاموشی۔] ۔

جب اُسے پتا چلا کہ وہ اُس کی چھوٹی بہن کی ہڈیوں کی گودا لے رہے ہیں تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ "اِس کی بجائے میں مرنا پسند کروں گا۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ اُسے ہاتھ بھی مت لگانا۔" اُس کی بڑی بہن لی یُو وا اُٹھائیس برس کی تھی جو خود ایک نرس تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے (چھوٹی بہن کے) ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ "جتنی دیر وہ زندہ رہتا ہے۔" اُس نے بتایا۔ "میں جراحی دیکھتی رہی۔ وہ ایک دُوسرے کے ساتھ ساتھ میزوں پر پڑے تھے۔ جراحی کے کمرے میں ایک بڑی کھڑکی تھی۔ اُس میں دو گھنٹے لگے۔ جب اُنھوں نے اپنا کام ختم کیا تو لی یُو وا کی حالت اُس سے (بھائی سے) زیادہ خراب تھی۔ اُسے (چھوٹی بہن کو) سینے میں اٹھارہ چھید آئے تھے۔ اُس کا بے ہوشی سے ہوش میں آنا نہایت مشکل تھا۔ اب وہ بیمار ہے۔ لاچار ہے۔ وہ ایک توانا اور حسین لڑکی تھی۔ وہ کبھی شادی نہیں کر پائی۔ میں اِس دوران ایک کمرے سے دُوسرے کی جانب بھاگتی پھرتی رہی۔ کبھی اِس کمرے میں تو کبھی اُن کے کمرے میں۔ اب وہ عام کمرے میں نہیں رہا تھا۔ وہ مخصوص کمرے میں، ایک مہین پردے کے عقب میں تھا۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اُن کے پاس آلات تھے کہ وہ پردہ ہٹائے بغیر اُسے ٹیکے لگا سکتے تھے۔ قاطیر رکھ سکتے تھے۔ پردے ٹیپوں سے جوڑ کر رکھے جاتے تھے۔ میں نے اُن آلات کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ لیکن میں پردہ ہٹاتی اور اُس کے پاس اندر چلی جاتی۔ اُس کے بستر کے قریب ایک چھوٹی کُرسی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی حالت اِتنی خراب ہو گئی تھی کہ اب میں اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ مجھے مسلسل پکارتا رہتا تھا۔ "لیوسیا، کہاں ہو تم؟ لیوسیا!" وہ پکارتا ہی چلا جاتا۔ دُوسرے مخصوص کمرے، جہاں ہمارے نوجوان تھے، فوجیوں نے سنبھال رکھے تھے کیوں کہ عملے کی چھوٹی نرسوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ حفاظتی لباسوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فوجی غلاظت سے بھری ٹلیاں لے جاتے۔ وہ فرش کو پونچا لگاتے، بستروں کی چادریں بدلتے۔ وہ ہر کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے وہ فوجی کہاں سے لیے تھے؟ ہم نے نہیں پُوچھا۔ لیکن وہ --- وہ --- ہر روز میں سنتی: مر گیا، مر گیا۔ ٹیجے ٹوک مر گیا۔ مر گیا۔ یہ میرے دماغ پر ہتھوڑے برسنے والی بات تھی۔

وہ دِن میں ۲۵ سے ۳۰ بار تک پاخانہ کر رہا تھا۔ خُون اور بلغم ملا پاخانہ۔ اُس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی جلد پھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ اُس کا بدن دُنبلوں سے بھر گیا تھا۔ جب وہ سر پھیرتا تو بالوں کا ایک گُچھا تکیے پر رہ جاتا۔ میں مذاق کرنے کی کوشش کرتی۔ "یہ مناسب ہے، تمھیں کنگھے کی ضرورت نہیں۔" جلد ہی اُنھوں نے اُن کے سارے بال کاٹ ڈالے۔ میں نے اُس کے بال خُود کاٹے۔ میں اُس کا ہر کام خُود کرنا چاہتی تھی۔ اگر جسمانی لحاظ سے ممکن ہوتا تو میں پُورے چوبیس گھنٹے اُس کے پاس ہی ٹھیرتی۔ ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتی۔ [طویل خاموشی۔] میرا بھائی آیا اور سہم گیا۔ "میں تمھیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔" لیکن میرے والد نے اُسے کہا۔ "تمھارا کیا خیال ہے کہ تم اُسے روک لو گے؟ وہ کھڑکی کے راستے چلی جائے گی! وہ آگ سے بچنے کے لیے نکلنے والے راستے سے چلی جائے گی!"

میں ہسپتال واپس جاتی ہوں تو بستر کے ایک طرف ایک سنگترہ دیکھتی ہوں ۔ ایک بڑا سا اور گلابی سنگترہ ۔ وہ مُسکرا رہا ہے ۔ ''مجھے تحفے میں ملا ہے ۔ تم لے لو ۔'' اُسی وقت مہین پردے میں سے نرس اشارہ کرتی ہے کہ میں اِسے نہیں کھا سکتی ۔ یہ کچھ دیر اُس کے پاس پڑا رہا ہے، پس تم اِسے نہیں کھا سکتیں بل کہ اِسے چُھونا بھی مت ۔ ''آؤ، کھا لو اِسے ۔'' وہ کہتا ہے ۔ ''تمھیں سنگترے پسند ہیں نا!'' میں سنگترہ ہاتھ میں پکڑ لیتی ہوں ۔ اِسی دوران وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سو جاتا ہے ۔ وہ اُسے سلانے کے لیے ہمیشہ ٹیکے لگاتے رہتے تھے ۔ نرس میری جانب دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہے ۔ اور میں؟ میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے موت کا خیال تک اُس کے پاس سے نہ گُزرے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موت ہول ناک ہے اور میں اُس سے خوف زدہ ہوں ۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہاں کچھ گفتگو کے ٹکڑے تھے ۔ کوئی کہہ رہا ہے: ''تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اب تمھارا شوہر نہیں ہے ۔ محبوب نہیں ہے ۔ بل کہ ایک تابکاری زدہ چیز ہے جس کی منزل زہر بھری ہے ۔ تمھیں خُودکُشی نہیں کرنا، اپنے آپ کو سنبھالو ۔'' اور میں اُس شخص جیسی ہوں جو دماغ چل جانے کے سبب دِیوانہ ہو گیا ہو ۔ ''لیکن میں اُس سے محبت کرتی ہوں! مجھے اُس سے محبت ہے!'' وہ سو رہا ہے اور میں سرگوشی کر رہی ہوں ۔ ''مجھے تم سے محبت ہے!'' ہسپتال کے صحن میں چلتے پھرتے: ''مجھے تم سے محبت ہے!'' اُس کی غلاظت کی قاب لے جاتے ہوئے: ''مجھے تم سے محبت ہے!'' مجھے یاد ہے کہ ہم گھر میں کس طرح رہا کرتے تھے ۔ اُسے رات کو صرف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لینے کے بعد ہی نیند آتی تھی ۔ یہ اُس کی عادت تھی —— سوتے ہوئے شب بھر میرا ہاتھ پکڑے رکھنا ۔ پس میں ہسپتال میں اُس کا ہاتھ تھام لیتی ہوں اور چھوڑتی نہیں ۔

ایک رات ہر شے پر سکوت طاری تھا ۔ ہم تنہا تھے ۔ اُس نے بہت غور سے مجھے دیکھا اور اچانک پُوچھا ۔

''میں اپنے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ وہ کیسا ہے؟''

''ہم اُس کا نام کیا رکھیں گے؟''

''یہ فیصلہ تم کرو گی ۔''

''جب وہ ہم دونوں کا ہے تو میں ہی کیوں؟''

''اِس صُورت میں، اگر لڑکا ہوا تو اُس کا نام واسیا ہو گا اور اگر لڑکی ہوئی تو نتاشا ۔''

مجھے اُس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتی ہوں! وہ......بس وہ ۔ میں ایک اندھے کی مانند تھی ۔ گو میں چھے ماہ کی حاملہ تھی لیکن حد یہ کہ مجھے اپنے دِل کے نیچے چھوٹی موٹی اُچھل کود بھی محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ میں نے سوچا کہ میرا ننھا میرے وجود کے اندر ہے اور وہ محفوظ ہے ۔

ڈاکٹروں میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ میں رات کو اُس کے مخصوص کمرے میں ٹھہرتی ہوں ۔ نرسیں مجھے اندر جانے دے دیتیں ۔ شروع شروع میں اُنھوں نے بھی مجھ سے بحث کی تھی: ''تم نوجوان ہو ۔ تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ وہ اب ایک شخص نہیں رہا بل کہ ایک نیوکلیائی مرکز ہے ۔ تم بھی اُس کے ساتھ جل مرو گی ۔'' میں اُن

کے پیچھے دُم ہلاتے ہوئے کتے کی مانند پھرتی تھی۔ میں گھنٹوں اُن کے دروازے پر کھڑی منتیں اور بحث کرتی رہتی۔ اور پھر وہ کہتیں: ''ٹھیک ہے، جہنم میں جاؤ! تم صحیح الدماغ نہیں ہو۔'' صبح کے وقت، بس آٹھ بجنے سے کچھ پہلے، جب ڈاکٹر دورے کرنا شروع کرتے تھے تو وہ پردے کی دُوسری طرف آ کھڑی ہوتیں: ''نکلو!'' سو، میں ایک گھنٹے کے لیے اپنی قیام گاہ پر چلی جاتی۔ پھر صبح نو بجے سے رات نو بجے تک کا پاس میرے پاس ہے۔ گھٹنوں سے نیچے میری ٹانگیں نیلی پڑ گئی تھیں، نیلی اور سُوجی ہوئیں۔ میں اتنا تھک چکی تھی۔

جب میں اُس کے پاس ہوتی تو کبھی نہ کرتے لیکن جب میں چلی جاتی تو --- وہ اُس کی تصویریں کھینچتے۔ بے لباسی کی حالت میں، عریاں۔ اُس کے اُوپر ایک چھوٹی سی پتلی چادر ہوتی تھی۔ میں روزانہ اُس پتلی چادر کو تبدیل کرتی اور روزانہ شام کو وہ خُون سے لت پت ہو جاتی۔ میں اُسے اُٹھاتی تو اُس کی جلد کی پپڑیاں میرے ہاتھ میں آجاتیں اور میرے ہاتھوں سے چمٹ جاتیں۔ میں اُسے کہتی۔ ''عشق! میری مدد کرو۔ اپنے بازوؤں اور کہنیوں کے بل جتنا اُوپر اُٹھ سکتے ہو اُٹھنا کہ میں تمھارا بستر ٹھیک کر سکوں، سلوٹیں اور تہیں دُور کر سکوں۔'' چھوٹی سے چھوٹی تہہ بھی اُس کے بدن پر زخم ڈال دیتی۔ میں خُون نکلنے کی حد تک اپنے ناخن اتنی گہرائی میں کاٹتی کہ اُن سے اتفاقاً بھی اُسے زخم نہ آئے۔ کوئی بھی نرس اُس کے قریب نہیں پھٹکتی تھی۔ اگر اُنھیں کوئی شے درکار ہوتی تو وہ مجھے پکارتیں۔

اُنھوں نے اُس کی تصویریں کھینچیں۔ سائنس کے لیے، اُنھوں نے بتایا۔ اگر میں اُنھیں وہاں سے باہر نکالنے کی اہل ہوتی تو اُنھیں دھکے دے کر وہاں سے نکال باہر کرتی۔ میں اُنھیں للکارتی! اُن پر گھونسے برساتی! اُنھوں نے جرأت کیسے کی؟ وہ سارے کا سارا میرا ہے-- وہ میرا عشق ہے--

میں کمرے سے نکل کر ہال وے میں جا رہی ہوں۔ میں سوفے کی سمت جا رہی ہوں کیوں کہ وہ مجھے دِکھائی نہیں دیتی ہیں۔ میں ڈیوٹی پر موجود نرس کو بتاتی ہوں۔ ''وہ مر رہا ہے۔'' اور وہ مجھے کہتی ہے۔ ''تم کیا توقع کر رہی تھیں؟ وہ ۱۶۰۰ رونٹگن (roentgen) لے چکا ہے۔ ۴۰۰ کی مقدار بھی مہلک ہوتی ہے۔ تم ایک نیوکلیائی مرکز کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔'' وہ سارا میرا ہے...... میری محبت ہے۔ جب وہ سب مر گئے تو اُنھوں نے ہسپتال اُدھیڑ ڈالا۔ اُنھوں نے دیواریں تک کھرچ ڈالیں اور فرش کھود ڈالا۔

اور پھر--- ایک آخری چیز۔ یہ مجھے ٹکڑوں میں یاد ہے۔ تمام منتشر ہو چکی ہے۔

رات کے وقت میں اُس کے پاس چھوٹی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ آٹھ بجے میں کہتی ہوں۔ ''واسینکا، میں ذرا سی ہَوا خوری کے لیے جا رہی ہوں۔'' وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور پھر بند کر لیتا ہے۔ وہ مجھے جانے دیتا ہے۔ میں اپنی قیام گاہ میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔ فرش پر لیٹ جاتی ہوں۔ میں بستر پر لیٹ نہیں سکتی تھی۔ اَنگ اَنگ دُکھ رہا ہوتا ہے کہ تبھی صفائی والی دروازہ پیٹتی ہے۔ ''جاؤ! اُس کے پاس دوڑ کر جاؤ! وہ جنونیوں کی طرح تمھیں پکار رہا ہے۔'' اُسی صبح تانیا کِبینوک نے مجھے کہا تھا۔ ''میرے ساتھ قبرستان تک چلو۔

میں وہاں اکیلی نہیں جا سکتی۔“ وہ دیتایبے نوک اور والودیا پراوک کی تدفین کر رہے تھے۔ وہ دونوں میرے واسیا کے دوست تھے۔ ہمارے خاندان آپس میں دوست تھے۔ دھماکے سے ایک روز پہلے کا ہم سب کا عمارت میں اکٹھے فوٹو ہے۔ ہمارے شوہر کتنے وجیہ ہیں! وہ اُس کی زندگی کا آخری دِن تھا۔ ہم سب بہت خُوش تھے!

میں قبرستان سے واپس آئی تو سیدھی نرس کی طرف گئی۔ “وہ کیسا ہے؟” “وہ پندرہ منٹ قبل مر گیا۔” “کیا؟” میں وہاں ساری رات رہی تھی۔ تین گھنٹوں ہی کے لیے گئی تھی! میں کھڑکی کے پاس گئی اور چلانے لگی۔ “کیوں؟ کیوں؟” میں اُوپر آسمان کی طرف دیکھنے اور بَین کرنے لگی۔ عمارت کے سب لوگ سُن رہے تھے لیکن مجھ سے دُور رہے۔ پھر میں گئی: میں اُسے ایک بار اَور دیکھوں گی! ایک مرتبہ اَور! میں سیڑھیوں کی جانب دوڑی۔ وہ ابھی تک اپنے مخصوص کمرے میں تھا۔ اُنھوں نے ابھی اُسے وہاں سے ہٹایا نہیں تھا۔ اُس کے آخری الفاظ تھے: “لیوسیا! لیوسینکا!” “وہ تھوڑی دیر کے لیے ابھی گئی ہے۔ جلد لوٹ آئے گی۔” نرس نے اُسے بتایا۔ اُس نے ہوک بھری اور خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد میں نے اُسے نہیں چھوڑا۔ میں نے قبر تک تمام راستے اُسے اپنے حصار میں لیے رکھا۔ اگرچہ مجھے یاد ہے کہ وہ چیز قبر نہیں ہے، پلاسٹک کا ایک تھیلا ہے۔ تھیلا۔

مُردہ خانے میں اُنھوں نے پُوچھا تھا۔ “تم دیکھنا چاہو گی کہ ہم نے اُسے کیسا لباس پہنایا ہے؟” میں دیکھتی ہوں! اُنھوں نے اُسے عام سا لباس پہنا رکھا تھا، اُس کی سروس کیپ سمیت۔ وہ اُسے جُوتے نہیں پہنا سکے تھے کیوں کہ اُس کے پیر سُوجے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اُس عام لباس کو بھی کاٹ رکھا تھا کیوں کہ اُس کے بغیر وہ اُسے پہنا ہی نہیں سکتے تھے۔ لباس پہننے کے لیے اُس کا پُورا جسم تھا ہی نہیں۔ وہاں تو بس-- زخم ہی زخم تھے۔ ہسپتال کے آخری دو دِنوں کے دوران-- میں اُس کا بازو تھامتی تو ہڈی ہلنے لگتی، اِس طرح حرکت کرنے لگتی گویا گوشت نے اُسے چھوڑ دیا ہو۔ اُس کے پھیپھڑوں اور جگر کے ٹکڑے اُس کے مُنھ کے راستے نکل رہے تھے۔ اُس کے اندرونی اعضا حلق میں رُکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ میں اپنے ہاتھ پر پٹی لپیٹتی اور اُس کے مُنھ میں ڈال کر تمام مواد باہر نکال لیتی۔ اِس کے بارے میں بات کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اِس کے بارے میں لکھنا بھی ناممکن ہے۔ حتّٰی کہ اِس کے بارے میں سوچتے ہوئے جینا بھی ممکن نہیں۔ وہ سارے کا سارا میرا ہے۔ میرا عشق۔ اُنھیں تو اُس کے ماپ کا جُوتوں کا ایک جوڑا تک نہیں ملا۔ اُنھوں نے اُسے ننگے پاؤں ہی دفنا دیا۔

اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے-- عام لباس پہنے ہوئے-- اُنھوں نے اُسے اُٹھایا اور مومی تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا مُنھ باندھ دیا۔ پھر اُس تھیلے کو چوبی تابوت میں رکھا۔ اور پھر اُس تابوت پر بھی ایک مومی تھیلا چڑھا کر اُسے باندھ دیا۔ اگرچہ پلاسٹک شفاف لیکن ٹیوب کے ربڑ کی مانند موٹا ہے۔ پھر اُنھوں نے وہ سب جستی تابوت میں ڈال دیا۔ اُسے اُس میں گُس ڈالا۔ صرف ٹوپی پُوری نہیں آئی۔

سب ہی آ گئے۔ اُس کے ماں باپ، میرے ماں باپ۔ اُنھوں نے ماسکو سے سیاہ رُومال خریدے۔ دی ایکسٹرا آرڈینری کمیشن نے ہم سے ملاقات کی۔ اُنھوں نے سب سے ایک ہی بات کہی: ہمارے لیے آپ

کے شوہروں، آپ کے بیٹوں کی نعشیں دینا ممکن نہیں ہے۔ وہ انتہائی تابکاری رکھتے ہیں اور انھیں ایک خاص طریقے سے ماسکو ہی کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ مہر بند جستی تابوت سیمنٹ سے بنی اینٹوں تلے دفن کیے جائیں گے۔ آپ کو اس دستاویز پر دستخط کرنا ہوں گے۔

اگر کچھ لوگ برہم ہوے اور انھوں نے اصرار کیا کہ وہ تابوت گھر ہی لے جانا چاہتے ہیں تو انھیں بتایا گیا کہ تمھیں پتا ہے کہ مرجانے والے اب ہیرو ہیں اور اب اُن کا اپنے خاندانوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ وطن کے ہیرو تھے۔ اُن کا وطن سے رشتہ تھا۔

ہم جنازہ گاڑی میں بیٹھ گئے، عزیز و اقارب اور کچھ طرح کے فوجی۔ ایک کرنل اور اُس کا دستہ۔ وہ دستے کو بتاتے ہیں: ’’احکامات کا انتظار کرو!‘‘ ہم ماسکو میں دو تین گھنٹے سفر کرتے رہے، پیٹی والے راستے پر۔ ہم دوبارہ ماسکو جا رہے ہیں۔ وہ دستے کو بتاتے ہیں: ’’ہمیں قبرستان میں نہ جانے دینے کا حکم ہے۔ قبرستان پر غیر ملکی صحافیوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ تھوڑی دیر مزید انتظار کرو۔‘‘ والدین کچھ نہیں بولتے۔ میری ماں کے ہاتھ میں سیاہ رُومال ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ ’’یہ لوگ میرے شوہر کو کیوں چھپا رہے ہیں؟ وہ تھا-- کیا؟ قاتل؟ مجرم؟ ہم کسے دفنانے جا رہے ہیں؟‘‘ میری ماں: ’’چپ، بیٹی چپ۔‘‘ وہ سر سہلا رہی ہے۔ کرنل پکارتا ہے: ’’قبرستان چلو۔ اِس کی بیوی جنونی ہو رہی ہے۔‘‘ قبرستان میں ہمیں فوجیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ ہمارا پڑاؤ باہر رُکا تھا۔ انھوں نے تابوت اُٹھایا ہوا تھا۔ کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ہمیں اجازت ملی تھی۔ انھوں نے محض ایک منٹ میں زمین میں دفنا دیا۔ ’’جلدی کرو! جلدی کرو!‘‘ آفیسر پکار رہا تھا۔ انھوں نے مجھے تابوت سے بھی لپٹنے نہیں دیا۔ اور-- لاری پر۔ ہر چیز راز میں تھی۔

وہ آناً فاناً ہمارے لیے گھر واپسی کے لیے جہاز کے ٹکٹ خرید لائے۔ اگلے روز کی پرواز کے۔ تمام وقت سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک فوجی نشانوں والا ہمارے سر پر سوار رہا۔ اُس نے ہمیں سفر کے لیے خوراک خریدنے کے لیے بھی قیام گاہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ہمیں کسی سے بات کرنے سے خدا بھی منع کرتا ہے-- خاص طور پر مجھے۔ جیسے میں اُس وقت بات کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں تو رونے سے بھی لاچار ہو گئی تھی۔ جب ہم روانہ ہو رہے تھے تو ڈیوٹی پر موجود عورت نے تمام تولیے اور چادریں شمار کیں۔ اُس نے انھیں فوراً تہہ کیا اور موی تھیلے میں لپیٹ دیا۔ انھوں نے غالباً انھیں جلا دیا ہوگا۔ ہم نے اقامت گاہ کی ادائیگی خود کی۔ وہ نیوکلیائی شعاعوں کے زہر سے علاج والا ہسپتال تھا۔ محض چودہ راتوں تک علاج والا۔ ایک شخص کے مرنے میں بس اتنا ہی وقت لگتا ہے۔

گھر پہنچ کر میں سو گئی۔ بس میں گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی بستر پر جا گری۔ میں تین روز تک سوتی رہی۔ ایک ایمبولینس آئی۔ ’’نہیں۔‘‘ ڈاکٹر نے بتایا۔ ’’یہ اُٹھ جائے گی۔ یہ محض ہولناک نیند ہے۔‘‘

میں تئیس برس کی تھی۔

میں نے جو خواب دیکھا وہ مجھے یاد ہے ۔ میری مرحومہ دادی اُسی لباس میں آتی ہے جس میں ہم نے اُس کی تدفین کی تھی ۔ وہ سالِ نَو کے درخت کو سنوار رہی ہے ۔ ”دادی اماں، ہم سالِ نَو کا درخت کیوں سنوار رہے ہیں؟ ابھی تو موسمِ گرما ہے ۔“ ”کیوں کہ جلد ہی تمھارا واسینکا مجھ سے آ ملنے والا ہے ۔“ اور وہ جنگل سے نمودار ہوا ۔ مجھے خواب یاد ہے ۔ -- واسیا سفید لباس میں آتا ہے اور نتاشا کو پکارتا ہے ۔ وہ ہماری بیٹی ہے جسے ابھی میں نے جنم بھی نہیں دیا ہے ۔ لیکن وہ بھی نمودار ہو جاتی ہے ۔ وہ اُسے چھت کی سمت اُچھالتا ہے اور وہ دونوں ہنسنے لگتے ہیں ۔ اور میں اُنھیں دیکھتے ہوئے اُس خوشی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہوں -- یہ کس قدر خالص ہے -- میں سو رہی ہوں ۔ ہم جھیل کے کنارے پر چہل قدمی کر رہے ہیں ۔ ٹہلتے ہی چلے جا رہے ہیں ۔ غالباً اُس نے مجھے کہا کہ میں روؤں مت ۔ مجھے اشارہ کیا، وہاں اُوپر سے ۔

[وہ ایک طویل وقفے کے لیے خاموش ہو جاتی ہے ۔]

دو ماہ بعد میں ماسکو گئی ۔ ریلوے سٹیشن سے سیدھی قبرستان پہنچی ۔ اُس کے پاس! قبرستان ہی میں مجھے دردِ زہ شروع ہو گیا ۔ ٹھیک اُسی وقت جب میں نے اُس سے باتیں کرنا شروع کی ہی تھیں -- اُنھوں نے ایمبولینس کو بلا لیا ۔ جب میں ماں بنی تو بھی وہاں وہی انجلینا واسلیفنا گسکووا ہی تھی ۔ اُس نے مجھے بتایا تھا ۔ ”تمھیں پیدائش کے وقت یہاں آنا ہوگا ۔“ پیدائش میں ابھی دو ہفتے باقی تھے ۔

اُنھوں نے اُسے مجھے دِکھایا -- ایک لڑکی ۔ ”نتاشینکا ۔“ میں پکار اُٹھی ۔ ”تمھارے باپ نے تمھارا نام نتاشینکا رکھا تھا ۔“ وہ صحت مند دِکھائی دے رہی تھی ۔ بازو، ٹانگیں، سب کچھ ۔ لیکن اُسے جگر کی سوجن، خلیوں کی عدم بڑھوتری، جھلی کی سوجن (Cirrhosis) کا مرض تھا ۔ اُس کے جگر میں اٹھارہ مقامات پر ایٹمی شعاعوں کے آئنی بانڈ تھے ۔ پیدائشی دِل کی بیماری ۔ چار گھنٹے بعد اُنھوں نے مجھے بتایا کہ وہ مر گئی ہے ۔ اور دوبارہ: ہم اُسے تمھیں نہیں دیں گے! کیا مطلب ہے تمھارا ہے کہ تم اُسے مجھے نہیں دو گے؟ میں اُسے تمھیں نہیں دوں گی! تم اُسے سائنس کے لیے لینا چاہتے ہو ۔ میں تمھاری سائنس سے نفرت کرتی ہوں! مجھے سائنس سے نفرت ہے!

[وہ خاموش ہو جاتی ہے ۔]

میں تمھیں غلط باتیں بتاتی رہی ہوں ۔ غلط باتیں ۔ مجھے اپنی چوٹ کے بعد چیخنا چلانا نہیں چاہیے ۔ اور مجھے رونا پیٹنا نہیں چاہیے ۔ کیوں کہ تمام الفاظ ہی غلط ہیں ۔ لیکن میں اِتنا کہوں گی ۔ کسی کو یہ نہیں معلوم ۔ جب وہ میرے پاس ایک چھوٹا چوبی صندوقچہ لے کر آئے اور بولے ۔ ”وہ اِس میں ہے ۔“ میں نے دیکھا ۔ اُسے جلا ڈالا گیا تھا ۔ اُس کی راکھ بنی ہوئی تھی ۔ اور میں رونے لگی ۔ ”اِسے اُس کے قدموں میں دفن کر دو ۔“ میں نے استدعا کی ۔

وہاں، قبرستان میں، نتاشا اِگناٹینکو کا نام نہیں ہے ۔ وہاں صرف اُس کا نام ہے ۔ اُسے ابھی تک نام نہیں

ملا، اُسے کچھ نہیں ملا، بس رُوح ملی تھی۔ جسے میں نے وہاں دفن کر دیا۔ میں ہمیشہ وہاں دو گُل دستے لے کر جاتی ہوں: ایک اُس کے لیے اور دُوسرا اُس کے لیے (بیٹی کے لیے) کونے پر رکھ دیتی ہوں۔ میں قبر کے گرد گھٹنوں کے بَل چلتی ہوں۔ ہمیشہ اپنے گھٹنوں کے بَل۔ [وہ نا قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔]۔ میں نے اُس کا خُون کر ڈالا۔ میں۔ وہ۔ بچایا۔ میری ننھی بیٹی نے مجھے بچایا۔ اُس نے تابکاری کے تمام اثرات خُود پر لے لیے۔ اِس بات پر وہ مینارۂ نُور ہے۔ وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ وہ نہایت ہی ننھی سی چیز تھی۔ [اُسے سانس لینے میں دُشواری ہوتی ہے۔]۔ اُس نے بچایا...... لیکن میں اُن دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ کیوں کہ -- کیوں کہ آپ کسی کا محبت سے خُون نہیں کر سکتے، ٹھیک ہے؟ یہ دونوں چیزیں اکٹھی کیوں ہیں -- محبت اور موت؟ اکٹھی۔ کون مجھے یہ بات سمجھائے گا؟ میں قبر کے گرد گھٹنوں کے بَل رینگتی ہوں۔ [وہ طویل وقفے کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔]

کیف میں اُنھوں نے مجھے ایک اپارٹمنٹ دے دیا۔ وہ ایک بڑی عمارت میں تھا جہاں اُنھوں نے ایٹمی گھر کے ہر فرد کو ڈال دیا۔ وہ دو کمروں والا ایک بڑا اپارٹمنٹ تھا ویسا ہی جس کا واسیا اور میں نے خواب دیکھا تھا۔ اور میں اُس میں پاگل ہوتی جا رہی تھی!

بالآخر مجھے ایک خاوند مل گیا۔ میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا -- تمام تر سچائی -- کہ میری ایک محبت ہے، زندگی بھر کی محبت۔ میں نے اُس ایک ایک بات بتا دی۔ ہم ملتے لیکن میں اُسے کبھی اپنے گھر نہیں بلاتی تھی کیوں کہ وہاں واسیا تھا۔

میں مٹھائیوں کی ایک دُکان میں کام کرتی تھی۔ میں کیک بناتی اور میرے آنسو بہتے رہتے۔ میں رو نہیں رہی، میرے آنسو خُود بخُود بہہ رہے ہیں۔

میں نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اینڈری۔ اینڈریکا۔ میری دوستوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ ”تم بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔“ اور ڈاکٹروں نے مجھے ڈرایا: ”تمھارا جسم اِسے سنبھال نہیں پائے گا۔“ پھر، بعد میں اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُس کا ایک بازو نہیں ہے۔ دایاں بازو۔ آلات نے یہی دِکھایا تھا۔ ”ٹھیک ہے، پھر کیا ہوا؟“ میں نے سوچا۔ میں اُسے بائیں ہاتھ سے کام کرنا سکھا دوں گی۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو بالکل ٹھیک تھا۔ ایک خُوب صُورت لڑکا۔ اب وہ سکول میں ہے۔ اچھے درجے حاصل کرتا ہے۔ اب میرے پاس کوئی ہے -- میں زندہ رہ سکتی ہوں اور اُس کی مہک محسوس کر سکتی ہوں۔ وہ میری زندگی میں روشنی ہے۔ وہ ہر بات کو پُوری طرح سمجھتا ہے۔ ”امّی، اگر میں دو روز کے لیے نانی اماں کے ہاں چلا جاؤں تو کیا آپ سانس لے پائیں گے؟“ میں نہیں لے پاؤں گی۔ میں اُس دِن سے ڈرتی ہوں جب وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایک روز ہم سڑک پر جا رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں گرنے لگی ہوں۔ تب مجھے پہلی بار چوٹ لگی تھی۔ سیدھی سڑک پر آ رہی۔ ”امّی، تمھیں پانی چاہیے؟“ ”نہیں، بس یہاں میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔“ اور میں نے اُس کا

بازو پکڑ لیا۔ مجھے نہیں پتا پھر کیا ہوا۔ میں ہسپتال پہنچ گئی۔ لیکن میں نے اُس کا بازو اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ ڈاکٹروں نے بمشکل میری اُنگلیاں کھولیں۔ اُس کا بازو بہت دیر تک نیلا پڑا رہا۔ اب جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔ ''امّی، بس میرا بازو مت پکڑنا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' وہ بھی بیمار رہتا ہے۔ دو ہفتے سکول تو دو ہفتے ڈاکٹر کے ساتھ گھر۔ ہم یہ زندگی جی رہے ہیں۔

[وہ اُٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔]

یہاں ہم بہت سے لوگ ہیں۔ پُوری گلی۔ جس کا نام ہے -- چرنوبل سکایا۔ اِن لوگوں نے زندگی بھر ایٹمی گھر میں کام کیا ہے۔ اِن میں سے بہت سے اب بھی وہاں عارضی بنیادوں پر کام کرنے جاتے ہیں۔ وہ اِس طرح وہاں کام کرتے ہیں۔ کوئی بھی وہاں زیادہ عرصے نہیں رہتا۔ اِنھیں بیماریاں لگی ہوئی ہیں، یہ بیمار ہیں لیکن اپنی نوکریاں نہیں چھوڑتے۔ یہ تو ایٹمی گھر کے بند ہونے کے بارے میں سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ کس کو اب اِن کی ضرورت ہے؟! اکثر مر جاتے ہیں۔ ایک لمحے میں۔ بس پیچھے گرتے ہیں -- کوئی کہیں جا رہا ہوگا تو وہ گرتا ہے، سو جاتا ہے اور کبھی نہیں اُٹھتا۔ وہ اپنی نرس کے لیے پھول لے کر جا رہا تھا کہ اُس کے دِل نے کام کرنا بند کر دیا۔ یہ مر جاتے ہیں لیکن درحقیقت ہمیں پُوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں تو کسی نے یہ تک نہیں پُوچھا کہ ہم پر کیا بیتی ہے؟ ہم نے کیا دیکھا ہے؟ کوئی بھی موت کی باتیں نہیں سُننا چاہتا۔ جس سے وہ دہشت زدہ ہیں۔

لیکن میں تو تمھیں محبت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اپنی محبت کے بارے میں ......

(مرحوم فائر مین واسلی اِگناٹینکو کی بیوہ لیُدملا اِگناٹنکو)

۱۔ ڈوزی میٹر (dosimeter): وہ آلہ جس سے بدن میں جذب شدہ ایٹمی شعاعوں کی مقدار ناپی جاتی ہے۔

۲۔ اجمود (parsley): سلاد جیسے پتوں والی ایک خُوش بُو دار سبزی جو سالن کے اُوپر سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اُسے علیحدہ سے کچا بھی کھایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆

سویتلانا الیگزائی وِچ

ترجمہ: نجم الدّین احمد

زندہ اور مرے ہوؤں کے بارے میں گفتگو

رات کے وقت باڑے میں بھیڑیا گھس آیا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں اور وہ وہاں موجود ہے۔ اُس کی آنکھیں ہیڈ لائٹوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اب میں ہر چیز کی عادی ہو گئی ہوں۔ میں سات برسوں سے تنہا زندگی بسر کر رہی ہوں۔ سات برس قبل لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔ بعض اوقات میں یہاں بیٹھی بس سوچتی رہتی ہوں۔ سوچتی رہتی ہوں تا آنکہ دِن کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ پس اُس روز میں شب بھر جاگتی، اپنے بستر پر بیٹھ رہی اور پھر باہر نکل گئی کہ دیکھوں سُورج کیسا ہے۔ میں تمھیں کیا بتاؤں؟ موت دُنیا کی سب سے بڑی منصف ہے۔ اِس سے کسی کو مفر نہیں۔ زمین ہر شے کھا جاتی ہے-- رحم دِلوں، ظالموں، گناہ گاروں کو۔ کرۂ ارض پر موت کے علاوہ کوئی شے اتنی منصف نہیں۔ میں نے عمر بھر محنت اور دیانت داری سے کام کیا۔ لیکن مجھے انصاف نہیں ملا۔ خدا چیزیں کہیں اور بانٹتا رہا اور جب میری باری آئی تو کچھ نہیں بچا تھا۔ جوان کو بھی مرنا پڑتا ہے اور بُوڑھے کو بھی …… میں شروع میں لوگوں کی واپسی کی منتظر رہی-- میرا خیال تھا کہ وہ لوٹ آئیں گے۔ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے تو بتایا تھا کہ وہ کچھ دِنوں کے لیے جا رہے ہیں۔ مرنا مشکل نہیں البتہ ہراس زدہ کرنے والا کام ہے۔ یہاں کوئی گرجا نہیں ہے۔ پادری نہیں آتا ہے۔ مجھے میرے گناہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

پہلی مرتبہ جب اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ ہمیں نیوکلیائی شعاعیں لگ گئی ہیں تو میں سمجھی شاید یہ کسی قسم کی کوئی بیماری ہے اور جسے بھی لگتی ہے وہ آناً فاناً مر جاتا ہے۔ نہیں، اُنھوں نے کہا، یہ ایسی چیز ہے جو زمین پر بھی رہتی ہے اور زمین کے اندر بھی لیکن تم اِسے دیکھ نہیں سکتے۔ شاید جانور اُنھیں دیکھ اور سُن سکتے ہوں لیکن انسان نہیں۔ لیکن یہ بات سچ نہیں ہے! میں نے اُنھیں دیکھا ہے۔ سلوری دھات کا یہ ٹکڑا تب تک میرے باڑے میں پڑا رہا تھا جب تک بارش سے بھیگ نہیں گیا۔ اِس کا رنگ روشنائی جیسا سیاہ تھا۔ یہ پڑا ہوا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر موٹا اور گلجلا ہو گیا۔ میں کولخوز سے گھر بھاگی اور اپنے باغ میں گئی۔ وہاں ایک اَور ٹکڑا تھا۔ وہ نیلے رنگ کا تھا۔ اور سب ہر طرف دیکھنے کو دوڑے۔ تمام باغات اور قریبی کھیت کھلیانوں میں-- تقریباً دو صد ایکڑ تک-- ہم نے چار بڑے بڑے موٹے تختے دیکھے۔ ایک لال رنگ کا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے بارش ہو گئی اور دوپہر تک وہ غائب ہو گئے۔ پولیس آئی لیکن اُنھیں دِکھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم صرف بتا سکتے

تھے۔ تختے اِتنے بڑے تھے۔[وہ اپنے ہاتھوں کے اشارے سے حجم بتاتی ہے۔] ۔میرے رُومال جیسے۔ لال اور نیلے۔

ہم اُن شعاعوں سے زیادہ خوف زدہ نہیں تھے۔ جب اُنھیں دیکھ نہیں سکتے تھے اور جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ کیا ہیں تو شاید تھوڑا سا سہم گئے تھے لیکن جب ہم نے اُنھیں دیکھ لیا تو ہم زیادہ خوف زدہ نہیں رہے۔ پولیس اور فوجیوں نے اُن علامات کو نصب کر دیا۔ کچھ لوگوں کے گھروں کے ساتھ اور کچھ سڑکوں پر -- اُنھوں نے لکھا تھا: ۶۰ کیوری، ۷۰ کیوری۔ ہم اپنے آلوؤں کی کاشت پہلے ہی ملتوی کر چکے تھے۔ اور پھر اچانک -- ہمیں اجازت نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے اِس کا بُرا منایا تو کچھ نے اِس کا مذاق اُڑایا۔ اُنھوں نے ہمیں ہدایت کہ اپنے باغوں میں نقاب اور ربڑ کے دستانے پہن کر کام کریں۔ اور پھر جلسہ گاہ میں ایک بڑا سائنس دان آیا اور اُس نے ہمیں بتایا کہ ہمیں اپنے باڑے دھونے چاہئیں۔ آؤ آؤ! مجھے یقین نہیں آیا کہ میں کیا سُن رہی ہوں! اُنھوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنی چادریں دھوئیں، اپنے کمبل دھوئیں، اپنے پردے دھوئیں۔ لیکن وہ گودام میں ہیں! الماریوں اور ٹرنکوں میں ہیں۔ وہاں تو کوئی شعاع نہیں ہے! شیشے کے پیچھے؟ بند دروازوں کے پیچھے! آؤ آؤ! وہ تو جنگل میں ہیں، کھیتوں میں ہیں۔ اُنھوں نے کنویں بند کر دیے، تالے لگا دیے، مومی کاغذوں سے ڈھانپ دیے۔ کہا کہ پانی گندا ہو گیا ہے۔ وہ کیسے گندا ہو سکتا ہے جب کہ وہ اِتنا صاف ستھرا ہے؟ اُنھوں نے ہمیں احمقوں کا ٹولہ قرار دیا۔ تم مر جاؤ گے۔ تمھیں یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔ انخلا۔

لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ اُن کے اندر ڈر بیٹھ گیا۔ رات کے وقت لوگوں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اپنے کپڑے لیے، اُنھیں تہ کیا۔ میری دیانت دارانہ محنت کے سُرخ تمغے اور میری خُوش بختی کی کوپائیکا (Kopieka)۔ اُس وقت افسردگی! میرا دل بھر آیا۔ اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو خدا کرے میں یہیں مر جاؤں۔ اور پھر میں نے آوازیں سُنیں کہ فوجی کس طرح بستی خالی کروا رہے تھے اور یہ بُوڑھا اور یہ بُڑھیا ٹھیرے رہے۔ تا آنکہ لوگوں کو نیند سے اُٹھا کر بسوں میں بھر نہیں دیا گیا۔ اُنھوں نے اپنی گائے کی رَسی تھامی اور جنگل میں چلے گئے۔ وہ وہاں انتظار کرنے لگے۔ وہ گاؤں کو یوں آگ لگا رہے تھے جیسے جنگ میں لگائی جاتی ہے۔ ہمارے فوجیوں نے ہمارا ہی تعاقب کیوں کیا؟[رونے لگتی ہے۔] ۔ہماری زندگی میں استحکام نہیں ہے۔ میں رونا نہیں چاہتی۔

اوہ، اُدھر دیکھو-- کوا۔ گو بعض اوقات کوا باڑے سے انڈے چُرا کر لے جاتا ہے لیکن اب میں اُنھیں اُڑانے کے لیے اُن کے پیچھے نہیں بھاگتی۔ اب میں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتی! کل ایک چھوٹا خرگوش آ گیا تھا۔ قریب ہی ایک گاؤں ہے، وہاں بھی ایک عورت رہتی ہے۔ میں بولی: اُس کے پاس چلی جاؤں، شاید وہ مدد کرے شاید نہ کرے لیکن کم سے کم بات کرنے کو تو کوئی ہوگا۔ رات کو ہر چیز تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ میری ٹانگیں گھوم رہی ہیں جیسے اُن میں چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں دوڑتی پھر رہی ہیں، میرے اعصاب میرے ساتھ

یُوں کرتے ہیں۔ یُوں ہوتا ہے کہ جب میں کوئی شے اُٹھاتی ہوں تو لگتا ہے جیسے گندم پِسی جا رہی ہو۔ چُر چُر، چُر چُر۔ پھر اعصاب سکون میں آ جاتے ہیں۔ میں زندگی میں بہت کام کر چکی ہوں، بہت اُداس رہ چکی ہوں۔ میں نے سب کچھ بہت کر لیا اور اب کسی کام کو دل نہیں کرتا۔

میرے بیٹے اور بیٹیاں ہیں...... وہ سب شہر میں رہتے ہیں۔ لیکن میں کہیں نہیں جا رہی! خدا نے مجھے زندگی دی ہے لیکن مجھے میرا حصہ نہیں دیا۔ مجھے پتا ہے کہ آدمی بُوڑھا ہو کر زود رنج ہو جاتا ہے، کہ نوجوان نسل صبر و تحمل سے دوڑ دھوپ میں لگی رہتی ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ خُوشی نہیں ملی۔ وہ عورتیں جو شہروں میں گئیں وہ بھی ہمیشہ روتی پیٹتی رہتی ہیں۔ یا تو اُن کی بہو اُنھیں کُڑھاتی رہتی ہے یا پھر بیٹی۔ وہ واپس آنا چاہتی ہیں۔ میرا شوہر یہاں ہے۔ وہ یہاں دفن ہے۔ اگر وہ یہاں دفن نہ ہوتا تو کسی اور جگہ رہ رہا ہوتا اور میں بھی اُس کے ساتھ ہوتی۔ [یکایک خُوش ہو جاتی ہے۔] ۔ اور میں یہاں سے جاؤں تو کیوں؟ یہ اچھی جگہ ہے! ہر جنس اُگتی ہے، ہر چیز پر جوبن آتا ہے۔ چھوٹی سی تتلی سے لے کر جانور تک ہر شے یہاں رہ رہی ہے۔

میں تمھیں بتانے کے لیے ایک ایک بات یاد کروں گی۔ ہر روز جہاز اُڑتے ہیں۔ روزانہ۔ وہ اتنی نیچی پرواز کرتے ہیں کہ بس ہمارے سروں سے ذرا سے اُونچے۔ وہ ایٹمی گھر کی طرف جاتے ہیں۔ ایٹمی گھر کی طرف۔ ایک کے بعد ایک۔ اور ہم نے یہاں سے انخلا کرنا ہے! ہمیں وہ باہر نکال رہے ہیں۔ گھروں میں دڑانہ گھس رہے ہیں۔ گھروں پر دھاوا بول کر قبضہ کر رہے ہیں۔ لوگوں نے پناہیں ڈھونڈ لی ہیں، وہ خُود کو چھپا رہے ہیں۔ مویشی گریہ کر رہے ہیں، بچے رو رہے ہیں۔ یہ جنگ ہے! اور سُورج غائب ہے...... میں بیٹھ گئی اور جھونپڑی سے باہر نہیں نکلی لیکن یہ سچ ہے کہ میں اندر سے کُنڈی بھی نہیں چڑھاتی۔ فوجیوں نے دستک دی۔ ’’مادام، کیا آپ نے سامان باندھ لیا ہے؟‘‘ اور میں بولی۔ ’’کیا تم نے میرے ہاتھ پاؤں باندھے ہیں؟‘‘ وہ کوئی جواب نہیں دیتے، کچھ نہیں بولتے۔ اور پھر وہ چلے گئے۔ وہ نوجوان تھے۔ وہ بچے تھے! بُوڑھی عورتیں اپنے گھروں کے سامنے گھٹنوں کے بَل رینگ رہی تھیں۔ منّتیں ترلے کر رہی تھیں۔ فوجیوں نے اُنھیں اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور گاڑی میں ڈالا۔ لیکن میں نے اُن سے کہا جس نے بھی مجھے ہاتھ لگایا اُس کی خیر نہیں۔ میں نے اُنھیں گالیاں دیں! میں نے بے حد بددُعائیں دیں۔ میں روئی چیخی نہیں۔ اُس روز میں نہیں روئی۔ میں اپنے گھر میں بیٹھ گئی۔ ایک ہفتہ تک پُکار ہوتی رہی۔ پُکارتے رہے! اور پھر خاموشی چھا گئی، گہری خاموشی! ایک دِن تک-- پہلے دِن میں گھر سے باہر نہیں نکلی۔

اُنھوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ لوگوں کا ایک قافلہ جا رہا تھا اور لوگوں کے بعد مویشیوں کا قافلہ تھا۔ وہ جنگ تھی! میرا خاوند کہا کرتا تھا کہ لوگ گولیاں مارتے ہیں لیکن اُنھیں گولیاں خدا دیتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ جو نوجوان یہاں سے گئے تھے اُن میں سے کچھ جلد ہی چل بسے۔ اپنے نئے مقام پر۔ لیکن میں؟ میں اب تک زندہ کھڑی رہی ہوں۔ یقیناً آہستہ آہستہ موت کی سمت بڑھ رہی ہوں۔ بعض اوقات بیزاری طاری

ہو جاتی ہے۔ میں رونے لگتی ہوں۔ ساری بستی خالی پڑی ہے۔ یہاں ہر طرح کے پرندے ہیں۔ وہ ہر جگہ اُڑتے پھرتے ہیں۔ یہاں گوزن بھی ہیں اور وہ سب کچھ جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ [رونے لگتی ہے۔]۔

مجھے ہر بات یاد ہے۔ ہر کوئی اُٹھا اور چلا گیا لیکن وہ یہاں اپنے کتّے اور بلیاں چھوڑ گئے۔ شروع کے چند دِنوں تک میں بستی میں بلیوں کو دُودھ ڈالتی پھری اور کتّوں کے آگے روٹی کا ایک ایک ٹکڑا۔ وہ اپنے باڑوں میں کھڑے اپنے اپنے مالکوں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اُن کا بہت عرصے تک انتظار کرتے رہے۔ بُھوکی بلیاں کھیرے کھانے لگیں۔ وہ ٹماٹر تک کھا جاتیں۔ موسمِ برسات تک میں نے اپنے ہمسائے کے باغیچے کی دیکھ بھال کی، **صحن دربا**ڑے تک کی دیکھ بھال کی۔ اُس کی باڑ گری تو میں نے اُسے دوبارہ ہتھوڑے سے ٹھونک کر ٹھیک کیا۔ میں لوگوں کی منتظر رہی۔ میرے پڑوسی کا ایک کتّا تھا جس کا نام ژُہوچوک تھا۔ ''ژُہوچوک'' میں کہتی۔ ''اگر تمھیں لوگ پہلے نظر آجائیں تو بھونک کر سب سے پہلے مجھے بتانا۔''

ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ مجھے نکالا جا رہا ہے۔ افسر چلّاتا ہے۔ ''خاتون، ہم ہر چیز کو آگ لگا کر دفن کر رہے ہیں۔ باہر نکل آؤ!'' اور وہ مجھے کسی جگہ لے گئے، کسی نامعلوم مقام پر۔ واضح نہیں ہے کہ کہاں۔ وہ شہر تھا نہ گاؤں۔ وہ زمین کا کوئی مقام نہیں تھا۔

ایک زمانے میں —میرے پاس ایک عمدہ بلونگڑا ہوتا تھا۔ واسکا۔ ایک سرما کو چُوہے نہایت بُھوکے تھے اور وہ پے در پے حملے کر رہے تھے۔ کہیں جانے کو جگہ نہیں تھی۔ وہ محفوظ مقامات کے نیچے گھس جاتے۔ ایک چوبی بکسے میں میرے پاس کچھ گندم تھی، انھوں نے بکسے میں سوراخ کر لیا! لیکن واسکا نے میری زندگی بچائی۔ وہ نہ ہوتا تو میں مر جاتی۔ ہم باتیں کرتے، میں اور وہ ساتھ کھانا کھاتے۔ پھر واسکا گُم ہو گیا۔ شاید بُھوکے کتّے اُسے کھا گئے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم۔ وہ ہر وقت ہر جگہ بُھوکے پھرتے تھے جب تک کہ اُنھیں موت نہ آ پکڑتی۔ بلیاں اتنی بُھوکی رہنے لگی تھیں کہ اپنے بچے تک کھا جاتیں۔ گرمیوں میں نہیں لیکن سردیوں کے موسم میں۔ خدا مجھے معاف کرے!

بعض اوقات تو میں پُورے گھر کا چکر بھی نہیں لگا سکتی۔ ایک بُوڑھی عورت کے لیے گرمیوں میں بھی چولہا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں کبھی کبھار پولیس آتی رہتی ہے۔ چیزوں کی تلاشی لیتی ہے۔ وہ میرے لیے روٹی بھی لاتے ہیں۔ لیکن وہ تلاش کیا کر رہے ہیں؟

یہاں بس میں اور بلّی ہیں۔ یہ ایک مختلف بلّا ہے۔ جب ہم پولیس کی آمد کی آواز سُنتے ہیں تو خُوش ہو جاتے ہیں۔ ہم دوڑتے ہیں۔ وہ اِس کے لیے ہڈّیاں لاتے ہیں۔ وہ مجھے پُوچھتے ہیں: ''کیا ہوا اگر ڈاکو آجائیں؟'' ''اُنھیں کیا ملے گا؟ وہ یہاں سے کیا لے کر جائیں گے؟ میری جان؟ کیوں کہ میرے پاس تو بس یہی بچی ہے۔'' وہ اچھے جوان ہیں۔ وہ ہنستے ہیں۔ وہ میرے ریڈیو کے لیے مجھے بیٹری بھی لا دیتے ہیں۔ میں آج کل ریڈیو سُنتی ہوں۔ میں لی یدملّا زیکنا کو پسند کرتی ہوں لیکن اب وہ نہیں گاتی۔ شاید وہ بھی بُوڑھی ہو گئی

ہے، میری ہی طرح۔ میرا میاں کہا کرتا تھا —— وہ کہا کرتا تھا۔ ''رقص ختم ہوا۔ وائلن واپس بکسے میں رکھ دو۔''

میں تمھیں بتاتی ہوں کہ مجھے میرا بِلا کیسے ملا۔ میں اپنا واسکا کھو چکی تھی۔ میں اُس کا ایک دِن، دو دِن، پھر ایک مہینے تک انتظار کیا۔ تو یہ صُورتِ حال تھی۔ میں تنہا تھی۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میں گاؤں بھر میں پھرتی رہتی، دُوسرے لوگوں کے باڑوں میں جا کر پکارتی: واسکا۔ مُورکا! واسکا! مُورکا! شروع شروع میں بہت سے بِلّے آئے اور پھر وہ کہیں غائب ہو گئے۔ موت خیال نہیں کرتی۔ زمین ہر چیز لے لیتی ہے۔ پس میں پھرتی رہتی ہوں، پھرتی رہتی ہوں۔ دو دِنوں تک۔ تیسرے دِن وہ مجھے دُکان کے نیچے ملا۔ ہماری نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ وہ خُوش تھا۔ میں خُوش تھی۔ لیکن وہ کوئی بات نہیں کرتا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں کہتی ہوں۔ ''آؤ گھر چلیں۔'' لیکن وہ وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ میاؤں، میاؤں۔ پس میں پھر کہتی ہوں۔ ''تم اکیلے یہاں کیا کرو گے؟ تمھیں بھیڑیے کھا جائیں گے۔ وہ تمھارے چیتھڑے اُڑا دیں گے۔ آؤ چلیں۔ میرے پاس انڈے ہیں۔ میرے پاس کچھ شحم الخنزیر ہے۔'' لیکن میں اُسے اپنی بات کیسے سمجھاؤں؟ بلّیاں انسانی زبان نہیں سمجھتیں تو وہ میری بات کیسے سمجھ سکتا ہے؟ میں آگے بڑھ جاتی ہوں۔ وہ بھاگ کر میرے پیچھے پیچھے آنے لگتا ہے۔ میاؤں، میاؤں۔ ''میں تمھیں تھوڑی سی شحم الخنزیر کاٹ دوں گی۔'' میاؤں۔ ''ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔'' میاؤں۔ ''میں تمھیں بھی واسکا کہہ کر بلاؤں گی۔'' میاؤں۔ اور اب ہمیں ساتھ رہتے ہوئے دو سردیاں بیت چکی ہیں۔

رات کو مجھے خواب آتا ہے کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ پڑوسن کی آواز ہے۔ ''زینا!'' پھر سکوت چھا جاتا ہے۔ اور پھر دوبارہ۔ ''زینا!''

بعض اوقات میں بیزار ہو جاتی ہوں اور پھر رونے لگتی ہوں۔

میں قبرستان جاتی ہوں۔ میری ماں وہاں ہے۔ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ جنگ کے دوران خسرے کے دانوں سے بھر گئی تھی۔ جس پر ہم اُسے قبرستان لے گئے، دفن کر دیا اور بادلوں سے سُورج نکل آیا۔ اور چمکنے لگا تو چمکتا ہی چلا گیا۔ اِس طرح چمکنے لگا کہ جاؤ اور کھود کر اُسے نکال لو۔ میرا شوہر وہاں ہے۔ فیدیا۔ میں اُن سب کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔ میں تھوڑی دیر آہیں بھرتی ہوں۔ زندوں کی طرح مرے ہوؤں سے بھی باتیں کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اِس میں کوئی فرق نہیں لگتا۔ میں ایک کو بھی سُن سکتی ہوں اور دُوسرے کو بھی۔ جب تنہائی ہو...... اور اُداسی ہو۔ جب تم اُداس ہو۔

ایوان پر وہورووِچ گاورلینکو، وہ ایک اُستاد تھا۔ وہ قبرستان کے بالکل ساتھ رہتا تھا۔ وہ کریمیا چلا گیا تھا۔ وہاں اُس کا بیٹا تھا۔ اُس سے اگلا گھر پیوترا یوانووِچ میوسکی کا تھا۔ وہ ٹریکٹر چلاتا تھا۔ وہ ایک سٹاخانووائٹ تھا۔ جب ہر شخص سٹاخانووائٹ بننے کی تگ و دو میں لگ گیا تو وہ واپس لوٹ آیا۔ اُس کے ہاتھ طلسماتی تھے۔ وہ لکڑی کی جھالر بنا سکتا تھا۔ اُس کا گھر پُوری بستی جتنا بڑا تھا۔ اوہ، مجھے بہت بُرا لگا اور میرا خُون کھولنے لگا جب اُنھوں نے اُس کی بوٹیاں بوٹیاں کیں۔ اُنھوں نے اُسے دفن کر دیا۔ افسر چِلّا رہا تھا: ''بڑی اماں، اِس کے

بارے میں سوچو بھی مت! یہ ہدف پر ہے۔ ''میں آگے بڑھی-- پیوتر چلّانے لگا۔ ''چلی جاؤ بڑی امّاں، یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔'' اُس نے مجھے جانے کے لیے کہا تھا۔ اور اگلا گھر میشا میخالوف کا تھا۔ وہ کھیتوں پر کیتلیاں گرم کرنے کا کام کرتا تھا۔ وہ بہت تیزی سے مرا۔ یہاں سے گیا اور جاتے ہی مر گیا۔ اُس کے بعد والا گھر سٹیپا بائیخوف کا تھا۔ وہ ایک ماہرِ حیوانیات تھا۔ اُسے جلا کر مار ڈالا گیا: بدکار لوگوں نے اُسے رات کے وقت جلا ڈالا۔ سٹیپا زیادہ عرصہ نہیں جیا۔ وہ موگی لوف کے کسی علاقے میں دفن ہے۔ جنگ میں-- ہم نے بہت سوں کو کھویا! واسلی ماکاروویچ کووالوف۔ میکسم نکونورمینکو۔ وہ زندہ دِل اور خوش باش تھے۔ تعطیلات والے دِنوں میں ناچتے گاتے تھے۔ ہارمونیم بجاتے تھے۔ اور اب، یہ جگہ قید خانے جیسی ہے۔ بعض اوقات میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور بستی کا چکر لگاتی ہوں-- خوب، میں اُنھیں کہتی ہوں، کیسی شعاعیں؟ یہاں تتلیاں اُڑ رہی ہیں، شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ اور میرا واسکا کو ہے پکڑ رہا ہے...... [رونے لگتی ہے۔]۔

اوہ، لیوبوچکا، جو میں تمھیں بتا رہی ہوں، کیا تم اُسے سمجھ رہی ہو؟ اپنے غم؟ تم اِسے لوگوں کو بتاؤ گی تب شاید میں یہاں نہیں ہوں گی۔ میں زمین میں ہوں گی۔ جڑوں کے نیچے......

☆☆☆☆

سویتلانا الیگزائی وِچ

ترجمہ: نجم الدّین احمد

وہ جو لوٹ آئے

گومل oblast کے علاقے ناروول یانسک کا اِیلی ایژ یگ نامی گاؤں۔

شریکِ گفتگو: اینا پاظونا آرٹی یوشینکو، اِیوا اَیڈموفنا یوشینکو، واسلی گولائی وچ آرٹی شینکو، سُوجیا گولائی فنا موروز، نادے ژیدہ بوری سوفنا نکولائینکو، الیکسندر فیدروس وچ نکولائینکو، میخائل مارٹنو وچ لِس۔

"اور ہم اِس طرح کے حالات میں جیتے رہے، ہر طرح کے حالات میں زندہ رہے......"

"اور میں اِسے بالکل بھی یاد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ نہایت دہشت ناک ہے۔ اُنھوں نے ہمیں دھکے دے دے کر باہر نکالا، فوجیوں نے دھکے دے کر باہر نکالا۔ بڑی بڑی مشینیں گھومتی پھر رہی تھیں۔ ہر قسم کی زمین پر کام کرنے والی مشینیں۔ ایک بُوڑھا شخص--- وہ پہلے ہی زمین پر گرا پڑا تھا۔ مر رہا تھا۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ 'چل، بس اُٹھ جاؤ' وہ چلّا رہا تھا۔ 'اور قبرستان چلو۔ میں خُود یہ کروں گا۔' اُنھوں نے ہمارے گھروں کے بدلے میں ہمیں کیا دیا؟ کیا؟ دیکھو، یہ کتنی خُوب صُورت جگہ ہے! اِس خُوب صُورتی کی قیمت ہمیں کون ادا کرے گا؟ یہ تفریحی مقام ہوا کرتا تھا!"

"ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر--- بہت زیادہ شور۔ ٹرالیوں والے ٹرک۔ فوجی ٹرک۔ خُوب، میں سمجھا جنگ لگ گئی ہے۔ چینیوں یا امریکیوں کے ساتھ۔"

"میرا شوہر کولخوز کے اجلاس سے گھر آیا۔ وہ کہتا ہے: 'کل ہمارا انخلا ہو گا۔' اور میں پُوچھتی ہوں: 'آلوؤں کا کیا بنے گا؟ ہم نے ابھی تک اُنھیں نہیں نکالا۔ ہمیں وقت ہی نہیں ملا۔' ہمارا پڑوسی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور شروب پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم شروب پی لیتے ہیں تو کولخوز کے چیئرمین کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ 'اب ہم یہاں سے نہیں جا رہے۔ ہم جنگ میں یہاں رہے تو اب شعاعوں میں بھی رہ لیں گے۔ اگر ہمیں خُود کو یہاں دفن بھی کرنا پڑا تو بھی ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے!"

"پہلے پہل ہمارا خیال تھا کہ ہم سب دو تین ماہ کے اندر مر جائیں گے۔ اُنھوں نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ اُنھوں نے ہم پر افواہ سازی سے کام لیا تھا۔ ہمیں دہشت زدہ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے--- ہم زندہ ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے! خدا کا شکر ہے!"

“کسی کو نہیں پتا تھا کہ دُوسری دُنیا میں کیا ہے۔ یہ جگہ بہتر ہے۔ شناسا تو ہے۔”

“ہم چھوڑ کر جا رہے تھے--میں نے اپنی ماں کی قبر سے تھوڑی سی مٹی لی، اُسے ایک چھوٹی سے تھیلی میں ڈالا۔ گھٹنوں پر جھکی: ’ہمیں معاف کر دینا تمھیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔‘ میں وہاں رات کے وقت گئی تھی اور خوف زدہ نہیں تھی۔ لوگ گھروں پر اپنے اپنے نام لکھ رہے تھے۔ درختوں پر، باڑوں پر اور کولتار پر۔”

“فوجیوں نے کتّوں کو مار ڈالا تھا۔ بس اُنھیں گولیاں مار ڈالی تھیں۔ ٹھائیں، ٹھائیں! اُس کے بعد میں نے کسی جان دار کے زندہ ہونے اور چیخنے کی آواز نہیں سُنی۔”

“میں کولخوز میں بریگیڈ کا قائد تھا۔ پینتالیس سال۔ مجھے لوگوں کی حالت پر دُکھ ہو رہا تھا۔ ہم اپنے ہرن ایک نمائش پر ماسکو لے کر گئے تھے، کولخوز نے ہمیں بھیجا تھا۔ ہم گلابی اور کالے رنگ کی ایک سند جیت کر لائے تھے۔ لوگ مجھ سے احترام سے بات کرتے تھے۔ ’واسلی نکولائی وچ، نکولائی وچ۔‘ اور یہاں میں کون ہوں؟ ایک چھوٹے سے گھر میں ایک ضعیف شخص! میں یہیں مر جاؤں گا، عورتیں میرے لیے پانی لائیں گی اور وہ گھر کو گرم کریں گے۔ مجھے لوگوں کا دُکھ ہے۔ میں نے شب کے گیت پر عورتوں کو کھیتوں سے جاتے دیکھا تو میں جانتا تھا کہ اُنھیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے ادائیگی والے دِن چند چھڑیوں کے۔ لیکن وہ گا رہی ہیں......”

“اگر یہ شعاعوں سے بھی زہریلا ہے تو بھی میرا اپنا گھر تو ہے۔ ہمیں دُنیا کے کسی مقام پر کوئی جگہ نہیں چاہیے۔ پنچھی بھی اپنے گھونسلے سے پیار کرتا ہے......”

“میں اضافہ کروں گا: میں اپنے بیٹے کے ہاں ساتویں منزل پر رہتا ہوں۔ میں کھڑکی کے پاس جاتا، نیچے دیکھتا اور سینے پر ہاتھ باندھتا ہوں۔ مجھے خیال گزرتا ہے جیسے میں نے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنی ہے۔ پالتو گھوڑے کی۔ میں ڈر جاتا ہوں۔ بعض اوقات میں اپنے باڑے کا خواب دیکھتا ہوں: میں اپنی گائے کو باندھتا ہوں اور دُودھ دوہنے لگتا ہوں تو دوہتا ہی چلا جاتا ہوں، دوہتا ہی چلا جاتا ہوں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں جاگنا نہیں چاہتا۔ میں اب بھی وہیں ہوں۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔”

“دِن ہم نئے مقام پر گزارتے اور راتیں اپنے گھروں میں--اپنے خوابوں میں۔”

“سرما میں ہماری راتیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ہم بیٹھ جاتے اور شمار کرنے لگتے ہیں: کون کون چل بسا؟”

“میرا خاوند دو ماہ سے چارپائی سے لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولتا تھا اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ پاگل تھا۔ میں صحن میں ٹہلتی، واپس آتی: “بڈھے، کیسے ہو؟” میری آواز پر وہ نظریں اُٹھا کر دیکھتا اور پہلے سے بہتر ہو جاتا۔ جب تک وہ گھر میں رہا، کوئی مر جاتا تو رو نہیں سکتے تھے۔ اِس مداخلت سے اُس کی موت واقع ہو جاتی، اُسے زندہ رہنے کے لیے جنگ لڑنا پڑتی۔ میں الماری سے ایک موم بتی لیتی اور اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ وہ اُسے پکڑ لیتا اور سانس لینے لگتا۔ میں دیکھتی ہوں کہ اُس کی آنکھیں بجھ گئی ہیں۔ میں روئی نہیں۔ میں

نے صرف ایک بات کہی: 'ہماری بیٹی اور میری پیاری ماں کو ہیلو تو کہہ دو۔' میں دُعا کیا کرتی تھی کہ ہم دونوں اکٹھے جائیں۔ دیوتا یہ کام کر جاتے لیکن اُس نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میں زندہ ہوں......''

''لڑکیو، روؤ مت۔ ہم پہلے ہی ہدف پر تھے۔ ہم سٹاخانووائٹس تھے۔ ہم سٹالن کے زمانے میں رہے، جنگ میں رہے۔ اگر میں ہنسی خوشی نہ رہتا اور اپنے آپ کو مطمئن نہ رکھتا تو اتنے طویل عرصے تک جی نہ پاتا۔''

''ایک بار میری ماں نے مجھے سکھایا-- ایک شبیہ لو اور اُسے گھما کر اُلٹا کر دو تو سمجھ لو اُن تین دِنوں کے دوران ایسے ہی حالات تھے۔ تم چاہے جہاں بھی ہوتے ہمیشہ گھر لوٹ آتے۔ میرے پاس دو گائیں اور دو بچھڑے تھے، پانچ سؤر، قازیں، مرغیاں۔ ایک کتا۔ میں اپنا سر تھام کر بس باڑے کے چکر کھائے چلا جاتا۔ اور سیب، بہت سارے سیب! ہر چیز چھن گئی، ہر ایک شے اِسی طرح چلی گئی!''

''میں نے گھر دھویا، چولہا صاف کیا۔ میز پر روٹیاں اور نمک ہونا چاہیے، ایک چھوٹی طشتری اور تین چمچ بھی۔ اِتنے چمچ جتنے گھر میں جی ہوں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم لوٹ سکتے تھے۔''

''شعاعوں کی وجہ سے مرغیوں کی کلغیاں سُرخ سے سیاہ پڑ گئی تھیں۔ پنیر بنایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہم ایک ماہ تک پنیر اور گھر کی بنی پنیر کے بغیر رہے۔ البتہ دُودھ خراب نہیں ہوتا تھا-- اُس میں پاؤڈر ملایا جاتا تھا۔ شعاعوں کی وجہ سے سفید پاؤڈر۔''

''مجھے وہ شعاع اپنے باغ میں ملی تھی۔ سارا باغ سفید ہو گیا تھا، اِتنا سفید جتنا سفید ہو سکتا تھا جیسے اُسے کسی چیز سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ کسی چیز کے تختوں سے۔ مجھے خیال آیا شاید وہ چیز کوئی جنگل سے لایا ہو۔''

''ہم جانا نہیں چاہتے تھے۔ تمام مرد نشے میں مدہوش تھے۔ وہ اپنے آپ کو کاروں کے نیچے گھسیڑ رہے تھے۔ بڑی جماعت کے سرکردہ تمام گھروں میں جا جا کر لوگوں کی منتیں کر رہے تھے کہ وہ چلے جائیں۔ احکامات تھے: 'اپنی کوئی بھی چیز مت چھوڑنا!'''

''مویشیوں کو اُن تین دِنوں کے دوران پانی تک نہیں ملا۔ نہ چارہ۔ یہ قصہ تھا! ایک اخباری نمائندہ آیا۔ نشے میں دُھت دُودھ والیوں نے اُسے قریب قریب مار ہی ڈالا۔''

''سردار ایک فوجی کے ساتھ میرے گھر کے گرد گھوم رہا ہے۔ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے: 'باہر آ جاؤ ورنہ ہم گھر کو آگ لگا دیں گے! لڑکو، مجھے تیل والا ڈبا دو۔' میں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی-- کمبل اکٹھے کر رہی تھی، تکیے جمع کر رہی تھی۔''

''جنگ کے دوران تمام رات بندوقوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ہم نے جنگل میں ایک گڑھا کھودا۔ اُن کے پاس بم ہی بم تھے۔ ہر شے جلا ڈالی--- صرف گھر ہی نہیں بل کہ باغات، چیری کے درخت بھی، ہر چیز۔ جب تک جنگ جاری رہی۔ میں اِسی چیز سے خوف زدہ ہوں۔''

''اُنھوں نے امریکی نمائندۂ نشریات سے دریافت کیا: 'شاید اِس میں چرنوبل کے اسباب ہوں!'

‘یقیناً، لیکن تمھیں اس بنیادی نکتے کو بہت گہرائی میں دفن کرنا پڑے گا۔“

”اُنھوں نے ہمیں نیا مکان دیا۔ پتھروں سے بنا ہوا۔ لیکن، تمھیں پتا ہے، ہم نے سات برسوں میں اُس میں ایک کیل تک نہیں ٹھونکی۔ یہ ہمارا تھا ہی نہیں۔ یہ اجنبی تھا۔ میرا خاوند تو بس روتا ہی رہتا تھا۔ پورے ہفتے وہ کولخوز میں ٹریکٹر پر کام کرتا ہے، اتوار کا انتظار کرتا ہے، پھر اتوار کو دیوار کے ساتھ لیٹ جاتا ہے اور بَین کرنے لگتا ہے......“

”کوئی بھی اب ہمیں زیادہ عرصے تک بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ یہاں نہ دُکان ہے، نہ ہسپتال اور نہ ہی بجلی۔ ہم مٹی کے تیل کی لالٹین کے پاس بیٹھے ہیں یا پھر چاندنی میں۔ اور ہمیں یہ پسند ہے! کیوں کہ ہم اپنے گھر میں ہیں۔“

”شہر میں میری بہو میرے پیچھے اپارٹمنٹ میں چلی آئی اور اُس نے دروازے کی ہتھی اور کُرسی پونچھی۔ یہ سب میری رقم سے خرید کیا ہوا تھا، سارا فرنیچر اور ڈھلّو لی بھی۔ اُس رقم سے جو حکومت نے مجھے گھر اور گائے کے لیے دی تھی۔ جُوں ہی رقم ختم ہوئی ماں کی ضرورت بھی نہ رہی۔“

”ہمارے بچوں نے رقم لے لی۔ باقی افراطِ زر نے لے لی۔ اُنھوں نے ہمیں گھروں کے لیے جتنی رقم دی تھی اُس سے صرف ایک کلو اچھی مٹھائی خریدی جا سکتی تھی، شاید وہ اب اس کے لیے بھی ناکافی ہو۔“

”میں دو ہفتے تک چلتا رہا۔ میری گائے میرے ہم راہ تھی۔ وہ مجھے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں جنگل میں سویا۔“

”وہ ہم سے خوف کھائے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم متعدی ہیں۔ خدا نے ہمیں ہی کیوں سزا دی؟ کیا وہ دیوانہ ہے؟ ہم اب انسانوں کی طرح نہیں رہتے، ہم اب خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان انسان کا قتل کر رہا ہے۔“

”میرے بھتیجے موسمِ گرما میں آیا کرتے تھے۔ اُس پہلی گرمیوں میں وہ نہیں آئے، وہ خوف زدہ تھے۔ لیکن اب وہ آتے ہیں۔ وہ کھانا بھی کھاتے ہیں، اُنھیں کھانے کو جو بھی دیا جائے۔ ’بڑی اماں،‘ وہ کہتے ہیں۔ ’کیا تم نے رابنسن کراوزو کے بارے میں کتاب پڑھی ہے؟ وہ بھی تمھاری طرح تنہا رہتا تھا۔ ایک کلہاڑے اور ایک پھاوڑے کے ساتھ۔ اور اب میرے پاس تخمِ الخنزیر ہے، انڈے ہیں اور دُودھ ہے — یہ سب میرا ہے۔ صرف شکر نہیں ہے — اِسے کاشت نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے پاس اتنی زمین ہے جتنی ہم چاہیں! چاہیں تو ۱۰۰ ایکڑوں پر ہل چلا لیں۔ لیکن حکومت ہے نہ کوئی آقا۔ ہمارے معاملات میں دخل دینے والا کوئی نہیں ہے۔“

”بلّیاں بھی ہمارے ساتھ لوٹ آئیں اور کُتے بھی۔ ہم سب اکٹھے واپس آئے ہیں۔ فوجی ہمیں داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ باغی لشکر۔ لہٰذا ہم رات کے وقت — جنگل کے راستے — کتروں کی طرح داخل ہوئے۔“

“ہمیں حکومت سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس ہمیں اکیلا چھوڑ دے، ہم صرف اِتنا چاہتے ہیں۔ ہمیں دُکان کی ضرورت ہے نہ لاری کی۔ ہم اپنے لیے ڈبل روٹی لینے پیدل جاتے ہیں۔ بیس کلومیٹر دُور۔ بس ہمیں تنہا چھوڑ دے۔ ہم اپنے آپ ہی ٹھیک ہیں۔”

“ہم سب اکٹھے واپس آئے، تین خاندان۔ یہاں کی چیز لُوٹی جا چکی تھی، چُولہے توڑے ہوئے تھے، کھڑکیاں اور دروازے اُکھاڑ کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ لیمپ، بجلی کے بٹن ٹوٹیاں-- وہ ہر چیز لے گئے تھے۔ کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے ہر چیز دوبارہ اپنے اِن ہاتھوں سے لگائی۔ کسی بھی طرح!”

“جب قاز چیختے ہیں تو اِس کا مطلب ہے کہ موسمِ بہار آ گیا۔ کھیتوں کو بیجنے کا وقت آ گیا۔ اور ہم یہاں خالی گھروں میں بیٹھے ہیں۔ کم از کم چھتیں تو سالم ہیں۔”

“پولیس چِلّا چِلّا کر پکار رہی تھی۔ وہ کار میں آئے تھے اور ہم جنگل میں بھاگ گئے تھے۔ جس طرح ہم جرمنوں سے بھاگے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سرکاری وکیل کے ہم راہ آئے تھے۔ وہ خفا ہوا اور پھنکارا۔ وہ ہم پر شِق -۱۰ لگانے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: ‘اُنھیں مجھے ایک سال کے لیے جیل بھجوانے دو۔ میں جیل کاٹوں گا اور لوٹ کر یہیں آؤں گا۔’ اُن کا کام ہی چِلّانا ہے اور ہمارا یہاں چُپ چاپ قیام کرنا۔ میرے پاس تمغہ ہے-- میں کولخوز کا بہترین کاشت کار تھا۔ اور وہ مجھے شِق سے ڈرا رہا تھا۔”

“روزانہ میں اپنے گھر کا خواب دیکھتی تھی۔ میں یہاں واپس آ گئی ہوں: باغ میں کھدائی کر رہی ہوں یا اپنا بستر ٹھیک کر رہی ہوں۔ اور ہر بار مجھے کوئی نہ کوئی چیز ملتی: کبھی جُوتا تو کبھی ننھا سا چُوزہ۔ اور ہر چیز بہتری کے لیے تھی جو مجھے خُوش کر دیتی تھی۔ میں جلد ہی اپنے گھر ہوں گی......”

“راتوں کو ہم خدا کی منّت کرتے ہیں اور دِن میں پولیس کی۔ اگر تم مجھے پُوچھو، ‘کیوں رو رہی ہو؟’ مجھے نہیں پتا کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔ میں خُوش ہوں کہ میں اپنے گھر میں رہ رہی ہوں۔”

“ہم نے ہر طرح کے حالات جھیلے اور اُن میں زندہ رہے......”

“میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ‘پیاری۔’ میں کہتی ہوں۔ ‘میری ٹانگیں حرکت نہیں کرتیں۔ جوڑوں میں درد رہتا ہے۔’ ‘تمھیں اپنی گائے ترک کر دینا چاہیے، بڑی ماں۔ اُس کا دُودھ زہریلا ہے۔’ ‘اوہ، نہیں۔’ میں کہتی ہوں۔ ‘میری ٹانگیں دُکھتی ہیں، گھٹنوں میں درد رہتا ہے لیکن میں گائے نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ مجھے خوراک دیتی ہے۔’”

“میرے سات بچے ہیں۔ وہ سب شہروں میں رہتے ہیں۔ میں اکیلی یہاں ہوں۔ میں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ میں اُن کی تصویروں کے سامنے بیٹھ جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہتی ہوں۔ اکیلی۔ مکمل طور پر تنہا۔ میں نے گھر کو خود رنگ کیا ہے۔ اِس میں رنگ کے چھے ڈبے لگے۔ اور اِس طرح میں جی رہی ہوں۔ میں نے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کو پالا پوسا۔ میرا خاوند جوانی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب میں تنہا ہوں۔”

’’ایک بار ایک بھیڑیے سے میرا سامنا ہو گیا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ ہم ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ سڑک کی ایک طرف چلا گیا اور میں نے دوڑ لگا دی۔ میرا ہَیٹ اُڑ گیا۔ میں بہت دہشت زدہ ہو گیا تھا۔‘‘

’’ہر جانور انسان سے خوف زدہ ہے۔ اگر تم اُسے چھیڑو نہ تو وہ تمھارے گرد چکر لگائے گا۔ تم اِس کے عادی ہو جاؤ گے کہ تم جنگل میں ہو اور تمھیں کوئی انسانی آوازیں سُنائی دیں تو تم اُن کی سمت دوڑ پڑتے ہو۔ لیکن اب لوگ ایک دُوسرے سے چھپتے پھرتے ہیں۔ خدا مجھے جنگل میں کسی بھی آدمی سے ملنے سے محفوظ رکھے!‘‘

’’انجیل میں لکھی ہر بات پُوری ہوتی جا رہی ہے۔ اُس میں ہمارے کولخوز کے بارے میں لکھا ہے اور ہمارے گورباچوف کے بارے میں۔ یہ کہ ایک بڑا حکمران ہو گا جس پر پیدائشی نشان ہو گا اور ایک عظیم سلطنت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ پھر یومِ حساب ہو گا۔ شہروں میں رہنے والا ہر شخص موت کا شکار ہو جائے گا اور صرف ایک دیہاتی بچے گا۔ وہ ایک انسانی پیروں کے نشان دیکھ کر خوش ہو گا۔ خود اُس آدمی کو نہیں صرف اُس کے پیروں کے نشان۔‘‘

’’ہمارے پاس روشنی کے لیے ایک لیمپ ہے۔ مٹّی کے تیل کا ایک لیمپ۔ آہا، اِس عورت نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اگر ہم کسی وحشی سؤر کو مار گرائیں تو ہم اُسے تہہ خانے میں لے جاتے ہیں یا خود ہی دفن کر دیتے ہیں۔ زمین کے اندر گوشت تین دِن تک محفوظ رہتا ہے۔ واڈکا ہم خود بناتے ہیں۔‘‘

’’میرے پاس نمک کے دو تھیلے ہیں۔ ہم حکومت کے بغیر ٹھیک رہیں گے! بہت ساری گیلیاں-- ہمارے اِرد گرد جنگل ہی جنگل ہے۔ گھر گرم ہے۔ لیمپ روشن ہے۔ یہ عمدہ ہے! میرے پاس ایک بکری ہے، ایک میمنا، تین سؤرا اور چودہ مرغیاں۔ زمین-- اِتنی جتنی میں چاہوں، گھاس-- اِتنی جتنی میں چاہوں۔ کنویں میں پانی ہے۔ اور آزادی! ہم خوش ہیں۔ یہ اب کولخوز نہیں رہی، یہ اصل اشتراک ہے۔ ہمیں ایک گھوڑا خریدنے کی ضرورت ہے۔ پھر ہمیں کسی اَور شے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ صرف ایک گھوڑا۔

’’یہ بات ایک رپورٹر نے کہی تھی کہ ہم اپنے گھر نہیں لوٹے ایک صدی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہم فصل کاٹنے کے لیے ہتھوڑا استعمال کرتے ہیں اور گھاس کاٹنے کے لیے درانتی۔ ہم کولتار پر کنک نکالتے ہیں۔‘‘

’’جنگ میں اُنھوں نے ہمیں آگ لگائی تو ہم زیرِ زمین رہے۔ مورچوں میں۔ اُنھوں نے میرے بھائی اور دو بھتیجوں کو قتل کر دیا۔ سب نے بتایا ہے۔ میرے خاندان کے سترہ لوگ کم ہو گئے۔ میری ماں روتی پیٹتی رہی۔ دیہاتوں سے ایک بُوڑھی عورت گزر رہی تھی، جاروب کشی کرتی ہوئی۔ ’تم بَین کر رہی ہو؟‘ اُس نے میری ماں سے پُوچھا۔ ’بَین مت کرو۔ جو دُوسروں کے لیے اپنی جان دیتا ہے، وہ مقدس ہوتا ہے۔‘ اور میں اپنے وطن کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس میں قتل و غارت نہیں کر سکتا۔ میں ایک اُستاد ہوں اور میں نے اپنے بچوں کو دُوسروں سے محبت کرنا پڑھایا ہے۔ میں نے اُنھیں یُوں پڑھایا تھا: ’ہمیشہ فاتح خدا ہی ہو گا۔‘ بچے چھوٹے ہوتے ہیں، اُن کے من سچے ہوتے ہیں۔‘‘

’’چرنوبل تمام جنگوں کی ماں کی مانند ہے۔ اِس سے بچنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ زمین کے نیچے، نہ پانی میں اور نہ ہی فضا میں کوئی جگہ۔‘‘

’’ہم نے ریڈیو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ ہمیں کسی خبر کا کچھ پتا نہیں لیکن زندگی پُرسکون ہے۔ ہم پریشان نہیں ہوتے۔ لوگ آتے ہیں، ہمیں کہانیاں سناتے ہیں--- ہر طرف جنگ لگی ہے۔ اور اشتراکیت جیسی چیز ختم ہو گئی ہے اور ہم سرمایہ دارانہ نظام کے تحت رہ رہے ہیں۔ اور زار سیاہ پڑتا جا رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟‘‘

’’کبھی کوئی جنگلی سؤر باغ میں آ جاتا ہے تو کبھی کبھار کوئی لومڑی۔ لیکن لوگ بہت ہی کم۔ صرف پولیس آتی ہے۔‘‘

’’تم میرا گھر بھی دیکھنے آؤ۔‘‘

’’اور میرا بھی۔ بہت عرصہ ہو گیا میرے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا۔ میں اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں: پیارے خدا! دو مرتبہ پولیس آئی اور میرا چولہا توڑ گئی۔ وہ مجھے ٹریکٹر پر بٹھا کر دُور لے گئی اور میں، میں لوٹ آیا۔ وہ لوگوں کو آنے دیں تو --- وہ سارے اپنے گھٹنوں کے بَل چلتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔ لیکن زندہ لوگ صرف رات کو جنگل کے راستے آ سکتے ہیں۔‘‘

’’ہر شخص زمین کاشت کرنے کے لیے واپس لوٹنا چاہ رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ ہر کوئی اپنی واپسی چاہتا ہے۔ پولیس کے پاس اُن لوگوں کی فہرستیں ہیں جنھیں وہ آنے دے گی لیکن اٹھارہ سال سے کم عمر بچے نہیں آ سکتے۔ لوگ لوٹ آئیں گے تو اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کر بہت خُوش ہوں گے۔ اپنے صحن میں لگے سیب کے درخت کے پاس کھڑے ہو کر بہت خُوش ہوں گے۔ پہلے وہ قبرستان جا کر گریہ زاری کریں گے، پھر اپنے گھروں کے صحنوں میں چلیں آئیں گے۔ وہ وہاں بھی آہ و زاری اور دُعا کریں گے۔ اُن کے پاس شمعیں ہیں۔ وہ اُنھیں باڑوں پر لٹکا دیں گے۔ جیسے قبرستان کی چھوٹی باڑ پر لٹکاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ گھر پر بھی ہار چھوڑیں گے۔ وہ مرکزی دروازوں پر سفید تولیے رکھیں گے۔ بُوڑھی عورت استدعا کرتی ہے: ’بھائیو اور بہنو! صبر سے کام لو۔‘‘‘

’’لوگ انڈے اور رَول اور جو بھی اُن کے پاس ہو قبرستان لے کر جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے خاندان کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اُنھیں پکارتے ہیں: ’بہن، تمھیں ملنے آیا ہوں۔ آؤ کھانا کھائیں۔‘ یا۔ ’امّی، پیاری امّی۔ ابّو، پیارے ابّو۔‘ وہ جنت میں گئی رُوحوں کو پکارتے ہیں۔ جن کے لوگ اِسی برس فوت ہوئے ہیں وہ روتے ہیں اور جن کے پہلے فوت ہوئے تھے وہ نہیں روتے۔ وہ باتیں کرتے ہیں، اُنھیں یاد کرتے ہیں۔ ہر کوئی دُعا مانگتا ہے۔ اور وہ بھی دُعا مانگتے ہیں جنھیں دُعا مانگنا نہیں آتی۔‘‘

’’میں صرف رات کو نہیں روتی۔ مرے ہوؤں کو رات کو نہیں رونا چاہیے۔ جب سُورج ڈوب جاتا ہے تو میں رونا بند کر دیتی ہوں۔ اُنھیں یاد کرتی ہوں، او خدایا! اور اُنھیں اُن کی دُنیا میں چھوڑ دیتی ہوں۔‘‘

’’اگر تم چالبازی سے کام نہیں لیتے تو شکست مقدر رہتی ہے۔ مارکیٹ میں ایک یوکرائنی عورت سیب بیچ رہی تھی۔ ’آؤ، سیب لے لو! چرنوبل کے سیب!‘ کسی نے اُسے کہا یہ بات مت کہو، کوئی نہیں خریدے گا۔ ’فکر مت کریں،‘ وہ کہتی ہے۔ ’وہ پھر بھی خریدیں گے۔ کسی کو اپنی ساس کے لیے ضرورت ہے تو کسی کو اپنے مالک کے لیے۔‘ ‘‘

’’ایک شخص تھا، وہ یہاں جیل سے واپس آیا تھا۔ معافی لے کر۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کی ماں مرگئی تھی، گھر گرا دیا گیا تھا۔ وہ ہمارے پاس آیا۔ ’خاتون، مجھے کچھ روٹی اور شحم الخنزیر دے دو۔ میں تمھاری لکڑیاں پھاڑ دوں گا۔‘ اُسے مل جاتا ہے۔‘‘

’’ملک میں افراتفری مچی ہے-- اور لوگ یہاں لوٹ آتے ہیں۔ وہ دُوسروں سے، قانون سے بھاگ کر آتے ہیں۔ اور وہ تنہا رہتے ہیں۔ حتّٰی کہ اجنبی بھی۔ وہ سخت لوگ ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ذرا بھی دوستانہ پن نہیں۔ اگر وہ نشے میں دھت ہو جائیں تو کسی نہ کسی شے کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں۔ رات کو ہم اپنے بستروں کے نیچے کلہاڑے اور دوشاخہ رکھ کر سوتے ہیں۔ باورچی خانے میں دروازے کے ساتھ ہی ہتھوڑا رکھا ہوتا ہے۔‘‘

’’موسمِ بہار میں یہاں ایک مجنون لومڑی ہوا کرتی تھی-- جب اُس پر جنون کے دورے پڑتے ہیں تو ہم دردہو جاتی ہیں، سچ مچ ہم درد۔ لیکن وہ پانی نہیں دیکھ سکتیں۔ بس اپنے صحن میں پانی کی ایک بالٹی انڈیل دو، پھر سب ٹھیک ہے۔ وہ بھاگ جائے گی۔‘‘

’’یہاں کوئی ٹیلی ویژن نہیں ہے۔ نہ سینما گھر۔ یہاں کرنے کو صرف ایک کام ہے-- اپنی کھڑکی سے باہر تکتے رہنا۔ خُوب، اور عبادت کرتے رہنا، بے شک۔ کبھی یہاں اشتراکی نظام ہوا کرتا تھا لیکن اب صرف خدا ہے۔ پس ہم عبادت کرتے رہتے ہیں۔‘‘

’’ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں خدمات سرانجام دیں۔ میں کٹر اشتراکی ہوں۔ میں ایک سال تک کٹر اشتراکیوں کے ساتھ رہا۔ اور جب ہم نے جرمنوں کو مار بھگایا تھا تو میں سب سے آگے تھا۔ میں نے ریکسٹاگ (Reichstag) پر اپنا نام لکھا: آرٹی یُوشینکو۔ میں نے اشتراکیت کی تعمیر کے لیے اپنا اوورکوٹ اُتار پھینکا۔ لیکن کہاں ہے وہ اشتراکیت؟‘‘

’’اشتراکیت یہاں ہمارے پاس ہے-- ہم بھائیوں اور بہنوں کی طرح رہتے ہیں......‘‘

’’جس برس جنگ شروع ہوئی تو کُکُرمتے ہوئے نہ بیر۔ کیا تم اِس بات پر یقین کر سکتی ہو؟ زمین نے خُود بھی تباہی و بربادی کو محسوس کر لیا تھا۔ ۱۹۴۱ء۔ اوہ، میں اُسے کتنا یاد کرتا ہوں! میں جنگ کبھی نہیں بھلا پایا۔ خبر پھیلی کہ وہ تمام جنگی قیدیوں کو لائیں گے اور آپ اپنے عزیزوں کو پہچان کر لے جا سکتے ہیں۔ ہماری ساری عورتیں دوڑیں! اُس رات کچھ تو اپنوں کو گھر لائے اور کچھ غیروں کو۔ لیکن ہم میں ایک بدمعاش بھی تھا...... وہ

عام لوگوں کی طرح رہتا تھا، شادی شدہ تھا اور اُس کے دو بچے تھے-- اُس نے کمانڈر کو بتا دیا کہ ہم یوکرائنیوں کو لے گئے ہیں، واسکو، شاسکو۔ اگلے روز جرمن موٹر سائیکلوں پر آئے۔ ہم نے اُن کی منتیں کیں، ہم اُن کے سامنے گھٹنوں کے بَل جھک گئے۔ لیکن وہ لوگ اُنھیں لے گئے اور اپنی خودکار بندوقوں سے اُنھیں مار ڈالا۔ نو افراد۔ وہ نوجوان تھے اور بہت ہی اچھے! واسکو، شاسکو......''

''آقا لوگ آئے، وہ چلّاتے رہے لیکن ہم گونگے بن گئے۔ ہم نے ہر طرح کے حالات بھگتے ہیں، ہر طرح کے حالات میں زندہ رہے ہیں......''

''لیکن میں کسی اَور چیز کے بارے میں بات کر رہی ہوں-- میں اِس پر بہت غور کرتی ہوں۔ قبرستان میں کچھ لوگ بلند آواز میں دُعا مانگتے، باقی خاموشی سے۔ اور کچھ لوگ کہتے: 'کھل جا، زرد ریت۔ کھل جا، سیاہ رات!' جنگل تو کھل سکتا ہے لیکن ریت کبھی نہیں کھلتی۔ میں آہستگی سے پُوچھتی۔ 'ایوان، میں کیسے جیوں؟' لیکن وہ کبھی مجھے جواب نہیں دیتا، نہ اِس طرح نہ اُس طرح۔''

''میرا اپنا کوئی نہیں ہے جسے میں روؤں البتہ میں سب کے لیے روتا ہوں۔ اجنبیوں تک کے لیے۔ میں قبروں پر جاتا ہوں اور اُن سے باتیں کرتا ہوں۔''

''میں کسی سے نہیں ڈرتا-- مُردوں سے بھی نہیں، جانوروں سے بھی نہیں، کسی سے نہیں۔ میرا بیٹا شہر سے آتا ہے۔ وہ مجھ پر جنونی ہو جاتا ہے۔ 'تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اگر کسی لٹیرے نے تمھیں قتل کر ڈالا تو کیا ہو گا؟' لیکن وہ مجھ سے کیا لے گا؟ صرف چند تکیے ہی تو ہیں۔ ایک سادہ سے گھر میں چند تکیے ہی سب سے اہم فرنیچر ہیں۔ اگر کوئی چور گھسنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو جیسے ہی وہ کھڑکی میں اپنا سر اُٹھائے گا میں کلہاڑے سے اُس کا سر تن سے جُدا کر دوں گا۔ ہم اِس طرح یہاں کرتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ شاید وہاں کوئی اَور ہے لیکن وہاں اُوپر کوئی ہے ضرور۔ اور میں زندہ ہوں۔''

''چرنوبل میں تباہی مچی، کیوں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے اپنے سائنس دانوں کا قصور تھا۔ اُنھوں نے خدا کی داڑھی نوچی تھی اور اب وہ کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ لیکن ہم تو وہ لوگ ہیں جو عبادت کرتے ہیں۔''

''ہم نے کبھی اچھی زندگی نہیں گزاری۔ نہ سکون سے گزاری۔ ہم ہمیشہ خوف زدہ ہی رہے۔ جنگ سے فوراً پہلے وہ لوگوں کو گھسیٹتے۔ وہ کالی کاروں میں آئے تھے اور کھیتوں سے ہمارے لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ آج تک واپس نہیں آئے۔ ہم نے ہمیشہ خوف زدگی ہی میں زندگی بسر کی ہے۔''

''لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ فصل اچھی ہوتی ہے۔ ہم نوابوں کی طرح رہتے ہیں۔''

''میرے پاس صرف ایک چیز ہے، میری گائے۔ اگر وہ ایک اَور جنگ نہ لگائیں تو میں اُسے اُنھیں دے دوں گا۔ دیکھو، مجھے جنگ سے کتنی نفرت ہے!''

''ہمارے پاس یہاں جنگوں کی ماں ہے-- چرنوبل۔''

”اور کوئل گوگو کر رہی ہے، میگ پائی چہچہا رہے ہیں، چکارے دوڑ رہے ہیں۔ کیا وہ انھیں دوبارہ پیدا کر لیں گے-- کسے پتا ہے؟ ایک صبح میں نے باہر باغ میں دیکھا، سؤر زمین کھود رہے تھے۔ وہ جنگلی تھے۔ تم لوگوں کو نئی جگہ بسا لو گے لیکن گوز اور سؤروں کو نہیں بسا سکتے۔ پانی سرحدوں کو نہیں مانتا، یہ زمین پر بھی چلتا ہے اور زمین کے اندر بھی۔“

”لڑکیو، اِس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اِس سے دُکھ ہوتا ہے۔ آؤ خاموش ہو جائیں۔ وہ خاموشی سے تمھارے تابوت لاتے ہیں محتاط ہو کر۔ وہ نہیں چاہتے کہ تابوت دروازے یا پلنگ سے ٹکرا کر آواز پیدا کرے، نہیں چاہتے کہ کسی چیز کو چھوئیں یا دستک دیں۔ ورنہ اگلے مرنے والے شخص کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ انھیں زندگیاں برباد کرنا آتی ہیں۔ اے میرے خدا۔ اُن کی بادشاہی ہو۔ آؤ، اُن کے لیے دُعا کریں جو معلوم نہیں کہاں دفن ہیں۔ ہمارے پاس یہاں سب کچھ ہے-- قبریں۔ ہر طرف قبریں ہی قبریں۔ کوڑا اُٹھانے والے ٹرک اور بلڈوزر کام کر رہے ہیں۔ گھر ڈھے رہے ہیں۔ گورکن مشقت کر رہے ہیں۔ انھوں نے سکول دفنا دیے، ہیڈ کوارٹرز اور غسل خانے بھی۔ یہ وہی دُنیا ہے لیکن لوگ مختلف ہیں۔ ایک بات کا مجھے علم نہیں ہے: کیا لوگوں کی رُوحیں ہوتی ہیں؟ کس قسم کی ہوتی ہیں؟ اور وہ خود کو کس طرح اگلی دُنیا میں تطبیق کرتے ہیں؟ میرے دادا کو مرنے میں تین دِن لگے۔ میں چُولہے کے پیچھے چھپی رہی اور انتظار کرتی رہی: وہ اپنے جسم کا کس طرح تطابق کر پائے گا؟ میں گائے دوہنے گئی-- واپس آتی ہوں، اُسے پکارتی ہوں، وہ کھلی آنکھیں لیے پڑا ہے۔ اُس کی رُوح پرواز کر گئی تھی۔ یا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر ہم کیسے ملیں گے؟“

”ایک بُڑھیا، وہ اعلان کرتی ہے کہ ہم لافانی ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں: اے خدا، ہمیں اپنی زندگی کی مصیبتوں میں زندہ رہنے کی ہمت عطا فرما۔“

☆☆☆☆

سویتلانا الیگزانی وِچ

ترجمہ: نجم الدّین احمد

وطن

شریکِ گفتگو: خاندان ۔ ماں اور بیٹی + ایک مرد (لڑکی کا خاوند) جو ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔

بیٹی:

پہلے پہل میں دِن رات روتی رہتی تھی۔ میں رونا اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ ہم تاجکستان سے ہیں، دوشنبے سے۔ وہاں جنگ لگی ہوئی تھی۔

مجھے اب اِس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہیے۔ میں حاملہ ہوں -- میں حمل سے ہوں۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں گی۔ ایک روز وہ بس پر سوار ہو کر ہمارے پاسپورٹوں کی جانچ پڑتال کے لیے آتے ہیں۔ سوائے خُودکار اسلحے کے، باقاعدگی سے آنے والے لوگ۔ وہ دستاویزات بغور دیکھتے ہیں اور پھر لوگوں کو دھکے دے دے کر بس سے باہر نکالتے ہیں اور دروازے سے نکلتے ہی اُنھیں گولیاں مار دیتے ہیں۔ وہ اُن سے پُوچھ گُچھ بھی نہیں کرتے۔ یہ میرے لیے سدا ناقابلِ یقین رہے گا۔ لیکن میں نے یہ دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح اُنھوں نے دو مَردوں کو نکالا، ایک نوجوان تھا، وجیہہ، اور وہ اُنھیں پکار پکار کر کچھ کہہ رہا تھا۔ تاجک میں، رُوسی میں۔ وہ پکار رہا تھا کہ اُس کے ہاں حال ہی میں بچے نے جنم لیا ہے۔ گھر میں اُس کے تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ لیکن وہ بس قہقہے لگاتے رہے۔ وہ بھی نوجوان تھے، نہایت نوجوان۔ سوائے خُودکار اسلحے کے، باقاعدہ آنے والے لوگ۔ وہ نیچے گر گیا۔ اُس نے اُن کے جُوتے چُومے۔ ہر شخص ساکت و صامت تھا، پُوری کی پُوری بس۔ پھر ہم آگے چلے گئے اور ہم نے ٹھاہ، ٹھاہ سُنی۔ میں پیچھے مُڑ کر دیکھنے سے خوف زدہ تھی۔

[رونے لگتی ہے۔]

مجھے اِس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہیے۔ میں حمل سے ہوں۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں گی۔ پھر بھی صرف ایک بات: میرے نام کا آخری حصہ مت لکھیں۔ میں سوِیتلانا ہوں۔ اب وہاں میرے عزیزواقارب ہیں۔ وہ اُنھیں قتل کر ڈالیں گے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ اب کبھی جنگ نہیں ہوگی۔ اِتنا بڑا ملک، میں سوچتی تھی، میرا پیارا ملک۔ عظیم ترین! سوویت کے زمانے میں وہ ہمیں بتاتے تھے کہ ہم غربت اور کسمپرسی کی زندگی اِس لیے بسر کر رہے ہیں کیوں کہ ایک بڑی جنگ لڑ رہے ہیں اور لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن اب ہمارے پاس

بہت بڑی فوج ہے، کوئی دوبارہ ہمیں چھیڑنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکے گا! لیکن پھر ہم ایک دُوسرے ہی کو گولیاں مارنے لگ گئے۔ یہ اُن جنگوں جیسی جنگ نہیں تھی، جسے میرے دادا یاد کیا کرتے تھے کہ وہ ہر وقت جرمنی کی سمت مارچ کرتے رہتے تھے۔ اب تو ہمسائے ہمسائے کو مار رہے ہیں، جو لڑکے اکٹھے سکول جایا کرتے تھے اب ایک دُوسرے کو قتل کر رہے ہیں اور اُن ہی لڑکیوں سے زنا بالجبر کر رہے ہیں جن کے ساتھ وہ سکول میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہر شخص جنونی ہو گیا ہے۔

ہمارے شوہر چپ ہیں۔ یہاں بیٹھے مرد خاموش ہیں۔ وہ آپ سے ایک لفظ تک نہیں کہیں گے۔ جب وہ چھوڑ کر آ رہے تھے تو لوگ اُنھیں لعن طعن کر رہے تھے کہ وہ عورتوں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ کہ وہ بزدل ہیں۔ اپنے وطن سے غداری کر رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ بُری بات ہے؟ کسی کو گولی نہ مارنا بُری بات ہے؟ میرا خاوند تاجک ہے۔ اِس کے بارے میں گمان تھا کہ وہ جا کر لوگوں کا قتل و غارت کرے گا۔ لیکن اِس نے کہا۔ ''آؤ یہ جگہ چھوڑ جائیں۔ میں لام پر نہیں جانا چاہتا۔ مجھے کسی خُودکار بندوق کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اِس کا وطن ہے لیکن یہ اُسے چھوڑ آیا کیوں کہ وہ کسی دُوسرے تاجک کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا، اُسی طرح کے تاجک کو جو یہ خُود ہے۔ لیکن یہ یہاں تنہا ہے۔ اِس کے بھائی اب بھی وہیں ہیں، جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایک پہلے ہی قتل ہو چکا ہے۔ اِس کی ماں وہیں رہتی ہے۔ بہنیں بھی۔ ہم یہاں دوشنبے کی ٹرین پر سوار ہو کر آئے۔ کھڑکیاں ٹُوٹی ہوئی تھیں۔ وہ سرد اور یخ تھی۔ کسی نے گولیاں تو نہیں چلائیں لیکن اُن لوگوں نے ٹرین کو پتھر ضرور مارے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ''رُوسیو، دفع ہو جاؤ! غاصبو! ہماری لُوٹ مار بند کرو!'' لیکن یہ تاجک ہے اور اِسے بھی یہ سب سننا پڑا۔ ہمارے بچوں نے بھی یہ سب سنا۔ ہماری بیٹی پہلے درجے میں تھی۔ وہ ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی، ایک تاجک لڑکے سے۔ وہ سکول سے لوٹی: ''امی، میں کیا ہوں؟ تاجک یا رُوسی؟'' میں کیا کہتی؟

مجھے اِس بارے میں بات نہیں کرنا چاہیے...... لیکن میں آپ کو بتاؤں گی۔ پامر تاجک کلیاب تاجکوں سے لڑ رہے ہیں۔ وہ دونوں ہی تاجک ہیں۔ اُن کا ایک ہی قرآن ہے، ایک ہی مذہب ہے لیکن کُلیاب پامروں کو قتل کرتے ہیں اور پامر کُلیابوں کو۔ پہلے وہ چوک میں جاتے ہیں، پکارتے ہوئے، دُعا بھی کرتے ہوئے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ سو میں بھی چلی گئی۔ میں نے ایک بُوڑھے سے پُوچھا: ''آپ کس بات پر احتجاج کر رہے ہیں؟'' اُنھوں نے بتایا۔ ''پارلیمنٹ کے خلاف۔ اُنھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ نہایت بُرا فرد ہے، یہ پارلیمنٹ۔'' پھر چوک خالی ہو گیا اور اُنھوں نے گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ اچانک ہی وہ ایک مختلف ملک بن گیا، ایک اجنبی ملک۔ مشرق! اِس سے قبل ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم اپنے وطن میں رہ رہے ہیں۔ سوویت قوانین کے تابع۔ وہاں بہت سے رُوسیوں کی قبریں ہیں لیکن اُن پر رونے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ رُوسی قبرستانوں میں مویشی چراتے ہیں اور بکریاں بھی۔ بُوڑھے رُوسی اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں، گوڑے میں پھینکے ہوئے ڈبوں کے بیچ۔

میں نے ایک زچہ بچہ وارڈ میں نرس کا کام کیا ہے۔ میری رات کی ڈیوٹی تھی۔ ایک عورت کو پیدائش ہو رہی تھی۔ وہ ایک مشکل پیدائش تھی اور وہ آہ و بکا کر رہی تھی -- اچانک ایک چھوٹی نرس اندر داخل ہوئی۔ وہ دستانے پہنے ہوئے تھی نہ ہی عبا۔ کیا ہو رہا تھا؟ زچہ بچہ وارڈ میں یوں آنا؟ ’’لڑکیو، کچھ لوگ گھس آئے ہیں! اُنھوں نے نقاب لگائے ہوئے ہیں اور اُن کے پاس بندوقیں ہیں۔‘‘ پھر وہ اندر آ گئے۔ ’’ہمیں دوائیں دو اور الکوحل بھی!‘‘ ’’یہاں دوائیں ہیں نہ الکوحل۔‘‘ اُنھوں نے ڈاکٹر کو دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا -- فوراً دو! اور پھر پیدائش کے مرحلے سے گزرنے والی عورت نے مسرت سے سکون بھی آہ نکالی۔ اور بچہ رونے لگا۔ وہ ابھی دُنیا میں آیا ہی تھا۔ اور وہ ڈاکو ہمیں پوچھنے لگے: یہ کیا ہے، کلیاب یا پامر؟ لڑکا یا لڑکی نہیں بل کہ کلیاب یا پامر! ہم کچھ نہیں کہتے۔ وہ چلّانے لگتے ہیں: ’’یہ کیا ہے؟‘‘ ہم پھر کچھ نہیں بولتے۔ تو وہ غصے سے بچے پر جھپٹتے ہیں۔ اُسے زمین پر آئے ہوئے شاید پانچ یا دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے اور اُنھوں نے اُسے کھڑکی سے باہر پھینک مارا۔ میں نرس ہوں۔ میں نے اُس سے پہلے کبھی کسی بچے کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور یہاں -- مجھے اُسے یاد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ [رونے لگتی ہے۔] اِس کے بعد تم کس طرح زندہ رہ سکتے ہو؟ تم سے کس طرح بچے پیدا کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ [روتی ہے۔]

اُس کے بعد زچہ بچہ وارڈ میں، میرے ہاتھوں کی جلد اُترنے لگی۔ میری نسیں پھول گئیں۔ اور میں ہر شے سے بے نیاز ہو گئی۔ میں بستر سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ [روتی ہے۔] مجھے ہسپتال لے جایا جاتا۔ اور پھر واپس لایا جاتا۔ لیکن تب میں خود حمل سے تھی۔ میں بچہ جنم نہیں دے سکتی تھی۔ پس ہم یہاں آ گئے۔ بیلارس میں۔ ناروفلیا میں۔ چھوٹا سا چُپ چپیتا قصبہ۔ اور مجھ سے اب کچھ مت پوچھنا۔ میں نے تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ [روتی ہے۔] ٹھیرو۔ میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں۔ میں خدا سے خوف زدہ نہیں۔ میں انسان سے وحشت زدہ ہوں۔ شروع میں ہم نے لوگوں سے دریافت کیا: ’’شعاعیں کہاں ہیں؟‘‘ ’’دیکھو، تم کہاں کھڑی ہو؟ وہیں پر ہیں جہاں تم کھڑی ہو۔‘‘ تو یہ ہر جگہ ہیں۔ [رونے لگتی ہے۔] بہت سے گھر خالی پڑے ہیں۔ لوگ چلے گئے۔ وہ سہمے ہوئے تھے۔

لیکن یہاں میں اُس طرح خوف زدہ نہیں ہوں جس طرح وہاں تھی۔ ہمیں بے وطن کر دیا گیا ہے، ہم کسی کے نہیں ہیں۔ جب اُنھیں اجازت ملی تو تمام جرمن واپس چلے گئے، تاتار کریمیا چلے گئے لیکن کسی کو رُوسی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کیا آس رکھیں؟ ہم کس کا انتظار کریں؟ رُوسیوں نے کبھی اپنی عوام کی حفاظت نہیں کی کیوں کہ یہ بہت بڑا، لامحدود ملک ہے۔ اور دیانت دارانہ بات ہے کہ میں رُوس کو اپنا وطن نہیں سمجھتی۔ ہم مختلف طریقے سے پلے بڑھے تھے، ہمارا وطن تو سوویت یونین ہے۔ اب یہ سمجھنا دشوار ہے کہ آخر کسے محفوظ رکھا جائے؟ کم سے کم یہاں کوئی بندوقوں سے تو نہیں کھیلتا اور یہ اچھی بات ہے۔ اُنھوں نے ہمیں یہاں گھر دیا اور میرے میاں کو ملازمت دی ہے۔ ہم نے پیچھے اپنے دوستوں کو خط لکھا اور وہ کل ہی یہاں آئے ہیں۔ ہمیشہ کے

لیے ۔ وہ رات کے وقت پہنچے تھے اور سٹیشن سے باہر نکلنے سے ڈر رہے تھے ۔ انھوں نے ساری رات سٹیشن ہی پر گزاری، اپنے سُوٹ کیسوں پر بیٹھ کر اور بچوں کو باہر نہیں نکلنے دیا ۔ پھر انھوں نے دیکھا: لوگ سڑکوں پر آ جا رہے ہیں، ہنس بول رہے ہیں، تمباکو نوشی کر رہے ہیں ۔ انھوں نے انھیں ہماری گلی بتائی، انھیں بحفاظت ہمارے گھر پہنچا دیا گیا ۔ انھیں اس پر یقین ہی نہیں آیا ۔ کیوں کہ پیچھے تو ہم عام زندگی بسر کرنا ختم کر چکے ہیں ۔ یہاں وہ صبح اُٹھے اور دُکان پر گئے ۔ انھوں نے مکھن دیکھا اور بالائی دیکھی ۔ ۔ ۔ وہاں دُکان سے، انھوں نے ہمیں بتایا، انھوں نے بالائی کی پانچ بوتلیں خریدیں اور وہیں پی گئے ۔ لوگ اُن کی طرف یُوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہوں ۔ لیکن انھوں نے دو سال سے بالائی یا مکھن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی ۔ تاجکستان میں تم روٹی نہیں خرید سکتے ۔ وہاں جنگ ہے ۔ جس نے جنگ نہیں دیکھی اُسے یہ سمجھانا ممکن نہیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے ۔

وہاں میری رُوح مُردہ ہو گئی تھی ۔ میں کسی بے رُوح شے ہی کو جنم دیتی ۔ یہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں اور گھر بھی خالی پڑے ہوئے ہیں ۔ ہم جنگل کے نزدیک رہتے ہیں ۔ مجھے لوگوں کا زیادہ ہجوم پسند نہیں ہے ۔ جیسے ٹرین سٹیشن پر ہوتا ہے یا زمانۂ جنگ میں ۔ [پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگتی ہے اور بولنا بند کر دیتی ہے ۔]

ماں:

جنگ ۔ ۔ ۔ صرف یہی چیز ہے جس کے متعلق میں بات کر سکتی ہوں ۔ ہم یہاں کیوں آئے؟ چرنوبل میں؟ کیوں کہ یہاں ہمارا کوئی تعاقب نہیں کرتا ۔ کوئی ہمیں اس دھرتی سے بے دخل نہیں کرے گا ۔ اب یہ دھرتی کسی کی نہیں ہے ۔ خدا نے اِسے واپس لے لیا ہے ۔ لوگوں نے اِسے ترک کر دیا ہے ۔

میں دوشنبے میں ٹرین سٹیشن کی نائب سربراہ تھی ۔ وہاں ایک اَور بھی نائب سربراہ تھا، ایک تاجک ۔ ہمارے بچے اکٹھے پلے بڑھے، سکول گئے، ہم سب اکٹھے تعطیلات مناتے تھے: سالِ نو، مے ڈے ۔ ہم اکٹھے بیئر پیتے تھے، اکٹھے کھانا کھاتے تھے ۔ وہ مجھے کہتا تھا: "بہن، میری بہن، میری رُوسی بہن ۔" پھر ایک روز وہ آتا ہے اور، ہم ایک ہی دفتر میں بیٹھتے تھے، میری میز کے سامنے رُک کر چلّاتا ہے:

"تم کب اپنے رُوس جا رہی ہو؟ یہ ہمارا وطن ہے ۔"

میں نے سوچا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی ۔ میں اُس پر لپکی ۔

"تمھارا کوٹ کہاں سے آیا ہے؟"

"لینن گراڈ ۔" وہ بولا ۔ وہ حیران رہ گیا تھا ۔

"اِس رُوسی کوٹ کو اُتار دو، کتیا کے بچے!" اور میں نے اُس کا کوٹ پھاڑ ڈالا ۔ "تمھارا ہیٹ کہاں کا ہے؟ تم نے مجھے شیخی ماری تھی کہ اِسے سائبیریا سے بھیجا گیا ہے! اِسے اُتارو تم! اور قمیص! اور پتلون! یہ دونوں ماسکو میں بنی ہیں ۔ یہ بھی رُوسی ہیں!"

میں اُسے زیر جامے تک عریاں کر ڈالتی ۔ وہ ایک طویل القامت شخص تھا ۔ میں اُس کے کندھوں تک

پہنچتی تھی لیکن میں نے اُس کے بدن کی ہر چیز نوچ پھینکی۔ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ وہ چیخ رہا تھا: ’’مجھ سے دُور رہو۔ تم پاگل ہو!‘‘

’’نہیں، مجھے ہر وہ چیز واپس کر دو جو میری ہے۔ وہ رُوسی ہے! میں اُسے واپس لوں گی۔‘‘ میں قریب قریب جنونی ہو گئی تھی۔

’’مجھے اپنے موزے دو! اپنے جُوتے دو!‘‘

ہم شب و روز کام کیا کرتے تھے۔ ٹرینیں دیہی علاقوں کو جاتی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ بہت سے رُوسی چھوڑ کر چلے گئے تھے--- ہزاروں، لاکھوں۔ رُوس ابھی ایک تھا۔ میں صبح دو بجے جانے والی ٹرین دیکھتی ہوں اور وہاں اب بھی ہال میں گرگان طیوبے گاؤں کے کچھ بچے موجود تھے۔ وہ ٹرین پر سوار نہیں ہوئے تھے۔ میں اُنھیں ڈھانپتی ہوں، چھپاتی ہوں۔ دو آدمی میری طرف آتے ہیں۔ وہ خود کار بندوقیں لیے ہوئے ہیں۔

’’اوہ۔ لڑکو، تم کیا کر رہے ہو؟‘‘ میرا دِل دھک کرنے لگتا ہے۔

’’یہ تمھارا قصور ہے۔ تمھارے سارے دروازے چوپٹ ہیں۔‘‘

’’میں ٹرین روانہ کر رہی تھی۔ مجھے دروازے بند کرنے کا موقع نہیں ملا۔‘‘

’’وہاں وہ لڑکے کون ہیں؟‘‘

’’وہ ہمارے ہی ہیں، دوشنبے کے۔‘‘

’’وہ گرگانی تو نہیں؟ کلیاب تو نہیں؟‘‘

’’نہیں نہیں۔ وہ ہمارے ہیں۔‘‘

پس وہ چلے گئے اور اگر وہ ہال کھول کر دیکھ لیتے تو؟ وہ اُنھیں ......اور مجھے بھی کیوں کہ وہ اِسی کام پر مامور تھے، ایک گولی سر کے آرپار۔ وہاں ایک ہی حکومت تھی--- آدمی کے پاس بندوق ہو۔ صبح ہوتے ہی میں نے بچوں کو اُستراخان جانے والی ٹرین پر چڑھا دیا۔ میں نے کنڈکٹروں سے کہا کہ وہ اُنھیں اِس طرح لے جائیں جس طرح وہ تربوز لے کر جاتے ہیں، دروازہ بالکل نہ کھولیں۔ [خاموشی۔ پھر دیر تک روتی رہتی ہے۔] کیا لوگوں سے زیادہ دہشت کرڈالنے والی کوئی اَور چیز بھی ہے؟ [دوبارہ خاموشی۔]

ایک دفعہ کا ذکر ہے، تب میں یہیں رہا کرتی تھی، میں سڑک پر جا رہی تھی کہ میں نے پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنا شروع کر دیا کیوں کہ مجھے لگا تھا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ وہاں ایک دِن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے موت کے بارے میں نہ سوچا ہو۔ میں ہمیشہ گھر سے صاف ستھرا لباس پہن کر نکلتی تھی، دھوبی سے تازہ دُھلا ہوا بلاؤز، سکرٹ اور زیر جامے۔ صرف اِس لیے کہ میں ماری جاؤں گی۔ اب میں تنہا جنگل میں چلی جاتی ہوں اور کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ جنگل میں لوگ نہیں ہیں، ایک ذی رُوح بھی نہیں۔ میں ٹہلتی جاتی ہوں اور حیران ہوتی رہتی ہوں کہ کیا وہ سب واقعی میرے ساتھ ہوا تھا یا نہیں؟ بعض اوقات مجھے کوئی شکاری مل جاتا ہے: اُن کے

پاس بندوقیں، ایک کُتا اور ایک ڈوسی میٹر ہوتا ہے۔ اُن کے پاس بندوقیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ دُوسروں جیسے نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کا شکار نہیں کھیلتے۔ اگر کبھی مجھے گولی چلنے کی آواز آئے تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ وہ کسی کوّے کو گولی مار رہے ہیں یا پھر کسی خرگوش کے تعاقب میں ہیں۔ [خاموشی۔] اس لیے میں یہاں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں زمین سے یا پانی سے خوف نہیں کھاتی، مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہاں تو ایک شخص مارکیٹ جاتا ہے اور سوڈالر کے عوض خُود کار اسلحہ خرید لیتا ہے۔

مجھے ایک شخص یاد آ رہا ہے، ایک تاجک شخص۔ میں نے اُسے ایک آدمی کا تعاقب کرتے دیکھا۔ وہ ایک آدمی کا تعاقب کر رہا تھا! وہ جس طرح دوڑ رہا تھا، جس طرح ہانپ رہا تھا اُس سے میں بتا سکتی تھی کہ وہ اُسے جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن دُوسرا بچ نکلا۔ وہ چھپ گیا۔ اور وہ واپس آ گیا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اُس نے پُوچھا۔ "مادام، مجھے یہاں کہیں قریب پانی کہاں سے مل سکتا ہے؟" وہ یُوں عام لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ سٹیشن پر ہم نے پانی کی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی، میں نے اُسے وہ دِکھا دی۔ پھر میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی: "تم ایک دُوسرے کے تعاقب میں کیوں ہو؟ تم قتل و غارت کیوں کر رہے ہو؟" اور اُس نے یُوں دیکھا جیسے شرمندہ ہو گیا ہو۔ "ٹھیک ہے مادام۔ اِتنا اُونچا مت بولو۔" لیکن جب وہ اکٹھے ہوتے ہیں تو مختلف ہوتے ہیں۔ اگر وہ دو یا تین ہوتے مجھے دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیتے۔ جب تم دونوں اکیلے ہو تو تم بات کر سکتے ہو۔

ہم دوشنبے سے تاشقند پہنچے لیکن ہمیں آگے منسک جانا تھا۔ ٹکٹیں تھی نہیں۔۔۔ ایک بھی نہیں۔ اُنھوں نے بڑی ہوشیاری سے یہ طریقہ اپنایا ہوا تھا۔ جب تک تم رشوت نہ دیتے اور جہاز پر ہوتے، نا ختم مسائل تھے: یہ بہت وزنی ہے، بہت زیادہ حجم ہے، تم اِسے نہیں لے جا سکتے، تمھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے میری ہر چیز دو مرتبہ پیمانے پر رکھی اور جب مجھے ادراک ہوا کہ کیا ہو رہا ہے تو میں نے اُنھیں کچھ رقم دی۔ "بحث کی بجائے یہی کام پہلے کر لیتیں۔" "ہر چیز نہایت سادہ ہے! ہمارے کنٹینر، اُن کا وزن دو ٹن ہوتا ہے، وہ ہم سے سامان اُترواتے ہیں۔" "تم جنگ والے علاقے سے آ رہے ہو، شاید تمھارے سامان میں کوئی آتش گیر مادہ ہو؟ ماری جوآنا؟" اُنھوں نے ہمیں وہاں دو راتیں رکھا۔ میں سٹیشن کے باس کے پاس گئی لیکن انتظار گاہ میں میری ملاقات ایک اچھی خاتون سے ہو گئی۔ اُس نے مجھے بتایا: "تم یہاں سے کہیں نہیں جا پاؤ گی۔ تم انصاف مانگو گی۔ اِس دوران وہ تمھارے کنٹینر کو میدان میں اُلٹا دیں گے اور تمھاری ہر شے ہتھیا لیں گے۔" "تو ہم کیا کریں؟" ہم نے تمام رات اُس میں سے سامان چننے میں گُزاری۔ کپڑے، کچھ گدے، ایک پُرانا ریفریجریٹر، کتابوں کے دو تھیلے۔ "تم نہایت قیمتی کتابیں لے کر جا رہی ہو؟" ہم نے دیکھا: چرنی شیوسکی کی کیا کِیا جانا چاہیے؟ شولوکوف کی دوشیزہ دھرتی اُلٹ دی گئی۔ ہم ہنسنے لگے۔ "تمھارے پاس کتنے ریفریجریٹر ہیں؟" "صرف ایک، اور وہ بھی ٹُوٹ گیا ہے۔" "تم اجازت نامہ کیوں نہیں لائیں؟" "ہمیں کیا پتا تھا؟ یہ پہلی مرتبہ

ہے کہ ہم جنگ کے علاقے سے بھاگ رہے ہیں۔ ''ہم نے ایک ہی بار میں دو وطن کھو دیے ---تاجکستان اور سوویت یونین۔

میں جنگل میں گھومتی اور سوچتی رہتی ہوں۔ ہر کوئی ہمیشہ ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ لیکن میرا دِل نہیں کرتا۔

ہماری ایک زندگی تھی ......ایک مختلف زندگی۔ مجھے ایک اہم شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ میرے پاس فوج کا عہدہ تھا، ٹرینوں والے ٹروپس کی لیفٹیننٹ کرنل۔ یہاں میں تب تک بے روزگار رہی جب تک مجھے ٹاؤن کونسل میں صفائی کا کام نہ مل گیا۔ میں فرش دھوتی ہوں۔ یہ زندگی گُزر گئی اور مجھ میں اتنی ہمّت نہیں کہ دُوسری گزار سکوں۔ یہاں کچھ لوگوں کو ہمارے لیے دُکھ محسوس ہوتا ہے، باقی ناخُوش ہیں۔ ''پناہ گزین آلو چرا رہے ہیں، وہ رات کو آلو کھود نکالتے ہیں۔'' میری ماں بتاتی ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران لوگوں کو ایک دُوسرے کے لیے زیادہ دُکھ محسوس ہوتا تھا۔ حال ہی میں اُنھیں جنگل سے ایک گھوڑا ملا ہے جو وحشی ہو گیا تھا۔ وہ مرا ہوا تھا۔ دُوسری جگہ سے اُنھیں ایک خرگوش ملا ہے۔ اُنھیں مارا نہیں گیا۔ لیکن وہ مرے ہوئے تھے۔ اِس واقعے نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔ لیکن جب اُنھیں مُردہ بم ملتا ہے تو کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ بوجوہ لوگ مُردوں کے عادی ہو گئے ہیں۔

کرغزستان کی لینا ایم۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر یوں انداز بنا کر بیٹھ جاتی ہے جیسے تصویر کھنچوانا ہو۔ اُس کے پانچوں بچّے اُس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور اُن کی بلّی میٹےلسا بھی، جسے وہ اپنے ساتھ لائے ہیں: ہم یُوں نکلے جیسے ہم جنگ سے بچ نکل کر جا رہے ہوں۔ ہم نے ہر چیز ساتھ لے لی۔ بلّی ہمارے پیچھے سٹیشن تک آئی۔ اِس لیے ہم نے اِسے بھی ساتھ لے لیا۔ ہم ٹرین پر بارہ دِنوں تک رہے۔ آخری دو دِنوں کے ہمارے پاس صرف ڈبّہ بند گوبھی کا سلاد اور اُبلا ہوا پانی بچا تھا۔ ہم دروازے کی حفاظت گدالے (سَبل)، کلہاڑے اور ایک ہتھوڑے سے کر رہے تھے۔ میں اِسے یُوں بتاؤں گی---ایک شب کچھ لٹیروں نے حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے ہمیں تقریباً جان سے مار ہی ڈالا تھا۔ وہ اب تمھیں ایک ٹیلی ویژن یا ایک ریفریجریٹر کی خاطر قتل کر سکتے تھے۔ یہ حالات تھے جن میں ہم جنگ چھوڑ کر جا رہے تھے گو کہ ابھی کرغزستان میں گولیاں مارنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ وہاں قتلِ عام ہوئے تھے، حتّٰی کہ گورباچوف کی حکومت میں بھی، اَوش میں، کرغزوں اور اُزبکوں کا---لیکن کسی نہ کسی طرح معاملات سنبھال لیے گئے تھے۔ لیکن ہم رُوسی تھے اور اِس سے بھی کرغز خوف زدہ تھے۔ تم روٹی لینے کے لیے قطار میں لگے ہو تو وہ چِلّانا شروع کر دیتے ہیں۔ ''رُوسی، گھر جاؤ! کرغزستان کرغزوں کا ہے!'' اور وہ دھکے دے کر تمھیں قطار سے باہر نکال دیں گے۔ ہاں وہ کرغزی میں کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اِس طرح کا: یہاں ہم ہیں، ہمارے لیے روٹی پُوری نہیں اور ہم تمھیں کھلائیں؟ مجھے اُن کی زبان درست طور پر سمجھ نہیں آتی تھی۔ میں نے صرف چند الفاظ ہی سیکھے تھے تا کہ میں مارکیٹ میں بھاؤ

تا کہ کر سکوں، کچھ خریداری کر سکوں۔

ہمارا ایک وطن تھا اور اب وہ ختم ہو چکا ہے۔ میں کیا ہوں؟ میرا اماں یوکرائنی، میرا باپ رُوسی۔ میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی کرغزستان میں اور میں نے شادی کی ایک تاتاری سے۔ تو میرے بچے کیا ہیں؟ ان کی قومیت کیا ہے؟ ہم سب ایک دُوسرے میں ضم ہو چکے ہیں، ہمارے خُون آپس میں ضم ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاسپورٹوں پر، میرے اور بچوں کے قومیت لکھی ہے: ''رُوسی'' لیکن ہم رُوسی نہیں ہیں۔ ہم سوویت ہیں! لیکن وہ ملک -- جہاں میں پیدا ہوئی تھی -- اب وجود نہیں رکھتا۔ وہ جگہ جسے ہم وطن کہتے ہیں اب عدم وجود ہو گئی ہے اور وہ وقت بھی وجود نہیں رکھتا جو ہمارے وطن کا تھا -- اب ہم چمگادڑوں کی طرح ہیں۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ سب سے بڑا آٹھویں درجے میں ہے اور سب سے چھوٹا کنڈر گارٹن میں۔ میں اُنھیں یہاں لے آئی ہوں۔ ہمارے ملک کا اب وجود نہیں رہا لیکن ہمارا تو ہے۔

میں وہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہیں بڑی ہوئی۔ میں نے ایک کارخانے کی تعمیر میں مدد دی اور پھر اُسی کارخانے میں کام کیا۔ ''واپس جاؤ، جہاں کی تم ہو۔ یہ سب ہمارا ہے۔'' اور میرا کہاں ہے؟ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ تمام رُوسی ہیں۔ سوویت ہیں۔ کسی کو اُن کی ضرورت نہیں اور کوئی اُن کا انتظار نہیں کر رہا ہے۔

ایک بار میں خُوش تھی۔ میرے تمام بچے محبت کی پیداوار ہیں۔ میرے بچے اِس ترتیب سے پیدا ہوئے: لڑکا، لڑکا، لڑکا اور پھر لڑکی، لڑکی۔ میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی۔ میں رونے لگوں گی۔ [لیکن وہ تھوڑا سا اور اضافہ کرتی ہے۔] ہم چرنوبل میں انتظار کریں گے۔ اب یہ ہمارا گھر ہے، ہمارا وطن ہے۔ [وہ اچانک مُسکراتی ہے۔] یہاں کے پرندے ویسے ہی ہیں جیسے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اور یہاں اب تک لینن کا مجسمہ ہے۔ [جب ہم دروزے پر پہنچ کر خدا حافظ کہنے لگتے ہیں تو وہ مزید کہتی ہے۔] ایک روز صبح سویرے پڑوسی گھر پر ہتھوڑے برسا رہے تھے، کھڑکیوں کے تختے اُکھیڑ رہے تھے۔ میں ایک عورت کو دیکھتی ہوں اور دریافت کرتی ہوں۔ ''تم کہاں کی ہو؟'' ''چیچنیا کی۔'' وہ کچھ اور نہیں بولتی، بس رونے لگتی ہے......

لوگ مجھ سے پُوچھتے ہیں، حیران رہ جاتے ہیں، وہ سمجھتے نہیں۔ ''تم ہمارے بچوں کا خُون کیوں کر رہی ہو؟'' او خدایا، ہم وہ ہمت کہاں سے لائیں جو ہر آنے والے دِن کی مشکلات برداشت کر سکے؟ میں اُن کا خُون نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو اُنھیں بچا رہی ہوں۔ میں یہاں ہوں، چالیس سالہ اور مکمل سفید بالوں والی۔ اور وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں: ''کیا تم اپنے بچے وہاں سے لائی ہو جہاں ہیضہ یا طاعون پُھوٹ پڑی تھی؟'' لیکن وہ طاعون ہے اور وہی ہیضہ ہے۔ یہی خوف یہاں چرنوبل میں ہے! مجھے اِس کے بارے میں نہیں پتا۔ یہ میری یادداشت میں نہیں ہے۔

☆☆☆☆

ضیاءالمصطفیٰ ترک

اکتاویو پاز: تعارف

اکتاویو پاز (۱۹۱۴۔۱۹۹۸) میں میکسیکو میں پیدا ہوا۔ تدریسِ ادب کے شعبہ سے وابستہ رہا۔ ہندوستان اور فرانس میں اپنے ملک کے سفارت کار کے بطور بھی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۹۰ میں اکتاویو پاز کو ملنے والا نوبیل پرائز (برائے ادب) اس کی شعری صلاحیتوں کا قرارِ واقعی اعتراف تھا۔ معاصر تنقید نے اسے ”بیسویں صدی کا بڑا ذہن اور عظیم تہذیبی مظہر“ کہہ کر سراہا۔ اس کی نظموں نے اسے ”حرفِ تحسین سے ماورا شاعر“ کہلوایا اور اس کی تنقیدی تحریروں نے اس کی شناخت ”تنقید سے بالاتر نقاد“ کے بطور کروائی۔

اکتاویو پاز کی شعری کائنات: جدید عہد کے منظر نامے کے مشاہداتی تعمق اور نفسیاتی و مابعد نفسیاتی اثرات پر محیط ہے۔ اس کی نظموں میں انسان کی بحیثیت فرد اپنی بے بضاعتی، تنہائی، بے چارگی، اپنی شناخت سے محرومی جیسے المیوں سے لے کر وقتی خوشی و مسرت، لمحاتی آسودگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی آسائشوں اور مادی تحصیلات سے جڑی ہوئی سرشاری تک سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کی شاعری کا سروکار انسان کے گردوپیش لمحہ لمحہ رنگ بدلتی دنیائے دوں ہی سے نہیں بل کہ فرد کے اندرون برپا ساری اتھل پتھل سے بھی ہے۔ نرودا، والٹ وہٹ مین اور ریلکے کی طرح اکتاویو پاز کی شاعری بھی محض اپنے مقامی ادبی تناظر تک محدود نہیں بل کہ اس میں بجا طور پر وہ جوہر موجود ہے جو عالمی شعریات میں معتد بہ اضافہ کا موجب بنا کرتا ہے۔ ذیل میں دی گئی نظمیں، اس کی منتخب نظموں کا اردو قالب ہیں۔

☆☆☆☆

کہاوتیں، ضرب الامثال

گندم کی بالیوں کا ایک گٹھا بھی گندم کا پورا کھیت ہے
ایک پر بھی ایک پرندہ ہے، جیتا جاگتا پرندہ، چہچہاتا ہوا
گوشت پوست کا آدمی بھی خواب میں دکھائی دینے والا آدمی ہے
سچ کو توڑا مروڑا نہیں جا سکتا (یہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، ایک اکائی کی طرح ناقابلِ تقسیم)
بادلوں کا گرجنا، بجلی کی کڑک کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے
خواب دیکھتی ہوئی عورت ہمارے لیے محبت کا ایک دائمی نقش ہے
درخت سویا ہوا ہو تب بھی ساری سبز بشارتیں بیان کر دیتا ہے
پانی مسلسل بولتا رہتا ہے لیکن ایک بھی لفظ دوہراتا نہیں
حتمی طور پر کچھ بھی طے نہیں کیا جا سکتا
پر یقین ساکت پپوٹوں کی شہادت کے سوا، نیند کی بابت
ایک زبان کے مسلسل چلنے کے سوا، بیاہے کے باب میں
کسی عورت کا زندگی کے لیے منہ زبانی اقرار ایسا ہی ہے

جیسے
کسی آسمانی پرندے کا (آہستگی سے) پر پھیلا دینا

لوک داستان

آگ اور ہوا کا عرصۂ حیات
پانی کی سرشوری و سیرابی کا عہدِ جوانی
سبز رنگت کے زرد پڑنے تک
اور زرد کے سُرخ ہو جانے تک
خواب دیکھنے سے عمل پیرا ہونے کے مابین
خواہش سے بیداری تک
صرف ایک قدم اٹھانے کی دیر تھی
اور سب کچھ از خود ہوتا چلا گیا کسی کوشش کے بغیر
ان دنوں یہ حشرات، بیش قیمت پتھروں کی طرح تھے

گرمی، تالاب کے کنارے ستانے کے لیے لیٹی ہوئی تھی
بارش بید مجنوں کی شاخوں اور ٹہنیوں میں کہیں کہیں معلق تھی
تمھاری ہتھیلی پر بھی ایک ویسا ہی ایک درخت اُگنے کو تھا
اور جب وہ پوری طرح اُگ آیا تو اُس نے ہنستے ہنستے کئی پیشین گوئیاں کر ڈالیں
اس نے ایسا طلسم پھونکا جس نے فضاء میں چاروں طرف اپنے پر پھیلا دیے
اس اثناء میں سادہ ترین معجزہ
وہ پرندے تھے جو فضاؤں میں اڑتے پھرتے تھے
ساری چیزیں باہم ایک دوسرے سے وابستہ تھیں
ایک دوجے سے جُڑی ہوئی اور یکجان
کوئی بھی شے، کچھ بھی کہلا سکتی تھی
صرف ایک لفظ تھا جو اپنے متضاد کے بغیر پوری شدت سے قائم تھا
سورج کی طرح کا ایک لفظ
اور ایک دن وہ کسی دھماکے سے پھٹا
اور چھوٹے چھوٹے باریک ریزوں میں تقسیم ہو گیا

یہ ریزے
وہ لفظ تھے ہماری زبان کے، جو ہم بولتے تھے
یہ نوکیلے ٹکڑے اسی آئینے کے ہیں
جس میں دنیا خود کو دیکھتی ہے
ٹکڑے ٹکڑے اور ذبح شدہ

بغیر کسی عنوان کے

ایک عورت، جس کی بدن بولی کسی دریا کی سی ہے
بار بار جنبش میں آتے نسوانی اعضاء کی شفافیت

جیسے
پانی سے بنی ہوئی ایک لڑکی

جہاں اس لمحۂ موجود کو پڑھا جا سکتا ہے، جو غیر مبدّل ہے
وہ تھوڑا سا پانی پیا بھی جا سکتا ہے
جس میں اس لڑکی کی آنکھیں ہیں

اور وہ ہونٹ،
جن کا گھونٹ بھرا جا سکتا ہے
یہ درخت، یہ بادل، یہ چراغ
یہ لڑکی اور مَیں

تیقن

اگر یہ حقیقت ہے
شمع داں سے آتی ہوئی سفید روشنی
لکھنے والا ہاتھ
کیا واقعی ان کا وجود ہے؟
اور یہ آنکھیں، جو نوشتہ کو دیکھ رہی ہیں
حقیقی ہیں؟
ایک لفظ سے دوسرے لفظ تک
میں جو بھی کہتا ہوں، غائب ہو جاتا ہے
مجھے یقین ہے کہ مَیں زندہ ہوں
میں زندہ ہوں دو قوسین کے مابین

دورانیہ

"بادلوں کا گرجنا اور ہواؤں کا بارِ دیگر چل پڑنا ـــــ اس دوران میں" (آئی چنگ)

(ا)

سیاہ آسمان اور زرد پڑتی ہوئی زمین
رات کو ڈھنڈورا ڈالنے والا جواں سال پرندہ

پانی جاگتے ہی پوچھتا ہے، کیا وقت ہوا ہے
ہوا جاگتی ہے اور تمھاری بابت استفسار کرتی ہے
قریب سے ایک اسپ سفید گزر جاتا ہے

(۲)

جیسے جنگل
اپنے برگ و بار کے ساتھ محوِ خواب ہوتا ہے
تم اپنی آنکھیں موندتی ہو
برستی بارشوں کے بستر پر
تم گیت گنگناتی ہو
اور ہوائیں سو جاتی ہیں تمھارا گیت لبوں پر لیے ہوئے
تمھارا بوسہ، روشن الاؤ کے پہلو میں خوابیدگی کے مترادف ہے

(۳)

شدتوں کی اپنی اپنی بُوباس ہوتی ہے
کتنے ہی ہاتھوں سے گزرتا ہوا بدن
ایک نادیدہ تمنا اور اس پر کی گئی بظاہر واحد سفیدی

(۴)

کہنا، سننا اور جواب دینا
بادلوں کی گرج، جو کچھ کہتی ہے
درختوں کو اس کا بخوبی ادراک ہے

(۵)

میں آنکھوں کے راستے تمھارے اندر اترتا ہوں
تم میری زبان سے ظاہر ہوتی ہو
میرے رگ و پے میں جاری لہو کی بوند بوند میں
تم خوابیدہ ہو
اور میں تمھارے دماغ میں جاگتا ہوں

(٦)

میں بات کروں گا تم سے، پتھروں کی زبان میں
(مجھے سبز وقفوں کی وساطت سے جواب دینا)
میں بات کروں گا تم سے، گرتی ہوئی برف کی زبان میں
(مجھے شہد اکٹھا کرنے والیوں کو چھوتی ہوا کے ہمراہ جواب دینا)
میں بات کروں گا تم سے، پانی کے بہاؤ کی زبانی
(مجھے بادوباراں کی خیرہ کن روشنی میں جواب دینا)
میں بات کروں گا تم سے، خاک وخوں کی زبانی
(مجھے پرندوں کے بلند بام آشیاں سے جواب دینا)

آخری صبح

تمھارے گیسو، جنگل میں گم ہوئے
تمھارے پاؤں، میرے پیروں کو چھو رہے ہیں
تم خوابیدہ ہوتی ہو تو رات سے بھی بڑی معلوم ہوتی ہو
لیکن تمھارے خواب
ایک چھوٹے سے کمرے میں پورے ہو جاتے ہیں
ہم قد وقامت میں اتنے کم ہوتے ہوئے بھی کتنے زیادہ ہوتے ہیں نا
باہر سے کوئی ٹیکسی گزر رہی ہے
جس میں شاید آدمی نہیں بدروحیں تھیں
پاس سے گزرنے والا یہ دریا
جیسے ہمیشہ واپس لوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے
کیا واقعی آنے والا کل، ایک نیا دن ہوگا؟

روانی

اگر تم فریب زدہ ہو
تو میں خون میں غرقاب راستہ ہوں

اگر تم پہلے پہل کی برف ہو
تو میں وہ ہوں جو سانجھ سویرے آتش دان روشن کرتا ہے
اگر تم برجِ شب ہو
تو میں تمھارے ذہن میں گڑی ہوئی وہ میخ ہوں جو دہک رہی ہے
اگر تم موجِ صبح ہو
تو میں پہلے پرندے کی پکارتی آواز ہوں
اگر تم مالٹوں بھری ٹوکری ہو
تو میں سورج کا چاقو ہوں
اگر تم قربان گاہ کا مقدس پتھر ہو
تو میں ناپاک ہاتھ ہوں
اگر تم خوابیدہ زمین ہو
تو میں عصائے سبز ہوں
اگر تم ہوا کی اُچھال ہو
تو میں وہ آگ ہوں، جس کی تدفین ہو چکی
اگر تم پانی کا چشمہ ہو
تو میں خودرو سبزہ ہوں، کائی زدہ اور پیاسا
اگر تم بادلوں بھرا جنگل زار ہو
تو میں وہ کلہاڑا ہوں جو کاٹ دیا کرتا ہے
اگر تم شہر ہو، غیر مقدس اور رڑ و انکار سے وابستہ
تو میں بارش ہوں تزکیہ و تقدیس کی
اگر تم زرد کوہسار ہو
تو میں کائی سے بلند ہوتا ہوا کفِ سرخ ہوں
اگر تم ابھرتا ہوا سورج ہو
تو میں خون میں غرقاب راستہ ہوں

یہ دو جسم ہیں

یہ دو جسم ہیں
پہلو بہ پہلو، روبرو
ان کی ہیئت کبھی دو لہروں کی سی تھی
اور رات ایک سمندر

یہ دو جسم ہیں
پہلو بہ پہلو، روبرو
یہ کبھی دو پتھر تھے
اور رات ایک صحرا

یہ دو جسم ہیں
پہلو بہ پہلو، روبرو
یہ کبھی جڑوں کی طرح تھے، دو قدیم جڑیں
رات میں ایک دوجے سے لپٹے ہوئے تسموں کی طرح

یہ دو جسم ہیں
پہلو بہ پہلو، روبرو
یہ کبھی دو چاقو تھے
اور رات ان کی کوندتی چنگاریوں سے روشن

یہ دو جسم ہیں
پہلو بہ پہلو، روبرو
کسی خالی آسمان میں
ٹوٹ کر گرتے ہوئے ستاروں کی طرح

اسبابِ مرگ

کچھ لوگ ہماری زمین کی بات کیا کرتے
لیکن میں بے چاری دھرتی کے بارے میں سوچا کرتا
گرد و غبار اور روشنی سے بنے ہوئے لوگ
ایک دیوار اور ایک گلی
اور ایک شخص، دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے
اپنے سکوت میں
بالائی میدانوں میں پتھروں پر چمکتا سورج
اور رویا میں عریاں کھڑی ہوئی دھوپ
بھولی بسری چیزیں، ذہن میں تازہ ہوتی ہوئی
غیر متعلق چیزیں، یکسر بے ارادہ
خوابوں کو دوہراتا ہوا ایک خواب
دفعتاً، وقوع پزیر ہوتی ہوئی موجودگیاں
اور ہمارے ہونے کی نفی کرتا ہوا وقت
یہی وقت ہے جو یاد رکھتا ہے اور خواب بُنتا ہے
کہیں کوئی ملک نہیں، محض یہ زمین ہے اور اس کے مناظر
زماں کے بیچ گرد و غبار اور روشنی ۔۔
وہ نظم
جو بستر کی طرف چل پڑتی ہے
تمام لفظوں کے ساتھ
آزادی
جو مجھے پکارتی رہی ہے
سمتِ مرگ میں
وہ قحبہ خانہ چلاتی ہے
سائرن، جس کی چیخوں سے حلق میں کوڑھ ہو جائے

میرے ایامِ بلوغت کی دھواں دھار دوشیزہ
میری آزادی
مجھ پر ہنسا کرتی تھی
جیسے ایک گہری، بے تہہ کھائی
اور اس کھائی میں ہماری ہستی
آزادی پروں سے ہے
ہوا، پتوں کے درمیان ٹھہرتی ہوئی ہوا
ایک سادہ سا پھول اور وہ نیند
جس میں ہم محض ایک خواب ہو رہیں
یہی تو شجرِ ممنوعہ کا ذائقہ ہے
اس کا ثمرہ ہے
امتناع کے صدر دروازے کا وا ہونا
قیدی کی زنجیروں کا کھلنا
پتھر روٹی میں بدلتے ہوئے
یہ سفید کاغذ، سمندری بگلے ہیں
اور یہ اڑتے ہوئے پتے، پرندے
اور تمھاری لہراتی ہوئی انگلیاں
ہر شے محوِ پرواز ہے

مقامی پتھر

روشنی، افلاک کی وسعتوں میں ضائع ہوتے ہوئے بھی
ہجوم میں ترتیب و توازن کا سبب بنتی ہے
آنکھ، آئینوں میں گھر جانے پر پسپا ہو جاتی ہے

زمینی منظر نامہ
بہت وسیع ہے بے خوابی کی طرح

ہڈیوں کا پتھریلا فرش

خزاں، لامحدود و بے کنار
پیاس، اپنے نادیدہ فواروں کو بلند کرتی ہوئی
صحرا میں بات کرتا ہوا، سیاہ مرچ کا آخری پودا

اپنی آنکھیں بند کرو اور روشنی کا یہ گیت سنو
دوپہر، تمھاری باطنی ساعت میں پناہ چاہتی ہے

گھڑی بھر کو اپنی آنکھیں بند کرو اور پھر سے دیکھو
کوئی بھی تو نہیں، حتیٰ کہ تم بھی نہیں

اور شاید
یہ پتھر نہیں، روشنی ہے

☆ ☆ ☆ ☆

ناظم حکمت راں

ترکی ادب سے ترجمہ: خالد مبین

بہار کا پہلا دن

بے داغ ماضی کے ساتھ ایک خاتون نے
اپنی کھڑکی سے بہار کا نظارہ کیا اور کہا:
اے بہار! میں کیسے تمنا کروں، کاش تُو کھلی ہی نہ ہوتی

میری زندگی کی کتنی ہی بہاریں ایسی تھیں،
تمام کی تمام خاموش اور سب محبت سے خالی؛ کیا میرے ماضی کا حصہ بن چکی ہیں؟
نہ تو مجھے ایام ماضی سے آگہی ہے نہ ہی میرے دل میں پرانی یادوں کا کوئی نشان
آہ! مت کھلو! اے بہار!، مت کھلو

بہار کی بارشیں

برلن کا جھٹپٹا ہے جبکہ بارش ہو رہی ہے،
جب بارش ہوتی ہے، پرندے کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے سے گاتے ہیں
خوشخبریاں بھی چلتی ہیں جب بارش ہوتی ہے
جب بارش ہوتی ہے، ٹرینیں چلتی رہتی ہیں،
جب بارش ہوتی ہے، جہاز اُڑتے رہتے ہیں

ایک ہی لمحے میں، میں بارش سے باہر آنے والا ہوں
اور دوبارہ تمھارے ساتھ ’ماسکو‘ میں ہوں گا
بہار کی بارشیں تمام دنیا میں ہو رہی ہیں
بہار کی بارشیں تمام عالم میں ہو رہی ہیں
میں تیزی میں بارش سے نکل رہا ہوں
اور جلدی سے تمھیں پھر ماسکو میں دیکھ رہا ہوں
تمھاری برساتی گیلی ہے، تمھارے بال مکمل طور پر بھیگے ہوئے ہیں،
سورج بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہے
اور ہر چیز، گلیاں، گھر، درخت، سب کچھ نیلا ہے
دوری اور جدائی اب بہت، بہت دور رہ گئی ہے
اس کو سردیوں کی بارش نے روک رکھا ہے
کیا کوئی اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش بھی ہے؟

کیا کوئی اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش بھی ہے؟
جہاں جُدائی دور رہ گئی ہو
جسے اپریل کی بارشوں نے روک رکھا ہو،
جہاں ہر چیز، گلیاں، گھر اور درخت نیلے ہوں

اور سڑکوں پر بارش سے بنائے گئے آئینے ہوں، سنہری آئینے
جو شہر ماسکو کا عکس دکھاتے ہوں
ماسکو، میرا گھر، میرا وطن

جب میں انیس برس کا تھا تو 'ماسکو' ہی تھا
ساٹھ برس کی عمر میں بھی 'ماسکو' میں ہوں
میرے استاد اور میرے ساتھی مسافر!
ماسکو ہی نے مجھے تم لوگ تحفے میں دیے

بہار کی بارش دوبارہ ہوگی، پرندے پھر بارش میں گنگنائیں گے
نئی شاخیں، چھوٹے بچے، اچھائی، اُمید؛
بہار کی بارش میں یہ سب پھلیں پھولیں گے

ان سے دور جاتے ہوئے جو مجھے محبوب ہیں

بریسٹ (اسٹیشن) تک میری بیوی میرے ساتھ آئی، پھر وہ نیچے اُتر گئی
اور پلیٹ فارم پر کھڑی رہی، وہ چھوٹی سے مزید چھوٹی
ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ گندم کے دانے جتنی ہوگئی،

لامحدود نیلاہٹ میں،
اور پھر میں پٹڑی پر اور کچھ نہ دیکھ سکا

بعد میں اس نے "پولز" سے فون کیا
مگر افسوس کہ میں اس سے بات نہ کر پایا
میں اس سے یہ نہ پوچھ پایا کہ تم کہاں ہو؟
میرے گلاب مہربانی سے مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو

اُس نے کہا ہوتا: ''میرے پاس واپس آجاؤ''
لیکن تب میں اس کے پاس نہ لوٹ پاتا
ٹرین ایسے چل رہی تھی گویا کبھی نہ رُکے گی
اور میں غم کے مارے گھٹا جا رہا تھا۔

پھر میں نے ریت اور زمین پر پڑی، برف کے ٹکڑوں کی نشاندہی کی
اور اچانک مجھے پتہ چلا کہ میری بیوی مجھے دیکھ رہی ہے
مجھ سے پوچھ رہی ہے، کیا تم مجھے بھول چکے ہو؟ کیا تم مجھے بھول چکے ہو

جہاں تک بہار کا تعلق ہے، میں نے اُسے آسمان میں چلتے دیکھا کہ اس کے ننگے پاؤں
سب مٹی سے بھرے ہوئے تھے

ستارے آسماں سے نیچے آ کے ٹیلی گراف کی لائنوں پہ بیٹھے ہوئے تھے
جہاں تک تاریکی کا سوال ہے یہ بارش کے قطروں کی مانند ٹرین سے ٹکرا رہی تھی
میری بیوی ٹیلی گراف پول کے نیچے کھڑی تھی
میں اس کے دل کی دھڑکن سن سکتا تھا؟ ٹک، ٹک، ٹک
جیسے میں نے اسے بازوؤں میں تھام رکھا ہو
جیسے ٹرین کھمبے کے کھمبے پیچھے چھوڑ رہی ہو
وہ جہاں کھڑی تھی، وہاں سے نہ ہلی
ٹرین ایسے دوڑ رہی تھی گویا کبھی نہ رُکے گی
اور غم کے مارے میری سانسیں تھم رہی تھیں!

پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں ٹرین میں برسوں سے رو رہا ہوں
(مگر میں ابھی تک حیران و پریشاں ہوں کہ مجھے ایسا کیوں لگا)
جیسے جیسے میں اپنی محبوب خواتین سے دور جاتا ہوں
اُن قصبوں سے دور جنھیں میں پسند کرتا ہوں
ان سب کے لیے اپنی تمناؤں کو سہتے ہوئے
ایسے زخم کی طرح جو گوشت پوست کو گھول کے رکھ دے
ان جگہوں کی طرف بڑھتے ہوئے جو میرے لیے نئی ہیں

میں تم سے محبت کرتا ہوں

میں تمھیں ایسے انسان کی طرح پیار کرتا ہوں جو اپنی روٹی کے لیے
نمک استعمال کرتا ہے
جب میں رات کو تیز بخار میں اٹھتا ہوں
اور پانی کے نلکے سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں
ایسے انسان کی طرح جو، ہڑبڑاہٹ، خوف اور خوشی سے
ڈاک میں آئے بھاری پیکٹ کو کھولتا ہے
جس کے مشتملات جاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں

میں تم سے ایسے انسان کی طرح محبت کرتا ہوں جو ایک ہوائی جہاز میں
زندگی میں پہلی بار سفر کر کے سمندر پار کرتا ہے
اُن چیزوں کی طرح جو میرے اندر ہلچل مچاتی ہیں

جب میں استنبول کو دیکھتا ہوں جبکہ اندھیرا آہستہ آہستہ اسے اپنی لپیٹ میں لیتا ہے
میں تم سے اُن لوگوں کی طرح پیار کرتا ہوں جو یہ الفاظ ادا کرتے ہیں کہ:
''خدا کا شکر ہے کہ اب تک ہم زندہ ہیں''

تمھاری روح

اے میرے گلاب، تمھاری روح ایک دریا ہے
جو بلند و بالا پہاڑیوں کے بیچ بہہ رہا ہے
پہاڑیوں سے، گھاٹیوں کی طرف بہہ رہا ہے
وہ وادیاں جنھیں یہ کسی طرح سے کبھی نہیں ملا
نہ ہی یہ کبھی سوئے ہوئے بید کے درختوں سے مل سکا
نہ ہی کبھی دریا کے عظیم اور پھیلے ہوئے پلوں سے ان کے دو
کناروں کے بیچ کے فاصلے کا آرام بانٹ سکا
یا نرسل کے پودوں اور ہجوم اور سبز سر بطخوں سے مل سکا، نہ ہی یہ کبھی میدانوں کے مدہم
رنج والم سے مل سکا
گندم کے چاندنی سے چمکنے والے، کھیتوں کو سیراب کیے بغیر
یہ چراگاہ کی طرف بہتا جا رہا ہے
پہاڑوں کے بیچ میں بلندیوں پر، بادلوں کو اپنے ساتھ سمیٹتے ہوئے
وہ بادل جو کبھی تو اکٹھے ہو جاتے ہیں اور کبھی بکھر جاتے ہیں
جو اپنے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں سے رات کو بڑے بڑے ستارے لیے جاتے ہیں

جو اپنے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف پر پڑنے والے سورج کی نیلی روشنیاں
لاتے ہیں
جھاگ بناتا ہوا یہ بہتا رہتا ہے،
اپنی تہہ میں سفید اور کالے چھوٹے کنکروں کو ملاتے ہوئے
یہ اس مچھلی کے ساتھ بہتا ہے جو اس کے رُخ کے مخالف چلتی ہے
یہ موڑوں پر بڑا محتاط ہو جاتا ہے
مگر تیز ڈھلانوں کو چٹانوں پر سے ڈگمگا کے چلتے ہوئے، غصیلا ہو جاتا ہے
یہ اپنی ہی سرگوشیوں سے پاگل ہوا جاتا ہے
یہ پہاڑوں کی بلندیوں کے بیچ سے بہتا ہے
یہ پہاڑوں میں سے گزر کر میدانوں کی طرف آتا ہے
ان میدانوں کی طرف جن کا پیچھا اسے بہت پسند ہے مگر
وہ جنھیں یہ کسی بھی طرح کبھی نہیں مل سکا!

تمھارے انتظار میں

سڑک پر اپنی آنکھیں جمائے، میں تمھارا منتظر ہوں
گہری تاریکی میرے لیے پریشان کُن ہے، بہت سے گھنٹے بیت گئے
مگر تم ابھی تک نہیں آئیں

آسمان کے تارے کہتے ہیں وہ نہیں آئے گی
یہ سُن کر میری پریشان حال رُوح پگھلنے لگتی ہے

ایک کڑوا شک میرے دل کو کھائے جاتا ہے
بہت سے گھنٹے بیت گئے ہیں
مگر تم اب تک نہیں آئیں۔

اے طلوع ہوتے ہوئے چاند، مجھے بتا! اگر تُو نے میرے محبوب کو دیکھا ہے؟
اس طرح اس کے لیے انتظار مجھے مار دے گا
بہت سے گھنٹے بیت گئے ہیں
مگر تم اب تک نہیں آئیں

☆☆☆☆

کم سی انگ اوک

انگریزی سے ترجمہ: اطہر قیوم راجہ

موجین کا سفر

جب بس نے پہاڑ کے گرد موڑ کاٹا تو میں نے ایک سائن بورڈ دیکھا جس پر لکھا تھا "موجین 10 کلو میٹر" ہمیشہ کی طرح یہ سائن بورڈ سڑک کے کنارے بلند جھاڑیوں کے درمیان نمایاں نظر آتا تھا۔ میری توجہ نشست پر براجمان لوگوں کی ایک بار پھر شروع ہو جانے والی گفتگو پر مبذول ہو گئی۔

"اب بھی دس کلومیٹر باقی ہیں"

"ہاں، ہم تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں ہوں گے"

ان کی باتوں سے وہ زراعتی انسپکٹر لگتے تھے لیکن شاید وہ (زراعتی انسپکٹر) نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے آدھے بازو والی شرٹس جن پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور پولی ایسٹر کی پتلونیں پہنی ہوئی تھی وہ اردگرد نظر آنے والے کھیتوں، پہاڑوں اور دیہاتوں کے بارے میں ایسی گفتگو کر رہے تھے جو صرف چند ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ پیشہ ورانہ زبان اور محاورے میں اپنے مشاہدات بیان کر رہے تھے۔ چوں کہ میں نے کوانگ جو کے مقام پر بس تبدیل کی تھی۔ میں نیم خوابیدگی کی حالت میں ان کی مدہم شریفانہ آوازوں میں گفتگو سنتا رہا تھا۔ بس میں کئی نشستیں خالی پڑی تھیں۔ انسپکٹروں کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ کھیتوں میں مصروفیت ہونے کی وجہ سے لوگوں کے پاس سفر کا وقت نہیں تھا۔

"کیا خیال ہے، موجین میں کوئی زیادہ قابل ذکر چیزیں نہیں ہیں۔"

"موجین کی وجہ شہرت کی کوئی زیادہ چیزیں نہیں ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یہاں کوئی زیادہ چیزیں واقعی نہیں ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ پھر بھی ایک اچھا گنجان آباد علاقہ ہے۔"

"میرا خیال ہے سمندر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں بندرگاہ بنائی جا سکتی ہے۔"

آپ وہاں پہنچ کر یہ محسوس کریں گے کہ یہ بندرگاہ بنانے کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے۔ یہاں سمندر بہت اتھلا ہے اور صحیح گہرے سمندر تک پہنچنے کے لیے سینکڑوں "لی" کا سفر درکار ہے۔ جہاں سے آپ کو افق نظر آتا ہے۔

''پھر یقیناً اس علاقے کو کاشت کاری کے لیے موزوں ہونا چاہیے۔''

''تاہم یہاں متعدد اکٹھے کھیت بھی نہیں ہیں۔''

''پھر ساٹھ ستر ہزار کی آبادی یہاں کیسے گزر بسر کرتی ہے؟''

''اسی لیے تو یہاں کی زبان میں ''کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنے کی جدوجہد کرنے'' جیسے محاورے موجود ہیں وہ سب مدہم مہذب آواز میں ہنسنے لگے۔

جب انھوں نے ہنسنا بند کر دیا تو ایک نے کہا ''اس کے باوجود کسی جگہ میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہونی چاہیے۔''

لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ موجین کے کوئی مخصوص خدوخال نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک دھند ہے۔ جب آپ صبح کے وقت باہر نکلتے ہیں تو دھند نے موجین کو اس طرح گھیرے میں لیا ہوتا ہے جیسے دشمن افواج رات کے اندھیرے میں چپکے سے داخل ہو گئی ہوں۔ موجین کے گرد موجود کہرے میں لپٹی ہوئی پہاڑیاں، یوں لگتا ہے دور دراز کے علاقوں میں دھکیل دی گئی ہوں۔ یہ دھند کسی ایسی بے چین عورت کے سانس کی طرح لگتی ہے، جس کا تابوت 7 سال سے اس دنیا میں اس کے ساتھ کی جانے والی کسی ناانصافی کا انتقام لینے کے لیے اس جگہ کے چکر لگاتا رہتا ہو۔ طلوع آفتاب کے وقت جب سمندری ہوا اپنی سمت بدل کر یہاں کا رخ کرتی ہے، اس سے پہلے دھند ختم کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اگر چہ اسے ہاتھوں سے چھوا نہیں جا سکتا اس کے باوجود اس کی موجودگی محسوس کی جا سکتی ہے اور یہ لوگوں کو گھیرے میں لے کر انھیں دور دراز کی جگہوں سے علیحدہ اور دور کر دیتی ہے۔ دھند، موجین کی دُھند، دھند جو موجین میں صبح کے وقت ہوتی ہے، دھند جو انسان کو سورج اور ہوا کا بے چینی سے انتظار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی دھند موجین کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

بس کے جھٹکے کم ہونا شروع ہو گئے۔ میں جھٹکوں کی کمی یا بیشی کو اپنے ٹھوڑی کے ذریعے محسوس کرتا تھا۔ چوں کہ میں بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جب بھی بس اس مضافاتی روڑی سے بنی سڑک پر کسی کھڈے سے گزرتی تو میری ٹھوڑی ہر جھٹکے کے ساتھ اوپر یا نیچے ہوتی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس طرح ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ کر ٹھوڑی کو جھٹکے دینا سیدھا تن کر بیٹھنے سے زیادہ مشکل تھا، مگر بس کی کھڑکی سے در آنے والی موسم گرما کی نرم ہوا جو بے رحمی سے میری ننگی جلد سے کھیل کر مجھ پر نیم خوابی طاری کر رہی تھی اور جس نے میرے لیے تن کر بیٹھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہوا ننھے ننھے ذروں میں تبدیل ہو گئی ہو اور ہر ذرے میں جتنی بھی ممکن ہو سکون بخش نشہ آور دوا بھری ہو۔ خالص دھوپ، ایک ٹھہری ہوئی معصوم ٹھنڈک، جسے

ابھی پسینے بھری جلد کو چھوتا تھا اور جو فضا میں موجود نمکینی پہاڑوں سے پرے سمندر کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی اور جو اس سڑک جس پر بس چل رہی تھی، کی طرف بڑھ رہی تھی ۔ یہ ساری چیزیں جیسے پگھل کر ایک دوسرے سے مل کر ہوا کے ساتھ ایک عجیب مرکب بنا رہی تھیں اور معصوم چمکیلا پن پیدا کر رہی تھیں اور سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا، نمکین ہوا ۔ ۔ اگر میں ان سپنوں کو آپس میں ملا کر ایک نشہ آور سکون بخش دوا تیار کر سکتا تو یہ ادویات کے اسٹوروں کی کھڑکیوں میں نمونے کے طور پر نمائش کے لیے رکھی جانے والی ادویات میں سب سے زیادہ آرام پہنچانے والی دوا ہوتی اور میں دنیا کی سب سے کامیاب دوا ساز کمپنی کا مہتمم، پر سکون نیند کا خواہش مند ہوتا ، بے شک میٹھی نیند میں کھو جانا خوشگوار عمل ہے ۔

جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تو ایک تلخ مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی ۔ عین اُسی وقت میں نے پوری شدت سے محسوس کیا کہ ہم بس موجین پہنچ ہی رہے تھے ۔ میں جب بھی موجین گیا ہمیشہ ایسے فسوں انگیز خیالات میرے ذہن میں آئے ہیں اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رہ گئی ہے ۔ فسوں انگیز خیالات جو کسی اور جگہ میرے ذہن میں نہیں آتے ، موجین میں بغیر کسی جھجک یا ہچکچاہٹ کے میرے ذہن میں آتے ہیں ۔ نہیں بل کہ مجھے کچھ سوچے بغیر ایسا لگتا ہے جیسے کہ وہ خیالات جو دوسری جگہوں پر خود بخود پیدا ہوئے تھے موجین میں میرے ذہن میں در آتے ہیں ۔ خود بخود گھس جاتے ہیں ۔

”جان، تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہے، تم کچھ دن کے لیے موجین کیوں نہیں چلے جاتے ۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم اپنی والدہ کی قبر پر گئے ہو ۔ ابا جان اور میں عام شراکت داروں کے اجلاس کے لیے سب تیاری کر لیں گے ۔ کچھ تازہ ہوا لے لو ۔ تم بہت عرصے سے کہیں نہیں گئے ہو ۔ واپسی تک مہتمم اعلیٰ بن چکے ہو گے ۔“ میری بیوی نے کچھ راتیں پہلے میرے پاجامے کے نیفے میں انگلی ڈالتے ہوئے کہا تھا، اس کے مخلصانہ مشورے پر میں نے زیر لب کوئی الفاظ بڑبڑائے تھے جیسا کہ کوئی بچہ اس وقت کرتا ہے جب اس کی مرضی کے برعکس اسے کسی کام کے لیے زبردستی بھیجا جائے ۔ یہ ایک طرح سے میرا غیر ارادی ردعمل تھا جو ماضی میں موجین سے متعلق میرے تجربات کی وجہ سے بن گیا تھا جن سے میں تقریباً کھو کر رہ گیا تھا ۔

جب سے میری عمر بڑھی ہے میں صرف چند بار ہی موجین گیا ہوں اور جب بھی میں وہاں گیا اس کی وجہ یہاں کی کسی پچھلی بڑی ناکامی سے فرار یا کسی طرح کے ازسر نو آغاز کی ضرورت تھی ۔ کسی نئے آغاز کے لیے موجین کی تلاش اس لیے نہیں تھی کہ وہاں مجھے نئی سمت اور اعتماد حاصل ہوتا تھا اور اپنے پہلے منصوبے میرے ذہن میں آنے لگتے تھے ۔ اس کے برعکس میں موجین میں ایک جمود کی کیفیت میں پھنس کر رہ جاتا تھا ۔ سوجے سوجے چہرے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس میں ایک عقبی کمرے میں پڑا رہتا تھا ۔

موجین کے بارے میں میری یادوں میں، میری دیکھ بھال کرنے والے ادھیڑ عمر افراد پر برس پڑنا یا بھولی بسری یادوں اور خالی مولی خیالات کے تعاقب پر خود کو لعنت ملامت کرنا، اتنے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے جن سے میرے پھیپھڑے پھول جائیں اور وہ بے صبری جس کے ساتھ میں ڈاکیے کا انتظار کرتا تھا، شامل ہیں۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ موجین کی میری صرف یہی یادیں نہیں ہیں۔ سیول کی کسی گلی میں جب میرے کان اچانک اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور بے رحم شور شرابے کے صدمے تلے کچلے جاتے ہیں تو ترقی یافتہ ڈیپنگ ڈانگ میں اپنے گھر کے سامنے والی تنگ گلی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے تصور میں اچانک ایک ایسا مضافاتی گاؤں آ جاتا ہے جس کے ساتھ ایک بھر پور دریا ہے، جس کے گھاس بھرے سرسبز کنارے دور سمندر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک گاؤں جس میں تھوڑے درخت ہیں بہت سے لپے اور تنگ گلیاں اور مٹی سے بنی دیواریں، اونچے پاپلر کے درختوں میں گھرا ایک سکول گراؤنڈ اور مقامی دفاتر جن کے صحنوں میں سمندر سے آئی ہوئی کالی بجری پھیلی ہوئی ہے اور جہاں رات کو گلیوں میں بانس کے بنے ہوئے بستر لگا دیے جاتے ہیں۔ میں کسی ایسے گاؤں کے بارے میں سوچتا تھا اور یہ گاؤں ہمیشہ موجین ہی ہوتا تھا۔ میں موجین کے بارے میں اس وقت بھی سوچتا تھا جب مجھ میں اچانک خاموشی کی شدید خواہش جاگ اٹھتی تھی لیکن ان لمحات میں موجین ایک ایسی جگہ ہوتا تھا جس کی تصویر میں نے اپنے ذہن میں سما رکھی تھی اور جو لوگوں سے ہمیشہ بالکل خالی ہوتا تھا موجین کی زیادہ تر یادیں میری اندھیری جوانی کی یادیں تھیں۔

لیکن یہ کہنا بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ موجین کی کوئی یادیں سایوں کی طرح میرے تعاقب میں رہتی تھیں۔ اس کے برعکس اب جبکہ وہ اندھیرے ماہ وسال گزر چکے ہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ موجین کی وہ اندھیری یادیں کسی واضح شکل میں میرے ذہن میں نہیں آئیں۔ شاید اس لیے کہ میں اپنی بیوی اور دفتر کے چند اشخاص جو مجھے چھوڑنے آئے تھے کو ہدایات دینے میں بہت زیادہ مصروف تھا۔

لیکن آج صبح ایک پاگل عورت نے وہ تمام یادیں اچانک سائے سے نکال کر میرے سامنے پھینک دیں، جسے میں نے گوانڈ جو ریلوے اسٹیشن چھوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس عورت نے کورین انداز کا ایک اسکرٹ اور ایک کسی حد تک خوبصورت بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اس کے بازو میں ایک ایسا دستی بیگ تھا جسے لگتا تھا کہ موسم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خوبصورتی کی طرف مائل تھا اور اس نے بہت بھڑکیلا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کی مسلسل گھومتی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں اور اس کے گرد جمائیاں لیتے ہوئے اور ادھ سوئے بوٹ پالش کرنے والوں کے ٹھٹھے سنتے ہوئے مجمع کی وجہ سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پاگل تھی۔

’’یہ بہت زیادہ پڑھنے کی وجہ سے پاگل ہوگئی۔‘‘

’’نہیں اسے اس کے آدمی نے چھوڑ دیا۔‘‘

’’یہ انگریزی بول سکتی ہے۔ کیوں نہ اس سے پوچھیں۔۔۔‘‘

لڑکے اونچی آوازوں میں الفاظ کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ایک ذرا بڑی عمر کے لڑکے نے جس کے چہرے پر پھنسیاں تھیں، اس کے بلاؤز کو سامنے سے چھوا۔ جب بھی وہ اسے چھوتا تو وہ عورت، اب بھی اپنے چہرے پر کوئی تاثرات لیے بغیر چیختی۔ اس کے چیخنے سے میرے ذہن میں اچانک ایک مصرعہ آ گیا جو میں نے موجین میں ایک عقبی کمرے میں اپنی ڈائری پر لکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری ماں ابھی زندہ تھی۔ جنگ شروع ہونے کی وجہ سے کالج بند کر دیے گئے تھے اور آخری ریل گاڑی نکل جانے کی وجہ سے مجھے سیول سے موجین تک کئی ہزار کلومیٹر (لی) کا سفر پیدل طے کرنا پڑا تھا جس سے میرے پاؤں چھالے چھالے ہو گئے تھے۔ موجین میں اپنی ماں کی وجہ سے مجھے ایک تاریک عقبی کمرے میں رہنا پڑا تھا تا کہ رضا کار بننے اور بعد ازاں جبری فوجی بھرتی سے بچ سکوں۔

جب کہ میرے موجین مڈل سکول کے ہم جماعت گاؤں کے چوک سے فوجی ٹرکوں میں سوار ہو کر میدان جنگ کی طرف اپنے سروں پر سوتی کپڑے کی پٹیاں باندھے یہ گاتے ہوئے ’’اگر میری جان بھی جائے مادر وطن بچ جائے‘‘ ایک پریڈ کی شکل میں میرے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے تو میں دبکا بیٹھا سن رہا تھا۔ جب یہ خبر آئی کہ محاذ جنگ شمال کی جانب بڑھ گیا تھا اور کالج میں پڑھائی دوبارہ شروع ہو گئی تھی میں اس وقت بھی موجین میں اس عقبی کمرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ سب میری بیوہ ماں کی وجہ سے تھا۔ جب ہر دوسرا آدمی جنگ پر جا رہا تھا میں ایک عقبی کمرے میں چھپا اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ جب کسی پڑوسی کے گھر جنگی کارروائی میں کسی موت کی خبر آتی تو میری ماں میری سلامتی پر خوشی مناتی اور اگر محاذ جنگ سے کسی دوست کا میرے نام خط آتا تو میری ماں اسے پھاڑ پھینکتی۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ میری ماں کو معلوم تھا کہ میں محاذ جنگ کو عقبی کمرے پر ترجیح دیتا تھا۔ ان دنوں میں جو ڈائری لکھتا تھا۔ اگرچہ وہ ساری اب جل چکی ہے۔ وہ اپنی ذات سے نفرت اور اس ذلت پر خود کو کوسنے اور اسے برداشت کرنے کی کوشش کے بارے میں تھی۔

’’ماں اگر میں اب پاگل ہو گیا تو یہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہو گا۔ چنانچہ مہربانی فرما کر کوئی معالج تلاش کرتے ہوئے انھیں ضرور نظر میں رکھے گا‘‘

وہ عورت جسے میں نے صبح دیکھا تھا، ان دنوں کی ساری یادوں کو کھینچ کر میرے سامنے لے آئی جب میں ڈائری میں اس طرح کے الفاظ لکھا کرتا تھا۔

اس (عورت) کے ذریعے میں نے موجین کی قربت کو محسوس کیا اور گرد سے اٹے ہوئے، جھاڑیوں سے سر نکالتے ہوئے اس سائن بورڈ نے جس کے پاس سے ہم ابھی ابھی گذرے تھے، اسے (موجین کو) میرے لیے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

”یہ تقریباً یقینی امر ہے کہ تمھیں اس دفعہ ناظم اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔ سو مضافات میں جا کر کچھ آرام کیوں نہیں کر لیتے۔ ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے تمھاری بھاری ذمہ داریاں ہوں گی۔“

بغیر اسے جانے میری بیوی اور سُسر نے مجھے ایک بڑی عقلمندانہ نصیحت کر دی تھی۔ یہ ان کی ذہانت تھی کہ انھوں نے موجین کا انتخاب ایک ایسی جگہ کے طور پر کیا تھا جہاں میں اپنی پریشانیوں اور ذہنی دباؤ کا حل تلاش کر سکتا تھا۔ یہ نہیں مل کہ یوں ہے کہ جہاں ان کا حل تلاش کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

بس موجین گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ جون کے آخری دنوں کے چمکیلے سورج میں ٹین اور گھاس پھونس کی تمام چھتیں جن پر ٹاکلیں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ لوہار کی دکان سے آنے والی ہتھوڑے کی آوازیں تیزی سے بس کی جانب بڑھتیں اور پھر دور چلی جاتیں۔ کہیں سے جانوروں کی لید سے بننے والی کھاد، اور جب ہم ہسپتال کے پاس سے گزرے تو جراثیم کش ادویات کی بو در آئی۔ ایک سٹیریو کی دکان سے ایک ڈھیلے اور سست قسم کے پاپ گانے کی آواز کا سیلاب امڈ آیا۔ گلی خالی تھی اور لوگ چھتوں تلے دبکے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بچے ننگے اور اپنے قدموں پر ڈگمگاتے ہوئے سائے میں لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ چوک صرف چمکیلی دھوپ سے بھرا ہوا تھا اور اس جگمگاتی دھوپ میں کچھ کتوں کے جوڑے باہر کو لٹکتی زبانوں کے ساتھ نسل کشی میں مصروف تھے۔

☆☆☆☆

گیبرئیل گارشیا مارکیز

انگریزی سے ترجمہ: خالد فرہاد دھاریوال

نیلے کتے کی آنکھیں

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ مگر پھر، جب وہ لیمپ کے پیچھے گھومی اور مجھے اس کی پھسلن بھری چکنی نظر کندھے پر سے ہو کر پیٹھ پر محسوس ہوتی رہی، تب میں سمجھ گیا کہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگائی۔ کرسی کو گھما کر پچھلے پایوں پر متوازن کرنے سے پہلے کسیلے اور تیکھے دھوئیں کا کش لیا۔ اس کے بعد میں نے اسے وہاں دیکھا، جیسے وہ ہر رات لیمپ کے پاس کھڑی ہوئی مجھے دیکھتی تھی۔ کچھ منٹوں تک ہم صرف یہی کیا کرتے تھے: ایک دوسرے کو دیکھنا۔ میں نے پچھلے ایک پائے پر متوازن کرسی سے اسے دیکھا۔ وہ لیمپ پر اپنا لمبا اور ساکت ہاتھ رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی پلکوں کو ہر رات چمکتے ہوئے دیکھا۔ جب میں نے اسے ”نیلے کتے کی آنکھیں“ کہا تو مجھے بہت عام بات یاد آئی: لیمپ سے ہاتھ ہٹائے بنا اس نے مجھ سے کہا، ”اس بات کو ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔“ وہ آہیں بھرتے ہوئے دائرے سے باہر چلی گئی۔ ’نیلے کتے کی آنکھیں‘ میں نے یہ ہر جگہ لکھ دیا ہے۔“

میں نے اسے سنگھار میز کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے روشنی کے دائرے سے پرے، اب میری طرف دیکھتے ہوئے آئینے کے گول شیشے میں ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے مجھ کو تپتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پایا: جب اس نے گلابی رنگ کے سیپ سے ڈھکے چھوٹے سے بکسے کو کھولا تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے ناک پر غازہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد وہ بکسے کو بند کر کے کھڑی ہوئی اور ایک بار پھر یہ کہتے ہوئے لیمپ کے پاس گئی: ”مجھے لگتا ہے کوئی اس کمرے کے بارے میں خواب دیکھ رہا ہے اور میرے بھید کھول رہا ہے۔“ اس نے اپنے لمبے اور کانپتے ہوئے ہاتھ کو لو پر رکھا ہوا تھا جسے وہ آئینے کے سامنے بیٹھنے سے پہلے سینکتی رہی تھی۔ اور اس نے کہا، ”آپ سردی محسوس نہیں کرتے۔“ اور میں نے اس سے کہا، ”بعض اوقات۔“ اور اس نے مجھ سے کہا، ”تم اسے اب محسوس کرو۔“ اور تب میں سمجھا کہ میں نشست پر اکیلا کیوں نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھنڈ مجھے میرے اکیلے پن کا ایقان دے رہا تھی۔

”اب میں اسے محسوس کر رہا ہوں،“ میں نے کہا۔ ”یہ حیرانی کی بات ہے کیوں کہ رات خاموش ہے۔ شاید چادر گر گئی ہے۔“ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے آئینے کی طرف بڑھنے لگی اور میں اپنی پشت اس کی طرف کیے ہوئے پھر سے کرسی میں گھوما۔ اسے دیکھے بنا، میں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ پھر

سے آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی میری پیٹھ کی طرف دیکھ رہی تھی، جس کے پاس آئینے کی گہرائی تک پہنچ کر اس کی نظروں میں آنے کا کافی وقت تھا اور اس کے پاس بھی گہرائی تک پہنچنے اور واپس آنے کا بھرپور وقت تھا– اس سے پہلے کہ ہاتھ کے پاس دوبارہ گھومنا شروع کرنے کا موقع ہوتا۔ جب تک کہ اس کے ہونٹ آئینے کے سامنے پہلی بار ہاتھ گھمانے سے گاڑھے لال نہیں رنگ گئے تھے۔ میں نے اپنے سامنے ہموار دیوار کو دیکھا جو اندھے آئینے کی طرح تھی جس میں اسے میں اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن تصور کر سکتا تھا کہ وہ کہاں ہوگی جیسے کسی آئینے کو دیوار میں کسی جگہ پر لٹکا دیا گیا ہو۔ ’’میں تمھیں دیکھ رہا ہوں،‘‘ میں نے اس سے کہا۔ اور میں نے دیوار پر دیکھا تو ایسا لگا جیسے اس نے اپنی نظروں کو اٹھایا ہو اور اس نے مجھے کرسی سے اپنی پشت اس کی طرف کیے ہوئے اور آئینے کی گہرائی میں میرا چہرہ دیوار کی طرف مڑا ہوا دیکھا ہو۔ میں نے اسے نگاہیں، جو ہمیشہ اس کے سینے پر ٹکیں ہوتیں، پھر سے جھکاتے ہوئے دیکھا، خاموش۔ اور میں نے اسے پھر سے کہا، ’’میں تمھیں دیکھ رہا ہوں۔‘‘ اور اس نے پھر سے چولی سے اپنی نظریں اٹھائیں۔ ’’یہ ناممکن ہے،‘‘ اس نے کہا۔ میں نے اس سے پوچھا، ’’کیوں؟‘‘ اور اس نے پھر سے خاموش نگاہیں چولی پر ڈالتے ہوئے کہا، ’’کیوں کہ تمھارا چہرہ دیوار کی طرف مڑا ہوا ہے۔‘‘ پھر میں نے کرسی کو چاروں اطراف گھما دیا۔ میرے منہ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ جب میں آئینے کے سامنے تھا، اس کی پشت لیمپ کی طرف تھی۔ اب اس نے ہتھیلیوں کو مرغی کے پروں کی طرح لو پر پھیلایا ہوا تھا اور چہرے کو انگلیوں میں چھپا کر آگ سینک رہی تھی۔ ’’لگتا ہے مجھے ٹھنڈ لگنے والی ہے،‘‘ اس نے کہا۔ ’’یہ برف کا شہر ہے۔‘‘ اس نے اپنے چہرے کو ایک طرف کیا اور اس کی جلد تانبئی سے لال رنگ کی ہو گئی تھی۔ وہ اچانک اداس ہو گئی۔ ’’اس کا کچھ کرو،‘‘ اس نے کہا۔ اور وہ اوپر چولی سے شروعات کرتے ہوئے ایک ایک کر کے کپڑے اتارنے لگی۔ میں نے اس سے کہا، ’’میں دیوار کی طرف گھوم جاتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا، ’’نہیں، ویسے بھی، تم مجھے اسی طرح سے دیکھ لوگے جیسے پیٹھ موڑے ہوئے دیکھا تھا۔‘‘ اور جیسے ہی اس نے یہ کہا، وہ لگ بھگ پوری طرح سے بے لباس ہو چکی تھی، روشنی اس کی تانبئی جلد کو چھو رہی تھی۔ ’’میں تمھیں ہمیشہ ایسے ہی پیٹ پر چھوٹے چھوٹے گڑھوں کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا، جیسے تمھیں پیٹا گیا ہو۔‘‘ اور اس سے پہلے کہ مجھے احساس ہو کہ اس کے ننگے ہونے سے میرے الفاظ بے ادب ہو گئے تھے، اس نے خود کو لیمپ کے ارد گرد سینکتے ہوئے کہا، ’’کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں دھات سے بنی ہوئی ہوں۔‘‘ وہ ایک لمحے کے لیے چپ تھی۔ لو پر اس کے ہاتھ تھوڑا ہلے۔ میں نے کہا، ’’کبھی کبھی میں نے خوابوں میں، سوچا کہ تم کسی میوزیم کے کونے میں رکھا چھوٹا سا کانسی کا مجسمہ ہو۔ شاید تم اسی لیے ٹھنڈی ہو۔‘‘ اور اس نے کہا، ’’میں کبھی کبھی دل کے بل بائیں کروٹ سوتی ہوں تب، مجھے لگتا ہے کہ میرا وجود کھوکھلا ہو رہا ہے اور میری جلد تھالی کی طرح ہے۔ اور جب میرے اندر خون دھڑک رہا ہوتا ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرے پیٹ پر دستک دے کر بلا رہا ہے اور میں بستر میں اپنے تانبے کی کھنک محسوس کر سکتی ہوں – آپ کیا کہتے ہیں پرت دار دھات۔‘‘ وہ

لیمپ کے قریب چلی گئی۔ ”میں تمھیں بولتے ہوئے سننا چاہتا ہوں،“ میں نے کہا۔ اور وہ بولی، ”ہم کبھی ایک دوسرے سے ملیں جب میں بائیں کروٹ سوئی ہوں، تو اپنے کان میری پسلیوں کے پاس لے جاؤ گے تو تم میری اس بات کی بازگشت سنو گے۔ میں ہمیشہ چاہتی تھی کہ تم ایسا کرو۔“ میں نے اسے بات کرتے ہوئے بھاری سانس لیتے ہوئے سنا۔ اور اس نے کہا کہ اس نے برسوں سے کچھ بھی مختلف نہیں کیا تھا۔ اس کی زندگی 'نیلے کتے کی آنکھیں جُملے کا استعمال کرتے ہوئے مجھے حقیقت میں کھوجنے کے لیے وقف تھا اور جو بھی اسے سمجھ سکتا تھا، وہ اسے بتاتی ہوئی اسے زور زور سے کہتی ہوئی سڑکوں پر چلتی گئی۔

”میں ہی ہر رات تمھارے خوابوں میں آتی ہوں اور تمھیں بتاتی ہوں: 'نیلے کتے کی آنکھیں۔' اور اس نے کہا کہ وہ ریستوران میں گئی اور کھانے کا آرڈر دینے سے پہلے بیرے سے کہا، ”نیلے کتے کی آنکھیں۔“ لیکن بیروں نے یہ یاد کیے بنا، احترام سے سر جھکا لیے کہ ان کے خوابوں میں کیا کہا گیا تھا۔ پھر وہ نیپکن پر لکھا کرتی تھی اور چاقو سے میزوں کے روغن پر کریدا کرتی تھی: ”نیلے کتے کی آنکھیں۔“ اور ہوٹلوں کی بھاپ بھری کھڑکیوں، اسٹیشنوں، سبھی عوامی جگہوں پر اپنی انگلی سے لکھا کرتی تھی: ”نیلے کتے کی آنکھیں۔“ اس نے بتایا کہ وہ ایک بار دوا خانے میں گئی تو اسی مہک کو محسوس کیا جو ایک رات میرے بارے میں خواب دیکھتے وقت میرے کمرے سے آئی تھی۔ ”وہ آس پاس ہوگا،“ اس نے دوا خانے کی صاف، نئی ٹائلوں کو دیکھ کر سوچا۔ پھر وہ کاؤنٹر کلرک کے پاس گئی اور اس سے کہا، ”میں ہمیشہ آدمی کے بارے میں خواب دیکھتی ہوں جو مجھ سے کہتا ہے: 'نیلے کتے کی آنکھیں،' اور اس نے کہا کہ کلرک نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا، ”محترمہ، دراصل آپ کی آنکھیں ویسی ہیں۔“ اور میں نے اس سے کہا، ”مجھے اس آدمی کی تلاش ہے جس نے میرے خوابوں میں یہ الفاظ کہے تھے۔“ اور کلرک ہنسنے لگا اور کاؤنٹر کے دوسرے کونے پر چلا گیا۔ وہ صاف ٹائلوں کو دیکھتی رہی اور مہک کو سونگھتی رہی۔ اور اس نے اپنا پرس کھولا اور اپنی سُرخی سے ٹائلوں پر گہرے لال رنگ سے لکھ دیا: 'نیلے کتے کی آنکھیں۔' کلرک اپنی جگہ پر واپس آیا اور اس نے اسے بتایا، ”محترمہ، آپ نے فرش گندہ کر دیا ہے۔“ اس نے اسے گیلا کپڑا دے کر کہا، ”اسے صاف کرو۔“ اور وہ لیمپ کے پاس کھڑی ہوئی اس نے بتایا کہ اس نے ساری دوپہر ہاتھوں اور پاؤں کے بل ٹائلیں دھونے میں اور یہ کہتے ہوئے بتا دی: 'نیلے کتے کی آنکھیں۔' جب تک کہ لوگوں نے دروازے پر اکٹھے ہو کر یہ نہیں کہا کہ وہ پاگل ہے۔

اب، جب اس نے بولنا بند کر دیا تھا، میں کونے میں بیٹھ کر کرسی کو جھلاتا رہا۔ ”ہر دن میں نے اس جُملے کو یاد کرنے کی کوشش جس سے میں آپ کو ڈھونڈ سکوں،“ میں نے کہا۔ ”اب مجھے نہیں لگتا ہے میں کل اسے بھول جاؤں گا۔ پھر بھی، میں نے ہمیشہ یہی بات کہی ہے اور جب میں جاگتا ہوں تو میں ہمیشہ ان الفاظ کو بھول جاتا ہوں جن سے میں آپ کو تلاش کر سکتا ہوں۔“ اور اس نے کہا، ”تم نے پہلے دن انھوں اختراع کیا تھا۔“ اور میں نے اس سے کہا، ”میں نے انھوں اس لیے اختراع کیا کیوں کہ میں نے تمھاری راکھ جیسی آنکھوں کو دیکھا تھا۔

لیکن مجھے اگلی صبح کبھی یاد نہیں رہتا۔'' اور اس نے لیمپ کے پاس کھڑے ہو کر مٹھی بھینچتے ہوئے گہری سانس لی، '' کم سے کم یہ تو یاد کر سکتے ہو کہ اسے کس شہر سے لکھ رہی ہوں۔''

اس کے بھینچے ہوئے دانت لو پر چمک رہے تھے۔ ''میں اب تمھیں چھونا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا جو اس کے اور اس کے ہاتھوں کی طرح جلا اور بھنتا ہوا بھی لگ رہا تھا اور مجھے لگا اس نے مجھے کونے میں کرسی جھلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ''تم نے مجھے وہ بات کبھی نہیں بتائی۔'' اس نے کہا۔

''میں اب تمھیں بتا رہا ہوں اور یہ سچ ہے،'' میں نے کہا۔ اس نے لیمپ کی دوسری طرف سے ایک سگریٹ مانگی۔ سگریٹ میری انگلیوں کے بیچ غائب ہو گئی تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے کہا، ''مجھے نہیں پتہ کہ میں یاد کیوں نہیں کر پا رہی ہوں کہ میں نے اسے کہاں لکھا تھا۔'' اور میں نے اس سے کہا، ''اسی سبب سے جس سے کل میں الفاظ کو یاد نہیں رکھ پاؤں گا۔'' اور اس نے اداسی سے کہا، ''نہیں، یہ بات ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ کبھی کبھار میں نے بھی وہ خواب دیکھا ہے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور لیمپ کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دُوری پر تھی، اور میں ہاتھ میں سگریٹ اور ماچس لیے ہوئے گیا اور لیمپ سے آگے نہیں پہنچا۔ میں نے اس کی طرف سگریٹ بڑھائی۔ اس نے اسے ہونٹوں میں دبا لیا اور اس سے پہلے کہ میں ماچس جلاتا وہ لو پر جھک گئی۔ ''دُنیا میں کسی شہر میں، سبھی دیواروں پر، اس جملے کو لکھا جانا چاہیے: 'نیلے کتے کی آنکھیں'،'' میں نے کہا۔ ''اگر مجھے کل وہ لفظ یاد رہے تو میں تمھیں تلاش کر سکتا ہوں۔'' اس نے اپنے سر کو پھر سے اٹھایا اور اب اس کے ہونٹوں کے بیچ جلتا ہوا کوئلہ تھا۔ ''نیلے کتے کی آنکھیں،'' اس نے آہ بھری اور ٹھوڑی پر جھکی ہوئی سگریٹ اور ایک آنکھ آدھی بند کیے ہوئے اسے یاد آیا۔ تب اس نے اپنی انگلیوں کے بیچ سگریٹ کے دھوئیں کا کش لگا کر حیرانی جتائی، ''اب کوئی اور بات ہے۔ مجھے گرمی لگ رہی ہے۔'' اور اس نے یہ اپنی کپکپاتی ہوئی سرد آواز میں کہا جیسے اس نے حقیقت میں ایسا نہ کہا ہو بلکہ کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھ دیا ہو، اور وہ کاغذ کو لو کے قریب لے کر آئی تھی جبکہ میں نے پڑھا ہو: ''مجھے گرمی لگ رہی ہے۔'' اور اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ کاغذ کو پکڑے ہوئے بات جاری رکھی، لیمپ کے گرد کاغذ کو گھماتے ہوئے جیسے برباد کیا جا رہا تھا اور میں نے صرف پڑھا تھا: ''...گرمی۔'' کاغذ پوری طرح سے بھسم ہو گیا تھا اور بھربھرا ہو کر فرش پر گر گیا اور چھوٹا ہو کر ہلکی سی ایش ٹرے میں بدل گیا ہو۔ ''یہ بہتر ہے،'' میں نے کہا۔ ''کبھی کبھی تمھیں اس طرح دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ لیمپ کے پاس کانپتے ہوئے۔''

ہم کئی برسوں کے لیے ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے۔ کبھی کبھی جب ہم ایک ساتھ ہوتے تھے تو باہر کوئی چمچ گرا دیتا تھا اور ہم جاگ جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہماری دوستی حالات اور عام واقعات کے تابع تھی۔ ہماری ملاقاتیں ہمیشہ صبح چمچ کے گرنے کے ساتھ ایک ہی طرح سے ختم ہوا کرتی تھیں۔

اب وہ لیمپ کے پاس بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے مجھے پہلے بھی بہت پہلے خواب

میں اس طرح سے دیکھا تھا جب میں نے کرسی کو پچھلے پایوں پر گھمایا تھا اور راکھ آنکھوں والی عورت کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔ میں نے اس خواب میں اس سے پہلی بار پوچھا تھا، ''تم کون ہو؟'' اور اس نے مجھ سے کہا تھا، ''مجھے یاد نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا، ''لیکن مجھے لگتا ہے ہم نے ایک دوسرے کو پہلے دیکھا ہے۔'' اور اس نے بے پراوائی سے کہا، ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمھارے بارے میں اسی کمرے میں ایک بار خواب دیکھا تھا۔'' اور میں نے اس سے کہا، ''یہی بات ہے۔ اب مجھے یاد آنے لگا ہے۔'' اور اس نے کہا، ''کتنی عجیب بات ہے۔ ہم ضرور دیگر خوابوں میں بھی ملے ہیں۔''

اس نے سگریٹ کے دو کش لگائے۔ میں ابھی بھی لیمپ کے سامنے کھڑا ہوا تھا، کہ اچانک میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے اسے اوپر اور نیچے دیکھا اور وہ ابھی بھی تانبا تھی: اب وہ سخت اور ٹھنڈی دھات نہیں، بلکہ سنہری، نرم اور ملائم تانبا تھی۔ ''میں تمھیں چھونا چاہتا ہوں۔'' میں نے پھر سے کہا۔ اور اس نے کہا، ''تم سب کچھ برباد کر دو گے۔'' میں نے کہا، ''اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے۔ ہمیں بس یہ کرنا ہے کہ اگلی بار ملنے سے پہلے تکیے کو پلٹ دیں۔'' اور میں نے لیمپ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ نہیں ہلی۔ ''تم سب کچھ برباد کر دو گے،'' میں اسے چھو پاتا اس سے پہلے اس نے پھر سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تم لیمپ کے پیچھے سے آؤ گے تو ہم پتہ نہیں دُنیا کے کس حصے میں ڈر کر جاگ جائیں۔'' لیکن میں نے زور دے کر کہا، ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اور اس نے کہا، ''اگر ہم تکیے کو پلٹ دیں گے، تو ہم پھر سے مل پائیں گے۔ لیکن جب تم اٹھو گے تو تم بھول چکے ہو گے۔'' میں کونے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ لو پر ہاتھ سینکتی ہوئی پیچھے رہ گئی۔ اور میں اب بھی کرسی کی بغل میں نہیں تھا جب میں نے اسے اپنے پیچھے سے یہ کہتے ہوئے سنا، ''جب میں آدھی رات کو جاگ جاتی ہوں، میں بستر میں کروٹیں بدلتی رہتی ہوں، تکیے کی جھالر میرے گھٹنے کو جلاتی رہتی ہے، اور صبح ہونے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔' نیلے کتے کی آنکھیں۔'

تب میں نے منہ دیوار کی طرف کیے رکھا۔ ''پو پھٹ گئی ہے،'' میں نے اسے بنا دیکھے کہا۔ ''جب دو کا گھنٹہ بجا تو میں جاگ گیا تھا اور وہ بہت پہلے تھا۔'' میں دروازے کے پاس گیا۔ جب میرے ہاتھ میں دروازے کی دستی تھی، میں نے اس کی وہی، ٹھہری ہوئی آواز پھر سے سنی، ''اس دروازے کو مت کھولو،'' اس نے کہا۔ ''والان اُلجھے ہوئے خوابوں سے بھرا ہوا ہے۔'' اور میں نے اس سے پوچھا، ''تمھیں کیسے پتہ؟'' اور اس نے مجھ سے کہا، ''کیوں کہ میں ایک لمحہ پہلے وہاں تھی اور جب مجھے پتہ چلا کہ میں دل کے بل سو رہی تھی تو مجھے واپس آنا پڑا۔'' میں نے دروازے کو آدھا کھولا۔ میں نے اسے تھوڑا سا ہلایا اور ٹھنڈی، ہلکی سی ہوا میرے پاس سرسبز زمین، مرطوب کھیتوں کی تازہ باس لے کر آئی۔ وہ پھر سے گویا ہوئی۔ میں نے دستی کو گھماتے ہوئے قبضوں پر ٹکے دروازے کو ہلاتے ہوئے اس سے کہا، ''مجھے نہیں لگتا کہ وہاں والان ہے۔ مجھے گاؤں کی مہک آ رہی ہے۔'' اور اس نے کچھ دُوری سے کہا، ''میں اسے تم سے بہتر جانتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ایک عورت گاؤں

کے بارے میں خواب دیکھ رہی ہے۔" اس نے اپنے بازوؤں کو لو پر گھمایا۔ وہ بولتی رہی، "وہ ایسی عورت ہے جو ہمیشہ دیہات میں گھر چاہتی تھی اور کبھی بھی شہر کو چھوڑ نہیں پائی تھی۔" مجھے وہ عورت پچھلے کچھ خوابوں میں دیکھی ہوئی یاد آئی، مگر اب ادھ کھلے دروازے کے ساتھ میں جانتا تھا کہ مجھے آدھے گھنٹے کے اندر ناشتے کے لیے نیچے جانا ہوگا۔ اور میں نے کہا، "بہر حال، مجھے جاگنے کے لیے وداع لینی ہوگی۔"

باہر ہوا پل بھر کے لیے چلی، پھر رُک گئی، اور ایسے آدمی کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی جس نے بستر میں ابھی کروٹ لی تھی۔ کھیتوں سے ہوا آنا بند ہو گئی تھی۔ اب مہک نہیں آ رہی تھی۔ "کل میں تمھیں اس سے پہچان لوں گا،" میں نے کہا۔ "سڑک پر میں تمھیں تب پہچان لوں گا جب کوئی عورت دیواروں پر لکھ رہی ہوگی، 'نیلے کتے کی آنکھیں۔'" اور اس نے نارسائی اور غیر ممکن کو تسلیم کرنے والی اداس مسکان کے ساتھ کہا، "تب بھی تمھیں دن میں کچھ بھی یاد نہیں رہے گا۔" اور اس نے اپنے ہاتھ پھر سے لیمپ پر رکھ دیے، اس کا وجود کیسلے بادل سا سیاہ ہو گیا۔ "تم اکیلے آدمی ہو جسے جاگنے کے بعد جو خواب دیکھا اس کا کچھ بھی یاد نہیں ہے۔"

☆☆☆☆

میخائل شولوخوف

انگریزی سے ترجمہ: ارشد چہال

لازوال تبسم

ٹروفم اپنے کمرے سے نکلا اور دروازہ بند کر کے اصطبل کی طرف چل پڑا۔ اصطبل میں داخل ہوتے ہی اس کا دھیان بچھڑے پر پڑا جو گھوڑی کے تھنوں میں منہ دیے کانپ رہا تھا، ٹروفم بچھڑے کو دیکھ کر گھبرایا۔

"میں اس بچھڑے کا کیا کروں گا"؟

بچھڑا اپنے ننھے مخملی پاؤں پر کھڑا کسی کھلونے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ٹروفم نے بچھڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود سے کہا۔

"کیا میں اسے گولی مار دوں"؟

گھوڑی نے یکا یک منہ پھیر کر سرخ انگارہ آنکھوں سے اپنے مالک کو دیکھا...... کمانڈر اپنے ہاتھوں میں چائے کی پیالی لیے بیٹھا تھا۔ اس نے پیالی کو اتنے زور سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ دشمنوں پر حملہ کرتے وقت اپنی رائفل کو کاندھے سے لگاتا تھا۔

"اس بچھڑے کو گولی مار دینا ہی اچھا ہے۔ ورنہ اس کو ساتھ ساتھ لیے پھرنے پر لوگ ہمیں پکھی واس سمجھنے لگیں گے"۔ ٹروفم نے کمانڈر کے قریب آ کر کہا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ پکھی واس لگنا تو اور بات ہے اگر کہیں سی او آ گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ تم خود سوچو اگر وہ رجمنٹ کا معائنہ کرنے کے لیے آ گیا اور درمیان میں بچھڑا کودنے لگ گیا تو ساری سُرخ فوج میں ہمارا مذاق بن جائے گا"۔

اگلے روز صبح ٹروفم جب اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر کمانڈر نے پوچھا "کیا بچھڑے کو گولی مارنے جا رہے ہو"؟

ٹروفم نے ہاں میں سر ہلایا اور اصطبل کی طرف چل پڑا۔

کمانڈر سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے کان متوقع فائر کی آواز پر لگے ہوئے تھے...... ایک منٹ...... دو منٹ...... پھر کئی منٹ گزر گئے مگر فائر کی آواز نہ آئی...... کچھ دیر کے بعد ٹروفم آتا دکھائی دیا!

"کیا ہوا؟"

''شاید میری رائفل خراب ہوگئی''

دکھاؤ...... کیسے خراب ہوگئی''

ٹروفم نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ رائفل کمانڈر کی طرف بڑھا دی۔ کمانڈر نے رائفل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اس میں تو کارتوس ہی نہیں ہے''

''وہ...... وہ میں نے خود ہی کارتوس نکال کر اصطبل کے ڈھیر پر پھینک دیا ہے''۔

''خیر...... اسے جینے دو...... کچھ دن کے بعد اسے پھڑکا دینا'' کمانڈر نے رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

ایک مہینہ گزر گیا، اس اثنا میں ٹروفم کی یونٹ اور کوسیک کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ جنگ شام سے ذرا پہلے شروع ہوئی تھی، اپنی پلٹون میں ٹروفم سب سے پیچھے تھا۔ اس نے چھانٹے مار مار کر گھوڑی کے ناک اور منہ سے لہو چھڑا دیا تھا۔ مگر گھوڑی دُڑکی چال پر نہ آئی، وہ چلتے چلتے اچانک رک جاتی تھی اور جب تک بچھڑا اس کے قریب نہیں پہنچ جاتا تھا وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھاتی تھی۔

انتہائی غصے کے عالم میں ٹروفم گھوڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا، رائفل کاندھے سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لی۔ دائیں ہاتھ والے فوجی دستے کا سفید پہرہ داروں سے بھیڑ ہو گیا تھا اور ڈھلوان پر دونوں فوجیں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے لگی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے وہ آندھی اور طوفان میں گھرے کسی چھتنار درخت کی طرح دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ لڑائی جاری تھی اور ڈھلوان پر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ٹروفم نے فوجوں کو لڑتے دیکھا اور پھر اپنی رائفل سیدھی کر کے بچھڑے پر گولی چلا دی مگر شاید گھبراہٹ یا کسی اور وجہ سے اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے اور نشانہ چوک گیا تھا۔ بچھڑا ہنہناتا ہوا چوکڑی بھر کے پرے جا کھڑا ہوا۔

وہ رات ٹروفم کی یونٹ نے ریت بھرے صحرا میں گزاری تھی، ساری رات کسی فوجی نے سگریٹ تک نہ پیا تھا۔ گھوڑوں سے زینیں بھی نہ اتاری تھیں۔ آدھی رات کے بعد ایک گشتی دستے نے ڈان سے مڑتے ہوئے خبر دی تھی کہ کراسنگ پر دشمن کی فوج جمع ہو رہی ہے۔

سورج نکلنے سے ذرا دیر پہلے کمانڈر ٹروفم کے پاس آیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''ٹروفم اس بچھڑے سے جان چھڑاؤ...... یہ جنگ میں فوجیوں کو خراب کر رہا ہے، ان کا دھیان بٹا رہا ہے۔''

''میں نے اس کو مارنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر جانے کیوں اس کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، اور میرا نشانہ چُوک جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں یہ مجھے اتنا پیارا لگتا ہے اسے مارنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ میرا تو یہ سوچ کر دل کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں فوجوں کی لڑائی میں آ کر یہ کچلا ہی نہ جائے۔''

کمانڈر اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگا مگر ٹروفم اس کی ہنسی نہ دیکھ سکا۔ کچھ دیر تو ٹروفم اوورکوٹ اوڑھ کر بیٹھا رہا پھر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت فوج نے ندی کو پار کرنا شروع کر دیا۔ کمانڈر نے سب سے پہلے بھری ندی میں چھلانگ لگائی اور اس کے پیچھے ایک سو آٹھ جوانوں نے جنھوں نے اپنی قمیضیں اتار رکھی تھیں۔ اپنے گھوڑوں کے ساتھ ندی میں اتر گئے۔ گھوڑوں کی زینیں اور کچھ دوسرا سامان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں لاد دیا گیا تھا۔ اپنی کشتیوں میں ایک پر ٹروفم سوار تھا۔ اس نے اپنی گھوڑی کمانڈ کو دے دی تھی۔ ٹروفم نے چپو ایک طرف رکھ دیا اور ندی پر تیرتے جوانوں اور گھوڑوں کو دیکھنے لگ گیا۔ جن کے جسم تو پانی میں تھے مگر سر پانی کی نیلی چادر پر دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے کچھ ہی فاصلے پر بچھڑا دکھائی دیا۔ وہ تیرتے تیرتے کبھی تو اپنا منہ پانی سے باہر نکال لیتا تھا اور کبھی پانی میں ڈوب جاتا تھا۔ شاید وہ تھک چکا تھا۔ اچانک ٹروفم کے کانوں میں اس کی درد بھری آواز اُبھری۔ ہی۔ ہی۔ ہی .... بچھڑے کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز ٹروفم کے دل میں کسی خنجر کی طرح اُتر گئی۔ گزشتہ پانچ سالوں کی مسلسل جنگی زندگی میں اس کا دل کبھی اس طرح نہیں کانپا تھا مگر آج ایک ڈوبتے ہوئے بچھڑے کی آواز سن کر اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

ندی کی بے رحم لہریں بچھڑے کو بہا کر کافی دور لے گئی تھیں اب وہ پانی کے بھنور میں پھنس کر گھوم رہا تھا۔ ٹروفم نے کشتی اس بھنور کی طرف موڑ دی۔

ندی کے پانی پر دشمنوں کی فائرنگ سے گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پھٹی ہوئی قمیض والا فوجی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا اور اس کی رائفل شعلے اُگل رہی تھی۔

بچھڑے کی آواز آہستہ آہستہ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ ٹروفم نے اپنے بوٹ اتار کر کشتی میں رکھ دیے۔ پھٹی ہوئی قمیض والے افسر نے اسے دیکھ کر دائیں کنارے سے “ہولڈ فائر” کی آواز لگائی۔ جس کے بعد یکا یک خاموشی ہو گئی۔ ٹروفم کو بچھڑے تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگ گئے۔ اس نے بچھڑے کو اپنی باہنوں میں اٹھا لیا اور اسے کھینچتا ہوا دائیں کنارے تک لے آیا۔ بچھڑا سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے سبز رنگ کا پانی رالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

ٹروفم کنارے پر پہنچ کر ڈگمگاتے قدموں پر چند لمحے کھڑا رہا۔ پھر دو قدم آگے بڑھا اور منہ کے بل گیلی ریت پر گر گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی چھاتی میں آتشیں خنجر گھونپ دیا ہو۔ گرنے سے پہلے اس نے ایک فائر کی آواز سُنی تھی۔

دائیں کنارے پر کھڑے پھٹی ہوئی قمیض والے افسر نے اپنی رائفل سے کارتوس کا خول نکال کر پھینک دیا۔

بچھڑے کے قریب ہی ٹروفم بے ہوش پڑا تھا۔ اس کا سارا بدن پتھر ہو چکا تھا مگر اس کے نیلے ہونٹ، جنھوں نے پچھلے پانچ سالوں سے کسی معصوم بچے کے گالوں پر پیار نہیں کیا تھا۔ ہنس رہے تھے۔

انتون چیخوف

انگریزی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

ہائے عوام----!

”یہیں پر، میں نے پینا چھوڑ دی تھی! کچھ بھی نہیں----کچھ بھی مجھے اس کی طرف راغب نہیں کر سکتی۔ یہی وقت ہے کہ میں نے اپنا ہاتھ تھامنا ہے۔ مجھے خود کو بحال کرنا ہے اور کام کرنا ہے----آپ خوش ہیں کہ آپ اپنی تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے آپ کو اپنا کام دیانت داری، دل جمعی اور احتیاط سے کرنا چاہیے۔ آرام اور نیند کو بالائے طاق رکھ کر۔ نوکری کو لات مارنا کوئی آسان کام نہیں۔ میرے لڑکے! تمھیں یہاں کچھ نہ کرنے کی تنخواہ نہیں دی جا رہی۔ یہ بالکل بھی اچھی بات نہیں----اور کبھی اچھا عمل نہیں۔“

ہیڈ ٹکٹ کلکٹر Podtyagin خود کو اس طرح کے بے شمار لیکچر دینے کے بعد، اپنے کام کی جانب واپسی کے لیے ایک لطف انگیز خواہش محسوس کرنے لگا تھا۔ رات کا ایک بجا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ٹکٹ کلکٹر کو جگاتا تھا اور اُن کو ساتھ لے کر ریلوے ڈبوں میں ٹکٹ چیک کرنے کے لیے گھومتا پھرتا۔

”ٹکٹ---کٹ---پلی---لیز---پلیز“ وہ تیزی سے ناخن چباتے ہوئے چیختا۔ ریلوے ڈبوں کی دھیمی روشنی میں، لحافوں میں لپٹے سوئے ہوئے ہیولوں کو وہ ہلاتا، جگاتا، اُن کے سر سے پکڑ کر اُن کو زور سے ہلاتا اور اُن کے ٹکٹ چیک کرتا۔

”ٹک---کٹ---ٹکٹ---پلی---لیز---پلیز“ Podtyagin نے ایک سیکنڈ کلاس ڈبے کے مسافر کو جگاتے ہوئے مطالبہ کیا، وہ ایک بہت کمزور اور پتلا سا شخص تھا جس نے پروں سے بنے کوٹ اور ایک کمبل کے ایک ٹکڑے سے خود کو لپیٹا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد تکیے پڑے تھے۔

”ٹکٹ پلیز----“

اُس کمزور اور لاغر سے شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مکمل نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے دوبارہ اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور بے صبری سے دوبارہ کہا۔

”ٹکٹ---کٹ---ٹکٹ---پلی---لیز---پلیز۔“

مسافر نے اپنی خواب آلود آنکھیں کھولنا شروع کیں اور Podtyagin کو ہوشیاری سے دیکھا۔

”کیا---؟ کون---؟---او---“

”آپ سے آسان زبان میں پوچھا گیا ہے---ٹکٹ پلیز---اگر پلیز دے سکتے ہیں تو---!“

”میرے خُدایا!“ وہ کمزور اور لاغر شخص بُرا منہ بناتے ہوئے منمنایا۔ ”خُدایا مجھے! میں جوڑوں کے درد کا مریض ہوں اور پچھلی تین راتوں سے نہیں سویا ہوں---میں نے سونے کے لیے ابھی افیم کھائی ہے اور تم---اپنی ٹکٹ کے ساتھ---! یہ ظلم ہے---! یہ بے رحمی ہے---! اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ میرے لیے سونا کتنا مشکل کام ہے، تم مجھے اس بکواس کام کے لیے کبھی بھی نہ جگاتے---یہ ظلم ہے---! یہ بے ہودگی ہے---! اور تمھیں میری ٹکٹ کا کیا کرنا ہے---! یہ یقیناً حماقت کے علاوہ کچھ نہیں---!“

Podtyagin ہچکچا رہ جاتا ہے کہ وہ اپنا جرم تسلیم کرے یا نہیں اور پھر اپنا جرم ماننے کا فیصلہ کرتا ہے۔

”یہاں پر مت چیخو! یہ کوئی سرائے نہیں ہے---!“

”نہیں، سراؤں میں زیادہ انسانیت دوست لوگ ہوتے ہیں---“ مسافر نے کھانستے ہوئے کہا، ”شاید تم مجھے کسی اور وقت سونے دو گے! یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ میں نے کئی بار بیرونِ ملک سفر کیا ہے، تمام جگہوں پر اور وہاں پر کسی نے بھی کبھی میری ٹکٹ کے بارے میں نہیں پوچھا اور یہاں پر تم مجھ سے بار بار اس کے بارے میں ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمھارے پیچھے کوئی بھوت لگا ہو---“

”اچھا، پھر تو آپ کو بیرونِ ملک ہی جانا چاہیے کیوں کہ آپ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔“

”یہ بالکل بے وقوفی ہے، جناب! ہاں---! اگرچہ یہ کافی نہیں ہے کہ مسافروں کو اس گھٹن اور باسی ہوا اور پسینے کے بھبکے سے مار دیا جائے۔ وہ سُرخ فیتے سے ہمارے گلے گھونٹنا چاہتے ہیں---اس سب پر تف ہے---! اُن کے پاس ٹکٹ ضرور ہونا چاہیے! ہائے میرے خدایا---! یہ کیسا جذبہ ہے---! اگر کمپنی کو اس بات سے کوئی فائدہ ہوتا---تو آدھے سے زیادہ مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر نہ کر رہے ہوتے---“

”سنیں، جناب!“ Podtyagin غصے سے چلایا۔ ”اگر آپ نے اپنی بکواس بند نہ کی اور عوام کو پریشان کرتے رہے تو میں آپ کو اگلے سٹیشن پر ٹرین سے اُتار دوں گا اور اس واقعے کی رپورٹ کر دوں گا۔“

”یہ توہین آمیز ہے---!“ لوگوں نے آواز اٹھائی جو اُن کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

”ایذا رسانی سراسر تکلیف ہے---! سنو اور اس پر تھوڑا غور کرو---“

”لیکن یہ حضرت خود ہی اتنے بدتمیز اور بداخلاق ہیں---!“ Podtyagin نے تھوڑا سا ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”اچھی بات---میں ٹکٹ نہیں دیکھوں گا---جیسا آپ لوگ کہیں---صرف،---یقیناً جیسا کہ

آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اگر میں اپنی ڈیوٹی پر نہ ہوتا۔۔۔تب۔۔۔یقیناً آپ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ سکتے تھے۔۔۔یا جس کسی سے بھی آپ پوچھنا چاہیں۔۔۔“

Podtyagin نے اپنے کندھے اُچکائے اور وہاں سے چلتا بنا۔ پہلے پہل اس کو سُبکی محسوس ہوئی اور کچھ حد تک دل پہ چوٹ سی محسوس ہوئی۔ تب دو یا تین ڈبے گزرنے کے بعد، اُس کو ایک یقینی سی بے چینی محسوس ہوئی لیکن ویسی نہیں جیسی اُس کے ٹکٹ چیک کرنے والے سینے کی گہرائی میں کبھی نہ اُبھری تھی۔

”لیکن صرف ٹکٹ چیک کرنے کے لیے کسی سوئے ہوئے شخص کو جگانا ضروری نہ تھا۔“ اُس نے سوچا، ”اگر یہ میری غلطی نہ تھی۔۔۔وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے یہ سب کچھ شوخی میں کیا ہے۔۔۔وہ نہیں جانتے کہ میں اپنے فرض میں جکڑا ہوا ہوں۔ اگر وہ اس بات پر یقین نہیں کرتے تو میں اسٹیشن ماسٹر کو اُن کے پاس لا سکتا ہوں۔“

ہر اسٹیشن پر ٹرین پانچ منٹ کے لیے رُکتی ہے۔ تیسری گھنٹی سے پہلے Podtyagin ایک بار پھر دوبارہ اسی سیکنڈ کلاس ڈبے میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے سرخ ٹوپی پہنے اسٹیشن ماسٹر بھی ٹہلتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”یہ صاحب یہاں پر ہیں۔“ Podtyagin نے بات شروع کی۔ ”یہ کہتے ہیں کہ مجھے ٹکٹ کے بارے میں پوچھنے کا کوئی حق نہیں اور۔۔۔اور انھوں نے مجھ پر الزام تراشی کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، جناب اسٹیشن ماسٹر صاحب کہ آپ ان حضرات کو بتائیں کہ۔۔۔قانون کے مطابق مجھے ٹکٹ کا پوچھنا چاہیے یا صرف خود کو خوش رکھنا چاہیے۔“ Podtyagin نے اُس لاغر شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”جناب! آپ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پوچھ سکتے ہیں یہاں پر اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں تو۔۔۔“

”وہ بیمار شخص دوبارہ اپنی سیٹ پر دراز ہو چکا تھا، اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بُرا منہ بناتے ہوئے اپنی سیٹ پر دوبارہ لڑھک گیا۔

”میرے خدایا! میں نے ابھی دوبارہ افیم کھائی ہے اور ابھی مجھے اونگھ آئی تھی کہ یہ دوبارہ آن ٹپکا ہے۔ میں تمھاری التجا کرتا ہوں کہ مجھ پر کچھ رحم کھاؤ۔“

آپ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ سکتے ہیں۔۔۔کہ مجھے آپ کی ٹکٹ کے بارے میں پوچھنے کا حق ہے یا نہیں۔۔۔“

”یہ ناقابلِ برداشت ہے۔۔۔! یہ لو اپنی ٹکٹ۔۔۔یہ پکڑو۔۔۔! میں تمھیں پانچ روپے زیادہ دوں گا اگر تم مجھے سکون سے مرنے دو گے! کیا تم کبھی بھی بیمار نہیں ہوئے ہو؟ سنگ دل لوگ۔۔۔!“

”یہ بالکل غیر قانونی عمل ہے۔۔۔! فوجی لباس میں ملبوس ایک شخص نے غصے سے کہا ”میرے پاس

اس کے صبر کی کوئی اور مثال نہیں ہے۔ ''

''چھوڑا۔۔۔۔'' اسٹیشن ماسٹر نے ماتھے پر تیوری سجاتے ہوئے کہا اور وہ Podtyagin کو آستین سے پکڑ کر نیچے لے گیا۔

Podtyagin نے اپنے کندھے اُچکائے اور آہستگی سے اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے چل پڑا۔

''یہ کسی بات سے بھی خوش نہیں ہیں۔۔۔۔!'' اس نے حیرت سے سوچا، ''اس کی خاطر میں اسٹیشن ماسٹر کو لے کر آیا تا کہ وہ سمجھ سکے اور اُس کی تشویش ختم ہو اور وہ۔۔۔۔قسم سے۔۔۔۔!''

اگلے اسٹیشن پر ٹرین دس منٹ کے لیے رُکی۔ دوسری گھنٹی سے پہلے، جب Podtyagin اسٹیشن کے کیفے ٹیریا میں کھڑا سوڈا واٹر پی رہا تھا۔ دو حضرات جن میں سے ایک انجینئر کی یونیفارم اور دوسرے نے فوجی کوٹ پہنا ہوا تھا، اس کی جانب آئے۔

''سنو! ٹکٹ کلکٹر!'' انجینئر نے Podtyagin کو مخاطب کرتے ہوئے بات شروع کی، ''اس بیمار شخص کے ساتھ تمھارے رویے نے سب کو غصے اور حیرت سے دوچار کیا ہے۔ جس جس نے بھی یہ واقعہ دیکھا ہے۔ میرا نام Puzitsky ہے۔ میں ایک انجینئر ہوں اور یہ ایک کرنل ہے۔ اگر تم نے اس مسافر سے معافی نہ مانگی تو ہم دونوں ٹریفک منیجر کے پاس تمھاری شکایت کریں گے جو کہ ہمارا دوست ہے۔''

''حضرات! لیکن میں کیوں۔۔۔لیکن آپ کیوں۔۔۔'' Podtyagin اُن کی بات سُن کر بوکھلا گیا۔

''ہمیں وضاحتیں نہیں چاہئیں لیکن ہم تمھیں خبردار کرتے ہیں۔ اگر تم نے معافی نہ مانگی تو ہم اس کو انصاف ضرور دلوائیں گے۔''

''یقیناً۔۔۔۔ضرور میں معافی مانگوں گا۔۔۔۔ضرور۔۔۔۔''

آدھے گھنٹے کے بعد Podtyagin نے معافی مانگنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کرتے ہوئے معافی طلب جملہ بھی سوچ لیا تھا جو نہ صرف ان کی شان و شوکت پر حرف آئے بغیر مسافر کو مطمئن کر دے گا۔ وہ آہستہ قدم اٹھاتا ڈبے میں چلنے لگا۔

''محترم!'' اس نے اس بیمار شخص کو مخاطب کیا۔۔۔ ''سُنیں جناب۔۔۔۔!''

بیمار شخص نے آنکھیں کھولیں اور اُچھل پڑا۔۔۔ ''کیا ہے۔۔۔۔؟''

''میں۔۔۔۔یہ کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔کہ آپ پر میں نے الزام دھرا۔۔۔۔''

''اوہو! پانی۔۔۔'' بیمار نے اپنا دل پکڑ کر سسکی بھری۔ ''میں نے ابھی ہی افیم کی تیسری خوراک لی ہے، ابھی سویا ہی تھا اور۔۔۔۔دوبارہ تم۔۔۔۔اوہ میرے خدایا! یہ اذیت کب ختم ہوگی۔۔۔۔!''

”میں صرف ---آپ سے معذرت ---“

”اوہو ---! مجھے اگلے اسٹیشن پر ٹرین سے اُتار دو ---! میں اب اس ٹرین پر مزید سفر نہیں کر سکتا ---میں ---میں ---میں مر رہا ہوں ---“

”یہ بہت ہی اذیت ناک اور توہین آمیز ہے ---! عوام غصے سے چلائی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے! تمھیں اس بے ہودگی اور بدتمیزی پر جرمانہ کیا جائے ---! نکل جاؤ ---دفع ہو جاؤ ---“

Podtyagin نے مایوسی سے اپنا ہاتھ لہرایا، منمنایا اور ڈبے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے آرام کرنے والے کمرے میں گیا۔ پریشانی کی حالت میں میز پر بیٹھ گیا اور شکایت کرنے لگا۔

”ہائے یہ عوام! کوئی بات بھی ان کے لیے گراں نہیں! یہاں پر کام کرنے اور اچھے سے اچھا کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ---! کوئی بھی نشے میں ڈوبا ہوا سب کے سامنے آپ کی بے عزتی کر دیتا ہے ---! اگر آپ کچھ بھی نہ کرو ---تو بھی وہ غصہ کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہو تو بھی اُن کو غصہ آتا ہے۔ اس لیے، کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے اور صرف پینی چاہیے ---!“

Podtyagin نے شراب کی پوری بوتل اپنے اندر انڈیلی اور مزید کام، فرض اور ایمانداری کے بارے میں سوچنا ترک کر دیا۔

☆☆☆☆

براہوئی تخلیق و ترجمہ: حمیرا صدف حسنی

نظم

اس خاموشی کے منظر میں
دھیمی دھیمی سرگوشی ہے
کچھ دھندلی دھندلی تصویریں
ہیں ایسی پختہ تحریریں
سُکھ کی ہلکی سی رم جھم ہے
دکھ کے گہرے سے بادل ہیں
دھیما دھیما اک سرگم ہے
نرم و نازک سے سپنے ہیں
اس خاموشی کے منظر میں
بیتے لمحوں کی آہٹ ہے

☆☆☆☆

منیر مومن

بلوچی زبان سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

کوئی دیا صبح تک جلا کر دیکھنا ہے

کوئی دیا صبح تک جلا کر دیکھنا ہے
ہمیں اپنا ہی تماشا دیکھنا ہے

درخت ہو، پتھر ہو یا کہ ماہ ہو
دل کو آج اِن پہ ایمان لا کر دیکھنا ہے

تیری عنبریں زلفوں کے پیچ وخم میں سو رہی ہے
رات کا دامن پاٹ کر مجھ کو دیکھنا ہے

جن آنکھوں میں دشمنوں نے بسیرا کر لیا ہے
اُنھی آنکھوں سے یاروں، دوستوں کو دیکھنا ہے

یہ آگ کی صدی گزرے، تو کیا عیاں ہو؟
میں تو آنکھ ہوں اور مجھ کو دیکھنا ہے

☆☆☆☆

امیر عثمان

پشتو زبان سے ترجمہ: زینت سلطانہ

چراغ تلے اندھیرا

ویسے تو شیر کریم کی مینا بازار میں ایک چھوٹی سی دکان تھی لیکن اللہ کے فضل سے دکان سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گھر کا گزارہ آسانی سے ہو جاتا۔ اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام ماں نے پیار سے ملالہ رکھا تھا۔ ملالہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھی، ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آتی۔

جب سے ملک کا نظام بدل گیا تھا اس تبدیلی کی وجہ سے شیر کریم کا گھرانہ مضطرب تھا۔ اس اضطراب کا اثر دکان پر بھی پڑا تھا۔ آئے دن پھیلتی افواہوں کی وجہ سے وہ بے حد پریشان رہتا۔ عجیب ناگوار باتیں سن سن کر اس کا دکان میں بیٹھنے کو دل نہ کرتا تھا۔ کچھ لوگ کہتے کہ یہ نئے حکمران کافر ہیں یہ نہ خدا کو مانتے ہیں نہ رسول کو۔ کوئی کہتا یہ بیرونی ایجنٹ ہیں، انھوں نے اپنے ملک کو غیروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ کبھی یہ خبر آتی کہ ان کی تو نام کی حکومت ہے، اصل میں حکم کسی اور کا چلتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایک دن شیر کریم نے ایک ایسی خبر سنی جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک صبح اس نے دکان کھولی ہی تھی کہ اس کا ایک ہمسایہ دکاندار ملک رحیم پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آیا اور بولا شیر کریم آج تو میں نے ایسی خبر سنی ہے کہ دل پھٹنے کو ہے نہ کسی کو بتا سکتا ہوں اور نہ ہی چھپا سکتا ہوں۔ تم میرے دوست ہو لہٰذا تمھیں بتانے آیا ہوں کہ میرا ایک واقف کار جو صدارتی محل میں ملازم ہے۔ اس نے بتایا کہ ان نئے حکمرانوں نے صدارتی محل کے ایک کمرے میں قرآن پاک اور سیپارے زمین پر رکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ ان بد ذات حاکموں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں وہ پہلے اِن مقدس کتابوں پر جوتوں سمیت چلیں پھریں تو یہ نعوذباللہ۔ اس موقع پر شیر کریم نے غیر شعوری طور پر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کی۔ جب یہ منافقین یہی کام کر گزرتے تو ان کو پارٹی کا کوئی اعلیٰ عہدہ دیا جاتا ہے۔ شیر کریم سن کر اور بھی غمگین ہوا۔ پھر کچھ دیر بعد خود کو سنبھالا اور کہا کہ بھائی رحیم تمھیں اور مجھے تو یہ کفر کرنے کو نہیں کہا گیا۔ ہمیں کیا، قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کی حفاظت وہ اعلیٰ ذات خود ہی کرے گی۔ اگر ان لوگوں نے واقعی یہ حرکت کی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو بڑی سزا دے۔ (آمین) ہمارا کام تو بس یہی دکانداری ہے تا کہ ہم اپنے بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ دن رات گزرتے رہے۔ ملکی سیاست میں سرد و گرم چلتا رہا۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اقتدار اور کرسی کی جنگ ہے آج کے دوست کل کے دشمن اور کل کے دشمن آج

کے دوست۔

کبھی کبھی صوبوں سے جنگ کی خبریں آتیں البتہ دارالحکومت میں سکون تھا ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ کبھی کبھار حاکموں کے بدلنے کی خبریں بھی آ جاتی تھیں۔ لوگ کہتے ہمارے حاکم تو سپر طاقتوں کی کٹھ پتلیاں ہیں وہ جو حکم صادر کرتے ہیں اس پر عمل ہو جاتا ہے۔ یہی طاقتیں جب اور جس کو چاہتے ہیں اقتدار کی مسند پر بٹھا دیتے ہیں اور جن کو ہٹانا چاہتے ہیں ہٹا دیتے ہیں۔ وقت کا کارواں یونہی رواں دواں تھا۔ کہیں سے لڑائی جھگڑے کی خبریں آ جاتیں۔ عام لوگ تو اپنے رزق کے چکر میں رہتے۔ ان جھگڑوں میں نہ پڑتے اگرچہ وہ اپنے پرانے نظام حکومت کو یاد کرتے تھے جس کی وجہ سے ملک میں امن وامان قائم تھا۔

کچھ عرصہ بعد یہ خبر سنی گئی کہ اللہ کے سپاہی فاتح قرار پائے اور ملحدوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ اب انشاء اللہ اسلامی مساوات اور انصاف کی حکومت قائم ہوگی۔ شیر کریم اور ملک رحیم نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور حسب توفیق مٹھائی بھی تقسیم کی بل کہ شیر کریم نے اپنی دکان سے وہ کچھ باٹ بھی اٹھا کر باہر پھینک دیے جو اس نے اضافی تول کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ اسے پکا یقین تھا کہ اب اسلامی حکومت آئے گی۔ اب ناپ تول میں کمی اور چوری بڑا گناہ سمجھا جائے گا لیکن وہ جو کسی کا معقولہ مشہور ہے کہ سکون اور خوشحالی کی زندگی تھوڑی ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہوا کہ فاتح گروہوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ کوئی کہتا وہ سنّی ہے، یہ شیعہ ہے، ان دورنگی عقیدوں کی وجہ سے کشمکش پیدا ہوئی۔ وجہ کوئی بھی ہو لوگوں کا آرام وسکون تباہ ہوگیا۔ بے قراری بڑھ گئی۔ اب لوگوں میں خوف وہراس پھیلتا گیا۔ شہروں سے چوری اور ڈاکہ زنی کی خبریں آنے لگیں۔ ویسے بھی شہروں میں پولیس کا محکمہ افراتفری کا شکار تھا۔ ان وارداتوں کو کون روکتا۔ اب لوگوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا اگر کسی کو بہت ہی ضروری کام سے جانا ہوتا تو کوشش یہ ہوتی کہ جلد از جلد گھر کو واپس پہنچا جائے۔ اگر مرد گھروں سے باہر ہوتے تو عورتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتیں۔

جب خطرناک اسلحہ کا استعمال شروع ہوا، شہروں پر راکٹ گرائے جاتے تو نہ کوئی گھر سے نکلتا نہ ہی کوئی کاروبار ہوتا۔ اب تو ایسا دکھائی دیتا کہ اگر یہ خانہ جنگی جلد ختم نہ ہوئی تو نہ کسی کا کاروبار بچے گا اور نہ ملازمت باقی رہے گی۔ یہ خوبصورت شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو جائے گا۔

جب کسی دن کچھ سکون ہوتا تو شیر کریم اپنی دکان کھول لیتا۔ بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا تھا۔ لیکن اس کی کوشش ہوتی کہ بعد از نماز عصر دکان بند کر دے اور اندھیرا چھا جانے سے پہلے گھر لوٹ جائے۔ ویسے بھی تمام مارکیٹ والے جلدی دکانیں بند کر دیتے تھے۔ سر شام بازار ویران ہو جاتے۔ حالات اسی طرح رہے، اب لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ شہر میں حملے کس وقت شروع ہوتے اور کب ذرا رک جاتے ہیں اور کون سے علاقے

نسبتاً محفوظ ہوتے ہیں، وہاں سے لوگ گھروں کے لیے سودا سلف خریدنے جاتے۔

اب کچھ دنوں سے یہ افواہ بھی گردش کر رہی تھی کہ شہر میں کچھ ایسے لوگ داخل ہوئے ہیں جن کا کام صرف ڈاکے ڈالنا، چوری اور راہزنی ہوتا ہے۔ شیر کریم نے خود ہی چند مشکوک لوگوں کو دیکھا تھا۔ یہ لمبے بالوں والے لوگ عبائیں پہنے ہوتے تھے۔ اکثر اوقات ہاتھوں میں بندوق لیے گھوم رہے ہوتے۔ شہر میں اسلحہ برداروں کی کمی نہ تھی۔ ان نئے ڈاکوؤں کی آمد سے لوگوں کا خوف بڑھ گیا تھا خاص کر خواتین میں جو اپنے آپ کو گھروں میں بھی غیر محفوظ سمجھنے لگی تھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ چوری چکاری میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہلاکتیں زیادہ ہونے لگیں، جب کسی علاقہ یا محلّہ میں کوئی راکٹ گرتا تو لوگ وہاں سے زخمیوں کو نکالنے کے لیے جمع ہوتے تو فائرنگ شروع ہو جاتی اور مزید ہلاکتیں ہوتیں۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا۔ بچے کھچے لوگ خالی میدان میں رہ جاتے۔ ان کی شنوائی نہ تھی کیوں کہ نہ پولیس موجود تھی نہ کوئی تھانہ۔ کہاں جا کر فریاد کرتے۔ بڑے لوگ اقتدار کی جنگ لڑنے میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور غریب اپنے ہی خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جو لوگ صاحب استطاعت تھے وہ تو شہر کو چھوڑ کر جا رہے تھے کچھ لوگ جو زیادہ مالدار تو نہ تھے اور اپنے بچوں کو انھوں نے باہر بھیج رکھا تھا وہ عارضی طور پر شہر میں مقیم تھے باقی کچھ غریب شیر کریم جیسے بھی تھے وہ تو نہ جوان بچوں کو باہر بھیج سکتے تھے، نہ خود جا سکتے تھے وہ صرف اللہ کے آسرے پر پڑے تھے اور ہمہ وقت امن و امان کی دعائیں مانگ رہے تھے، بقول داغ دہلوی ’اللہ کی مدد سے زیادہ مدد نہیں‘۔

کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ مدرسے اور کالج بند ہونے کی وجہ سے شیر کریم کی جوان بیٹی گھر پر تھی۔ اس کی ماں خوش تھی ایک دن خیریت سے گزر جاتا تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے۔

ان حالات نے شیر کریم کو پکا نمازی بنا دیا تھا۔ اکثر نمازیں باجماعت ادا کرتا، حالات زیادہ خراب ہوتے تو گھر پر نماز پڑھ لیتا۔ گھر والوں کو بھی نصیحت کرتا کہ وہ سب نماز کی پابندی کریں۔ جمعہ ہمیشہ باجماعت ادا کرتا چاہے حالات زیادہ خراب کیوں نہ ہوں۔ وہ مسجد پہنچ جاتا، واپسی پر اپنی دکان ضرور کھولتا تا کہ کچھ نہ کچھ کمائی تو ہو۔

اسی طرح ایک مبارک جمعہ کو شیر کریم نے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے، خوشبو لگائی، اپنی پسندیدہ پگڑی سر پر رکھی اور مسجد چلا گیا۔ خیال تھا کہ نماز کے بعد دکان بھی کھولے گا لیکن وائے قسمت ابھی نماز ختم نہ ہوئی تھی کہ شیر کریم کو اپنے جسم میں انتہائی کمزوری اور نقاہت کا احساس ہوا۔ آخری دو رکعت سنت اس نے بیٹھ کر ادا کیں۔ امام صاحب کی دعا کے ختم ہوتے ہی شیر کریم نے گھر کی راہ لی تا کہ کچھ آرام کر سکے۔ گھر کے قریب پہنچا

ہی تھا کہ اس نے دیکھا۔ گھر کا مین گیٹ خلافِ معمول کھلا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چار آدمی کلاشنکوف بردار صحن میں کھڑے ہیں اور اس کی بیوی اپنا دوپٹہ ان کے پاؤں میں پھینکتے ہوئے فریاد کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر شیر کریم پر تو بجلی جیسے آن پڑی۔ شوہر کو دیکھ کر بیوی بھاگ کر اس کے گلے لگ کر رونے لگی کہ میاں جی ہم تو تباہ ہو گئے یہ ہماری بیٹی ملالہ کو لینے آئے ہیں۔ شیر کریم نے آہستہ سے بیوی کو علیحدہ کرتے ہوئے ان اسلحہ برداروں سے دریافت کیا کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ اور یہاں ہمارے گھر میں کیوں بغیر اجازت کے داخل ہوئے ہو؟

ایک لمبے بالوں والے ڈاکو نے کلاشنکوف اس کے سینے پر رکھ کر کہا کہ ہم تمھاری بیٹی کو لینے آئے ہیں۔ اگر تم نے اسے ہمارے حوالے نہ کیا تو پہلے تمھیں پھر تمھاری بیوی کو جان سے مار دیں گے اور تمھاری بیٹی کو لے جائیں گے۔

شیر کریم نے بندوق کی نالی کو ایک طرف کرنے کی کوشش کی تو حملہ آور نے اس کے ہاتھ پر بندوق کا بٹ اس زور سے مارا کہ اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی۔ لیکن جلد ہی کچھ سوچ کر بولا۔ اگر تم میری بیٹی کو لینے آئے ہو تو مجھے تھوڑی سی مہلت دو میں اپنی بیٹی سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

لمبے بالوں والے ڈاکوؤں نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے تم کر لو بات۔ ہم تمھاری بیوی کو یرغمال بنائے رکھتے ہیں۔

شیر کریم نے کہا۔ صحیح ہے، پھر اس نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا اور خود اندر کمرے میں جا کر دروازہ بند کر دیا۔ شیر کریم کی بیوی نے پھر دہائی دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ میری ایک بیٹی ہے خدا کا خوف کرو، ہمیں معاف کر دو۔ میری بیٹی کو نہ لے جاؤ۔ اسی فریاد کو سنتے ہی کمرے میں شیر کریم نے فائر کیا، آواز سنائی دی تو وہ چاروں ڈاکو بھاگ کر کمرے کے اندر پہنچے دیکھا تو ملالہ فرش پر خون میں لت پت پڑی ہے اور شیر کریم اس پر جھکا ہوا ہے۔ اس نے ان چاروں سے کہا!۔

ظالمو! تم لوگ میری بیٹی کو لینے آئے ہو۔ اب جہاں چاہتے ہو اسے لے جاؤ۔

☆☆☆☆

پشتو تخلیق و ترجمہ: ثمینہ قادر

کیا محسوس تم نے بھی؟

دسمبر میں کبھی دل کی تپش کو
کیا محسوس تم نے بھی؟
سُلگتی روح کی بے چینیوں کو
کیا محسوس تم نے بھی؟
یہ جو ارمان ہے ایک دن
مجھے یہ مار ڈالیں گے
کہ ہوں زندہ ابھی
ان زندہ جذبوں کی
سسکتی آہ کو جاناں
کیا محسوس تم نے بھی؟
میں اکثر یخ سربستہ/ہواؤں میں
جو ہو جاتی ہوں دیوانی
تو اس دیوانہ پن کو کیا
کیا محسوس تم نے بھی؟
لچکتی شاخوں پر اکثر
پرندوں کو میں جب دیکھوں
نہیں ہے کوئی موسموں کی پروا
پڑی گر برف/برسے ابر
یہ آگ آسمان سے
یہ بے حس ہو گئی ہیں یا کہ

ہیں شدت کی عادی
کبھی ان کو بھی سوچا ہے؟
دسمبر میں ہی سڑکوں کے کنارے بیٹھے
ان معصوم بچوں کو کبھی دیکھا ہے تم نے بھی؟
کہیں سرگوشی میں تم کو تمھارے دل نے کچھ بولا؟
برہنہ پاؤں ننھے ان فرشتوں کو
کیا محسوس تم نے بھی؟
یہ ستر سال کا بوڑھا بابا
صبح گھر سے نکلتا ہے کہ اس کو
ہے اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھرنا
یہ عمر تو اس کے لیے آرام کی ہے
جواں ہوں چار بچیاں
جو اس کی راہ تکتی تھک گئی ہیں
اور مارے بھوک کے نڈھال
اپنی بوڑھی ماں کو
دلاسے دیتی دیتی شام کو
آیا جو بابا
تو سب نے آگ اپنے پیٹ کے
جہنم کی بجھائی
میں اس ماحول میں زندہ ہوں کب سے
تو اب تم ہی بتاؤ
میرے اندر کی گرمی کو
دسمبر کے مہینے میں
کیا محسوس تم نے بھی؟

شیراز اختر مغل

پوٹھوہاری زبان سے ترجمہ: شیراز طاہر

ارمان

کیا ہوا ہے؟
کیا کرتے ہو؟
میری مجبوری تو سمجھو
ابھی تو میں نے
بہت سے کام کرنے ہیں
بیٹی کو ڈولی بٹھانا ہے
دلہن بنانا ہے
بیٹے کو سہرا پہنانا ہے
خود کو منانا ہے
رہنے کو کوئی سائباں بنانا ہے
ماں کو حج کرانا ہے
ارمانوں کا ایک جہاں سجانا ہے
جانا تو جانا ہے
مگر سب کام ادھورے ہیں
اتنی بھی کون سی جلدی
یارو!
لوگوں کو سمجھاؤ
میری میت پہ پڑی پڑیاں (صلیب) اٹھاؤ

حنیف باوا

پنجابی زبان سے ترجمہ: عامر عبداللہ

انجام

دھرتی ماں کے سینے پر
نُور لٹاتے جلتے بجھتے ایک دیے کو
زندہ رکھنے کی خاطر
دو دلوں کے ٹکڑے
نور آنکھوں کا سَر کا سایہ
ایک گھنا، چھتنار کٹا کر
وہ اب ایک برہنہ پیڑ کی صورت
دور فراموشی کے جنگل میں
چُپ چاپ کھڑی ہے
کون اب اُس کے اندر جھانکے
کون اسے سینے سے لگائے
کون اب اس کے درد کو بانٹے
وہ اک روح، پوتّر روح
بہت آہستہ چپکے چپکے
اندر اندر گھلتی جائے ہولے ہولے مٹتی جائے

(نصرت بھٹو کے لیے لکھی گئی ایک نظم)

☆☆☆☆

خورشید ربانی

سرائیکی سے ترجمہ: سید ضیاالدین نعیم

نعت

شوق رہبر ہوا، دل کو رستہ ملا، نعت لکھتا رہا
میری سوچوں میں ہر دم مدینہ رہا، نعت لکھتا رہا
لوگ بھاگوں بھرے، در پہ جاتے رہے، فیض پاتے رہے
میں بھی جانے کی امید دل میں بسا، نعت لکھتا رہا
دل تڑپتا رہا، درد سہتا رہا، بخت یاور ہوا
نعت سنتا رہا، نعت پڑھتا رہا، نعت لکھتا رہا
میں گناہوں بھرا بھی ثنا خواں بنا، فضل رب نے کیا
فضل رب نے کیا، میں کہ تھا دل زدہ، نعت لکھتا رہا
جب بھی جاتا مدینے کو دیکھا کوئی، ساتھ دل ہو لیا
دل کی حسرت پہ صدقے میں جاتا رہا، نعت لکھتا رہا
پھر بلاوا مجھے ایک دن آگیا، میں مسافر ہوا
میں مسافر ہوا، جا مدینے رہا، نعت لکھتا رہا
اپنی قسمت پہ خورشید نازاں ہوا، میں مدینے گیا
پیارے روضے کا دیدار میں نے کیا، نعت لکھتا رہا

☆☆☆☆

جمشید ناشاد

سرائیکی سے ترجمہ: سوہنا خان شاکر

صحرائی پودا

بہار کا موسم آ رہا ہے
اور ہر کوئی خوشیاں منا رہا ہے
آم، انار، گلاب، چنبیلی
تازگی کا لباس پہن کر
محوِ رقص ہیں
لیکن میں
ایک صحرائی پودا ہوں
جو تنہائی میں
آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے گویا ہوں
کہ چاہے بہاریں روز روز آئیں
ہمارے کس کام کی ہیں
ہمیں کس نے دیکھنا ہے

☆☆☆☆

مانک

سندھی زبان سے ترجمہ: شاہد حنائی

اور وہ مر گیا۔۔۔۔

اور وہ مر گیا۔

جانے اسے مرنا چاہیے تھا کہ نہیں!

بہر حال وہ مر گیا۔ اچانک۔ صبح ہونے پر مردہ پایا گیا۔ حالاں کہ یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح، اس عمر میں، اچانک مر جائے گا۔ رات تک تو بھلا چنگا تھا۔

کل شام سات بجے کے قریب اس کے باپ نے پوچھا:

"انٹرویو دینے کراچی نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"وجہ؟"

"کرایہ نہیں تھا۔"

"تو مجھے بتایا ہوتا، یا کسی سے مانگ تانگ کر چلے جاتے۔"

۔۔۔۔وہ چپ۔

"منہ میں چھالے ہیں کیا؟"

۔۔۔۔وہ چپ۔

"باقی کھانے کے لیے دونوں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤ گے، جوان کا بچہ۔"

"پیسے مانگتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔"

"کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

۔۔۔۔وہ چپ۔"

بوڑھے کی بڑبڑ بجھ سے بالآخر۔۔۔۔وہ چپ جیسے دیوار۔۔ بے جان بت۔

اس سے پہلے:

''رئیس کے پاس درخواست لے کر گئے تھے؟''

''ہاں۔''

''پھر کیا کہا رئیس نے؟''

''بول دیا، مَیں کوشش کروں گا۔''

'' اور کچھ نہیں کہا؟''

'' نہیں۔''

کئی دفعہ:

'' رئیس کے پاس گئے تھے؟''

''نہیں۔''

'' کیوں؟

''اس سے پہلے کتنی بار تو جا چکا ہوں۔ ٹال دیتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں طفل تسلیاں دیتا ہے۔۔۔۔''

''تم سمجھتے ہو۔۔۔۔ نوکری تجھے گھر بیٹھے بیٹھے مل جائے گی۔ کسی کے پاس جاؤ گے نہیں۔۔۔۔ حرام کھاؤ، کیوں کہ حرام ہڈیوں کو راس آ گیا ہے۔ دُوسرے لڑکے تو جیسے بھاگ دوڑ کر ہی نہیں رہے۔ باقی اس نواب زادے کو تھالی میں سجا کر پیش کی جائے۔۔۔۔''

۔۔۔۔ وہ چپ۔

اس کی یہ خوبی تھی: اکثر خاموش، کم گو۔ جیسے بالکل پُرسکون، دھیما مزاج، کبھی بھی غصہ، اشتعال یا کسی بھی قسم کے تاثرات چہرے پر نقش نہ ہوتے۔

خالہ نے کہا:

'' بیٹا! اتنا پڑھے ہو، پھر بھی تمھیں نوکری نہیں ملتی؟''

''بس خالہ کیا کروں!''

''کون سا امتحان پاس کیا ہے؟''

'' ایم۔اے''

''بیٹا! بھٹو صاحب کی حکومت میں تو دیگ چڑھی ہوئی ہے۔ کچھ کوشش کرو۔''

''خالہ! کر تو رہا ہوں۔''

”ماں نے کہا:

”اس سے پہلے امتحان پاس کرنے والوں کو بھی نوکریاں مل گئیں۔ جو اس سے کم پڑھے تھے ان کو بھی نوکریاں مل رہی ہیں۔ خدا جانے اس کی تقدیر میں کیا خرابی ہے۔۔۔۔“

”اماں! کوشش تو کرتا رہتا ہوں، جو میرے بس میں ہے۔“

”پھر بھی نہیں ملتی نا! تم ہو ہی بد قسمت۔“

”اِدھر سنو!“

”جی بابا!“

”کہاں تھے اس وقت تک؟“

”یہیں۔“

”آوارہ گردی کے سوا دُوسرا کوئی کام بھی ہے؟“

۔۔۔۔وہ چپ

”سنو کوئی وزیر آ رہا ہے، کھلی پنچایت کرے گا۔ تم درخواست لے کر چلے جانا اور اسے ساری حقیقت بتانا: غریب کلرک کا بیٹا ہوں۔ ایک باپ کمانے والا ہے اور سات بچے۔۔۔۔“

”اسی واسطے گیا تھا۔“

”کہاں؟“

”ڈی۔سی کے پاس۔“

”ڈی۔سی کے پاس کاہے کو؟“

”اجازت نامے کے لیے۔“

”تو کیا اجازت نامے کے بغیر کھلی پنچایت میں نہیں جایا جا سکتا؟“

”نہیں، بابا“

”ڈی سی نے کیا کہا؟“

”اس نے کہا: نوکری کے لیے عرضی پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو عام سا مسئلہ ہے۔“

۔۔۔۔باپ چپ۔

۔۔۔۔وہ بھی چپ۔

باہر سے آیا تو رات کافی گزر چکی تھی۔

باپ نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا:

''کہاں تھے اس وقت تک؟''

''کہیں ---- بس دیر ہو گئی ----''

ماں جاگ گئی۔ پوچھنے لگی:

''کون ہے؟''

''تمھارا کماؤ پوت۔ کمائی کر کے آیا ہے۔''

---- وہ چپ

''کھانا نہیں کھاؤ گے! رئیس۔''

''نہیں، بابا بھوک نہیں ہے۔''

اگر چہ اسے شدید بھوک ستا رہی تھی!

''انٹرویو دے آئے؟''

''جی بابا۔''

''پھر؟''

''انٹرویو میں کچھ پوچھا ہی نہیں۔ صرف نام، والد کا نام اور تعلیمی کوائف پوچھ کر جانے کو کہہ دیا۔''

''پھر کوئی اُمید ہے؟''

''کیا پتا ---- البتہ سب کہہ رہے تھے کہ اپائنٹمنٹ تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ یہ تو محض رسمی کارروائی کی خاطر ہے۔''

''ہوں۔''

نوٹ بک ڈائری سے ☆

بے مقصد زندگی ---- اِک پاگل کا خواب۔ مَیں نے خواب دیکھا تھا کہ ---- سب کچھ بکواس، لاحاصل بے کار۔

☆ نوٹ بک نہیں تھی، ماضی ہو چکے سالوں کی (Out of date) ڈائری تھی۔ جس میں قواعد و ضوابط کے مطابق ہر روز کی ڈائری لکھی جاتی ہے تحریر نہیں کی گئی تھی۔ بس: کبھی کبھار کے تاثرات: ردِّعمل یا کچھ اور ---- جن میں سے چند ایک پر تاریخیں درج تھیں اور کچھ پر نہیں۔

سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟ میرے اختیار میں جو کچھ ہے وہ تو کرتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کر لیتا ہوں۔ انٹرویو، وڈیروں کے حضور حاضریاں، دفاتر میں، جہاں تذلیل برداشت کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی ----

رات محلے میں ایک بوڑھا مر گیا۔ خبر سنتے ہی دفعتاً ایک بھیانک خیال آیا: بابا مر گیا -----

بڑے بیٹے کی حیثیت سے۔ گھر کی ذمہ داریاں۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سارا وجود ---- (مناسب الفاظ ذہن میں نہیں آ رہے جو اس گہرے احساس کا اظہار کریں) دل نے کہا، اگر پاگل ہو جاؤں۔ پاگل ہو جانے میں بلاشبہ نجات ہی نجات ہے۔

کاش! پاگل ہو جاؤں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مَیں زندہ کیوں ہوں۔

نقطے، لکیریں، دو چھوٹے سے پھول بنائے گئے اور کونے میں لکھا گیا:

کتنا بے چین، مضطرب ہوں کاش! کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں دھاڑیں مار مار کر رو سکوں۔

باپ نے لعن طعن کی۔

سوچا: پہلے کچھ کہتے تھے تو مَیں جواب دیتا تھا۔ اور اب! اب خاموش بے حس سا کیوں ہو جاتا ہوں؟ بابا کہتے ہیں ڈھیٹ ہو گیا ہوں۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ مجھے کچھ ہوتا کیوں نہیں ہے!

میرا اندر، احساس، زندگی کا جوہر اور وجود کا احساس اور ”مَیں“ ----سب مر چکے ہیں۔ مروڑ تڑوڑ دیے گئے ہیں!

سارا دن پیدل چل چل کر، بابا کے بقول آوارہ گردی کر کے، تھک کر لوٹ آیا۔ سوچا: اگر آج بابا نے کچھ کہا تو ٹوک دوں گا۔ مگر انھوں نے کچھ کہا ہی نہیں۔ ترنگ میں تھے۔ مَیں نے کھانا نہ کھایا۔ دن بھر بھی کچھ نہ کھایا تھا۔ غصے یا ضد کی وجہ سے نہیں۔ واقعی مجھے بھوک نہیں تھی۔ دراصل بھوک مر چکی ہے۔

بابا نے پیار اور ہمدردی کے ساتھ سمجھایا: ”بیٹا وڈیروں کی حکومت ہے، ہم غربا کو ذلیل ہونا ہی پڑتا ہے۔ مایوس مت ہو بیٹھو ----“ مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ جیسے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔ دل نے کہا: بابا یہ شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ چھوڑیے، ڈانٹیے، گالیاں سنائیے ----

وڈیرے ---- کے پاس درخواست لے کر گیا۔ وہ حکومتی جماعت کا اہم عہدے دار ہے۔ مَیں اس کے سامنے بیٹھا رہا۔ لاوارث کتے کی طرح غیر اہم ہو کر بیٹھا رہا ---- خود کو کس قدر محتاج، ذلیل، گھٹیا، گندی نالی کا کیڑا، بے غیرت اور بھکاری محسوس کرتا رہا۔

خودکشی کرنی چاہیے یا بغاوت ۔۔۔ خیالات ۔۔۔ خیالات ۔۔۔ خودکشی کرنے سے قبل ایک یا دو وڈیروں کو مار ڈالوں ۔۔۔۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے!!!

گھر میں ماتم، بین، آہ و بکا۔ محلے میں افسوس اور دُکھ:

کتنا شریف اور پیارا تھا۔

خاموش، نیک طبع اور سلجھا ہوا۔

زندگی میں بے چارے نے دیکھا کیا نوجوانی میں ہی ۔۔۔۔۔؟

☆☆☆☆

امداد حسینی

سندھی زبان سے ترجمہ: ابرار ابڑو

بدنصیب

آج اُس کے جنازے کے لیے
اتنے سارے کندھے ہیں
دُکھ تو صرف یہ ہے
کہ زندگی میں جب
رونا چاہا تھا اُس نے
تب
کوئی بھی کندھا اُس کے نصیب میں نہ تھا!

(نثری نظم)

☆☆☆☆

رانا فضل حسین

گوجری زبان سے ترجمہ: پروفیسر مہوش منیر

نظم

شاہ ہمدانؒ کے دیس کشمیر تجھ پر صدقے
اے میری دھرتی کشمیر تجھ پر قربان
تُو میری جنت ہے میں تیرا فرزند ہوں
تیری مٹی سے میرا خمیر اٹھا ہے
کوہ فاران سے چمکنے والی رحمت سے
کوہ ماران روشن ہوئے
مکہ و مدینہ سے جس کی تاثیر آتی رہتی ہے
لا الہ الا اللہ کا ابدی پیغام دینے
بلبل شاہؒ، علی ہمدانی سید امیر کبیرؒ آئے
کیسر کی پھل کھیلی ہے
وطن کشمیر چاند سے بھی زیادہ حسین ہے
حضرت بل کے سبب کشمیر ایران صغیر ہے
کیسر کے رُت رنگ پھولوں کے سبب اس کا روپ بے مثال ہے
مہجور و غنی کے سبب اسے شناخت ملی
جنت ارضی تجھ سے حسن ادھار مانگتے ہیں

میری تقصیر یہ ہے کہ تیرا روپ وسنگھار نہ سکا
حیاتی کی مثال پتے پر پانی کی ہے
سانس کا کیا اعتبار آئے نہ آئے
کٹی زندگانی واپس نہیں آتی
نالے میں بہنے والا پانی واپس نہیں آتا
جینا بھی اُس کا جینا ہے جو مرنے کا چیلنج قبول کرے
اُس کا جینا بھی جینا ہے جو اپنی تقدیر بدل سکے
ولر کنارے حضرت خضر سوچ رہا ہے
فضل میرے اقبال کی دھرتی کیوں دل گیر ہے

☆☆☆☆

صوفی عبدالرشید

ہندکو زبان سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

حمد

تُو ہی اول تُو ہی آخر
تُو ہی باطن، تُو ہی ظاہر
جتنے ہیں سنسار
سب کا تُو ہی پالن ہار
ساری مخلوقات کا مولا
تُو ہی پالن ہار
تُو ہی آقا، تُو ہی مالک
تُو باقی اور سارے ہالک
ساری سرکاروں سے تیری
اونچی ہے سرکار
تُو قادر مختار
گرمی ہو یا سردی ہو
پت جھڑ ہو یا کھلی بہار
اللہ تُو ہر اک کا یار
تیرے حکم سے چلتا ہے

جگ کا سارا کاروبار
اعلیٰ تیرا عرش
اونچا تیرا تاج
تُو ہی سخی ہے تُو ہی رازق
باقی سب محتاج
سارے جہانوں پر چلتا ہے
آقا تیرا راج

☆☆☆☆

احمد علی سائیں

ہندکو سے ترجمہ: سلطان فریدی

کلامِ احمد علی سائیں

غربت و افلاس کو میں دُوں مِٹا
عشق کی آتش سے دُوں ہر شے جلا
اپنا غم سیماب سا، میں دُوں اُڑا
ظلم سے ظالم وہ آئے باز گر
دُور ہو آزارِ فُرقت قلب سے
دُور ہو کوہِ مصیبت قلب سے
میں اُتاروں ہر نحوست قلب سے
دُور سے اُس کی سُنوں آواز گر
درد و تلخی اور جفا کو روک لوں
کر کے حیلے میں، قضا کو روک لوں
آنے والی ہر سزا کو روک لوں
نزع کے دم آئے وہ دم ساز گر
بعد مرنے کے ہو گر اُس کا وصال
مٹ ہی جائے زندگی بھر کا ملال
کاش آئے سائیں جی وہ پُرجمال
ظلم سے ظالم وہ آئے باز گر

☆☆☆☆

”میں“ کررہا تھا گزشتہ کے واقعات درست

(افسانے)

میرا اسلوبِ فنِ شعر بہت سادہ
ہے

(غزلیات)

کتابوں میں چھپے چہروں کو تکتے ہیں

(مضامین)

جھیل سیف الملوک نے پوچھا

(سفرنامہ)

دُور اتنا بھی نہیں تیرا سراپا مجھ سے

(نظمیں)

یہ کس زبان کے الفاظ ہیں نہیں معلوم

(بین الاقوامی ادب)

اب کے ایسی چلی ہوائے کرم

(عقیدت)

مشترکہ تمدن کی دیکھی ہے جھلک اس میں

(پاکستانی زبانوں کا ادب)

اہلِ قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۶ء

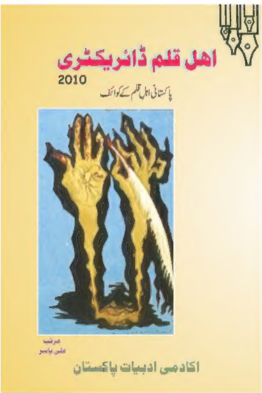
اہل قلم ڈائریکٹری
2010
پاکستانی اہلِ قلم کے کوائف
مرتب
علی یاسر
اکادمی ادبیات پاکستان

اکادمی ادبیات پاکستان ''اہلِ قلم ڈائریکٹری'' کا نیا ایڈیشن مرتب کر رہی ہے۔ جس میں حسبِ روایت تمام پاکستانی زبانوں کے زندہ ادیبوں اور شاعروں کے کوائف شائع کیے جائیں گے۔ تمام پاکستانی اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ اپنے درج ذیل کوائف بذریعہ ڈاک یا ای میل فوراً ارسال کریں تا کہ انھیں اہلِ قلم ڈائریکٹری میں شائع کیا جا سکے۔

قلمی نام ____________ اصل نام ____________

تاریخ پیدائش ____________ مقام پیدائش ____________

صنفِ ادب ____________ زبان ____________

مطبوعات (بمعہ صنف، سالِ اشاعت، ایڈیشن) ____________

____

____

اعزازات ____________ پتا ____________

فون نمبر ____________ ای میل ____________

علی یاسر
انچارج: اہلِ قلم ڈائریکٹری
فون: 051-9269712
ای میل: directory@pal.gov.pk

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

October to December 2015

ISSN: 2077-0642

پاکستانی لٹریچر کا تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

PAKISTANI LITERATURE

Vol.18 2015 Issue 1 ISSN 2411-037X

Pakistan Academy of Letters

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk